سیرتِ حسین رضی اللہ عنہ

مع

سانحۂ کربلا

مولانا حکیم محمد ادریس فاروقی رحمہ اللہ
بانی وسابق چیف ایڈیٹر ماہنامہ ضیائے حدیث

سیرتِ حسین رضی اللہ عنہ
مع سانحۂ کربلا

مؤسس: مولانا حکیم محمد ادریس فاروقی رحمہ اللہ (2010-1944ء)

سیرتِ حسین رضی اللہ عنہ

مع سانحۂ کربلا

مؤلف

مولانا حکیم محمد ادریس فاروقی رحمہ اللہ

اشاعت سوم 2012ء

ناشر

مسلم پبلیکیشنز

12 عثمان غنی روڈ، سنت نگر، لاہور

042-37249678

سیرتِ حسین رضی اللہ عنہ
مع
سانحۂ کربلا
مولانا محمد ادریس فاروقی رحمہ اللہ
www.KitaboSunnat.com
مسلم پبلیکیشنز

فہرست

تقریظ (۱)

محمد صدیق شاہد صاحب ایم اے، لاہور

بزرگانِ دین کے حالات و واقعات پڑھنے اور لکھنے کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ ان کے عظیم کارناموں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کی پیروی کی جائے اور ان سے سبق حاصل کیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ ان سے ہونے والی نادانستہ غلطیوں سے سبق لیا جائے۔ رسولِ پاک ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ہدایت کی تھی کہ جب آپ ﷺ مکہ کے کفار سرداروں سے مخاطب ہوں تو وہاں آنے سے گریز کیا جائے۔ مقصد صرف یہ تھا کہ شاید ان کو ہدایت مل جائے مگر حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ جو صحابیٔ رسول تھے اور نابینا تھے ان سرداروں کی مجلس میں آ گئے۔ رسول پاک کو اچھا محسوس نہ ہوا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو سرزنش کی کہ آپ کو کیا علم کہ کفار میں سے کوئی ایمان لائے گا یا نہیں مگر جو ایمان کے نور سے منور ہو چکا اس کے بارے میں ایسا رویہ اللہ تعالیٰ کو درست نہ لگا۔ بہرحال صحابہ رضی اللہ عنہم سے دانستہ یا نادانستہ غلطیاں ہوئیں۔ اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ بزرگان کے بارے میں ایسی باتیں کرنا ان کی توہین ہے وہ ایسا کر ہی نہیں سکتے تو یہ تنگ نظری ہی نہیں حقائق و شواہد کے بھی خلاف ہے۔ یہ ایک ایسا مرحلہ ہے جس میں قارئین کو فراخ دل اور وسیع النظر ہونا چاہیے۔ کتاب ''سیرت حسین رضی اللہ عنہ مع سانحہ کربلا'' میں مصنف نے بڑی فراخدلی سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی تعلیمات و اقوال و

افعال کی وضاحت کی ہے تا کہ لوگ حقائق کو سمجھ سکیں اور بڑے لوگوں کے حالات پڑھ کر ان سے سبق حاصل کریں۔ حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ، حضرت داوٗد، حضرت نوح، حضرت ابراہیم علیہم السلام کے حالات و واقعات پڑھ کر قارئین میں قوت ارادی کو تقویت ملتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ فرعون، نمرود، قارون، شداد کے واقعات پڑھ کر عبرت حاصل ہوتی ہے۔ جہاں شر ہے وہاں خیر ہے، جہاں شیطان ہے وہاں رحمان ہے، جہاں نیکی ہے وہاں برائی ہے۔ مصنف نے دونوں کا ذکر بڑی خوبصورتی سے کیا ہے اور بڑے انصاف سے کام لیا ہے تا کہ پڑھنے والے کو حقائق کا علم ہو سکے اور وہ جذبات کی رو میں بہہ کر سراسر موم یا سراسر سنگ نہ بن جائے۔ آج تک حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بارے میں جتنی کتب لکھی گئی ہیں عموماً لکھنے والوں نے زمین آسمان کے قلابے ملا دیے ہیں اور زور صرف شہادت کے موضوع پر دیا ہے اور ایسی ایسی بے پر کی اڑائی ہے کہ پڑھنے والا سمجھتا ہے کہ جیسے وہ کوئی مافوق الفطرت ہستی کے بارے میں پڑھ رہا ہے ایسی ایسی کذب بیانی سے کام لیا گیا ہے کہ قاری پریشان ہو جاتا ہے اور ماتھا پکڑ لیتا ہے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے اعلیٰ کردار کو نعوذ باللہ ایک ڈرامے کا رنگ دے دیا گیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ محبّ صرف وہ ہے جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا نام سن کر رونا شروع کر دے، بال نوچے، منہ پر تھپڑ مارے۔ درست ہے کہ ان پر ظلم ہوا اور بے حد ہوا اور ظالم سخت عذاب کے حقدار ہوئے۔ عمومی طور پر سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے فضائل اور مراتب و درجات اور کردار کو بیان کرتے وقت بخل سے کام لیا گیا۔ مگر سیرتِ حسین رضی اللہ عنہ کے مصنف جناب مولانا ادریس فاروقی حفظہ اللہ نے بڑی خوبصورتی اور انصاف سے ان کے فضائل، کردار اور سیرت پر روشنی ڈالی ہے تا کہ ان پر عمل کرنے سے ایک مسلمان صحیح مسلمان بن سکے اور اپنی آخرت سنوار کر جنت کا حقدار بن سکے۔ مصنف نے مخالفت اور موافقت سے ہٹ کر دلائل پیش کرنے

کی کامیاب سعی کی ہے۔ مصنف کے لیے یہی وقت آزمائش کا ہوتا ہے۔ الحمدللہ موصوف نے آزمائش کی اس گھڑی میں انصاف کا دامن نہیں چھوڑا۔ بقول اقبال رحمہ اللہ

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

اس سے قبل مصنف مولانا محمد ادریس فاروقی حفظہ اللہ چند کتب مثلاً نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم، اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم، سیرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا، عفیفۂ کائنات رضی اللہ عنہا، مقام رسالت، انوار الحدیث، مسئلہ تقلید اور دیگر کتب کے بیش بہا گوہر ہائے نایاب قارئین کی نذر کر چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ رب ذوالجلال ان کی کاوشوں کو درجۂ قبولیت بخشے جو ان کے لیے اجر وثواب کا موجب بنے۔

احقر

محمد صدیق شاہد ایم اے

گلشن راوی، لاہور

تقریظ 2

پروفیسر محمد ذوالفقار صاحب، ریسرچ فیلو دار السلام

صحابہ رضی اللہ عنہم کے دور میں ہونے والے واقعات کے متعلق لکھنا تنے ہوئے رسے پر چلنے کے مترادف ہے۔ ذرا سا توازن (Balance) بگڑنے سے انسان کسی گہری کھائی میں گر سکتا ہے۔ یہ موضوع جتنا حساس تھا اس میں اتنی ہی بے احتیاطی برتی گئی۔ ایک طرف تو لوگ اس حد تک چلے گئے کہ حضرت عائشہ صدیقہ، طلحہ، زبیر، معاویہ، عمرو بن عاص اور مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہم پر تنقید کے نشتر چلانے لگے اور دوسری طرف اس حد تک پہنچے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو باغی قرار دے دیا انا للہ۔ اُن کی دیدہ دلیری ملاحظہ ہو وہ یہ کہنے سے بھی نہیں چُوکتے کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا مقصد محض دنیاوی اقتدار کا حصول تھا۔ حالانکہ یہ درست نہیں۔ انہوں نے آپ رضی اللہ عنہ کو اپنے اوپر قیاس کیا۔

اگر غور کیا جائے تو جنگ جمل، صفین اور واقعۂ کربلا ایک ہی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں اور یہ اسی فتنے کا تسلسل ہیں جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت سے شروع ہوا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں پروان چڑھا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قتل کسی عام انسان کا قتل نہیں تھا۔ ایک خلیفہ راشد، چالیس لاکھ مربع میل کے حکمران اور داماد رسول کا قتل تھا۔ اس لیے اگر لوگوں نے ان کے

قصاص کے مطالبے میں شدت اختیار کی تو وہ اس میں حق بجانب تھے۔ بدنیتی دوسری طرف بھی نہیں تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اُن کے ساتھی بھی قصاص کے اتنے ہی خواہاں تھے جتنے طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما۔ فرق صرف طریقۂ کار کا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ انتہائی محتاط تھے جیسا کہ اور دلائل کے علاوہ ان کی شہادت کے واقعہ سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ملاحظہ کیا کہ ابن ملجم ان کی جاسوسی کر رہا ہے۔ ان کے آنے جانے کے راستے اور واقعات پر نظر رکھ رہا ہے۔ انھوں نے اپنی بصیرت سے اندازہ لگا لیا کہ یہ انھیں قتل کرنے کی نیت سے آیا ہے۔ انھوں نے اپنے ساتھیوں سے ذکر کیا۔ وہ کہنے لگے اسے گرفتار کر لیا جائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا میں محض شبہے کی بنا پر اسے گرفتار نہیں کر سکتا۔ یہی احتیاط حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے کیس میں بھی کی جا رہی تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ تمام قانونی تقاضے پورے کرنا چاہتے تھے۔ جب کہ دوسرے افراد کا خیال تھا کہ بلاتاخیر یہ کام ہونا چاہیے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ مسئلہ پیچیدہ ہوتا جائے گا اور قصاص لینا مشکل سے مشکل تر ہوتا جائے گا۔ اُن کا یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔

دونوں فریق ایک حل (Solution) کے بالکل قریب پہنچ گئے تھے کہ سازشی عناصر نے رات کی تاریکی میں دونوں طرف حملہ کر کے جنگ کی آگ بھڑکا دی۔ بہر حال جنگ جَمل اور صفّین ایک محدود قسم کی لڑائیاں تھیں جنھیں موضوع اور من گھڑت روایات کے ذریعے بڑی ہولناک جنگوں میں بدل دیا گیا اور زیب داستان کے لیے ان میں بہت سی بے سروپا باتیں بھر دی گئی ہیں۔ دونوں طرف کے لشکروں کی تعداد اور مقتولین کے اعداد و شمار ہی ان روایات کے باطل ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہیں۔ جہاں اسلام دشمن عناصر سرگرم تھے۔ اُمت کے خیر خواہ بھی اصلاح کی کوششیں جاری رکھے ہوئے تھے۔ یہ پھر ایک حل کے قریب پہنچ چکے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت

کا واقعہ پیش آ گیا۔

ہمیں یہ حقیقت تسلیم کر لینی چاہیے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے کو ولی عہد مقرر کرنے کا فیصلہ جتنی بھی نیک نیتی اور اُمت کی خیر خواہی میں کیا ہو اس سے ایک غلط روش کے شروع ہونے کا اندیشہ تھا۔ جو بعد میں ایک تلخ حقیقت بن کر سامنے آیا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے بھی اسی اندیشے کی بنا پر اس ولی عہد کو تسلیم نہیں کیا۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اس کے سد باب کے لیے نہ تو کوئی لشکر اکٹھا کیا۔ نہ لوگوں کو اس کے خلاف آمادہ (Motivate) کیا اور نہ ہی مسلح جدو جہد ان کے پیش نظر تھی۔ اگر ان کا اس طرح کا کوئی منصوبہ ہوتا تو اس کے لیے سب سے مناسب جگہ مکہ مکرمہ تھی جہاں سارے عالم اسلام سے لوگ حج کے لیے جمع ہوتے تھے۔ اگر واقعی اسلام مٹ رہا ہوتا جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے تو حضرت عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر، ابوسعید خدری، سعد بن ابی وقاص، عبداللہ بن زبیر اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے پیچھے نہ رہتے اور اُن کے شانہ بشانہ لڑ رہے ہوتے۔ یہ ایک دلخراش حادثہ تھا جو اہل کوفہ کی غداری اور اسلام دشمنی کی وجہ سے پیش آیا۔ بہر حال ان واقعات میں اصل چیز توازن ہے جس کا عموماً بہت کم خیال رکھا گیا ہے۔ اس سلسلے میں امام ابن العربی کی کتاب العواصم من القواصم کا مطالعہ انتہائی مفید ہے۔

مولانا محمد ادریس فاروقی اس توازن کو قائم رکھنے میں کافی حد تک کامیاب رہے ہیں اور انھوں نے بڑی عرق ریزی سے مواد جمع کر کے دونوں پہلو قارئین کے سامنے رکھ دیئے ہیں۔ ان کی یہ کاوش انتہائی قابل ستائش اور لائق مطالعہ ہے۔

اخوکم فی الدین

محمد ذوالفقار

تقریظ 3
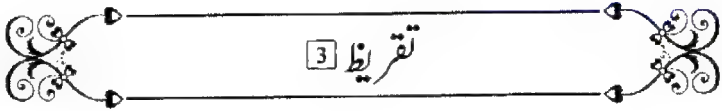
ادیب شہیر، جماعتی سوانح نگار ملک عبدالرشید عراقی (مؤلف کتب کثیرہ)

بسم اللّٰہ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم. إنّ الحمد للّٰہ نحمدہ و نستعینہٗ ونستغفرہ ونعوذ باللّٰہِ من شرور أنفسنا ومن سیئاتِ أَعْمَالِنَا، من یَّھْدہ اللّٰہ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِل فَلا ھَادِیَ لَہٗ ۔ وأَشْھَدُ أَنْ لّا اِلٰہَ إِلَّا اللّٰہ وَأَشْھَدُ اَنّ مُحَمَّدا عَبْدہ وَرَسُوْلُہٗ ، أَمّا بعد!

محترم جناب حکیم محمد ادریس فاروقی ﷾ نے جس موضوع پر قلم اُٹھایا ہے موجودہ دور میں اس موضوع کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ اور یہ حضرت حکیم صاحب کی خوش بختی ہے کہ اللہ نے ان کو اس سعادت سے نوازا ہے۔ میری دُعا ہے کہ اللہ ان کو اس راہ میں کامیابی و کامرانی عطا فرمائے۔ آمین۔ موصوف نے پہلے بھی شاندار کتابیں لکھ کر اپنے آباء و اجداد کا نام روشن کیا۔ اور ''قندیل'' نے تو کمال ہی کر دیا۔ اور یہ کتاب لکھ کر شان رسالت کے بعد شان اہل بیت و صحابہ رضی اللہ عنہم کا جھنڈا الہرا دیا۔ اور خوشی ہے کہ یہ توفیق اللہ نے آپ کو عطا فرمائی۔ اور جو لکھا بہت صحیح اور آسان زبان میں لکھا۔ ہم سوہدرہ والے ان خدمات پر آپ کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ موصوف کی ان خدمات جلیلہ کو شرفِ قبول عطا فرمائے۔ آمین

سیرت حسین رضی اللہ عنہ کا موضوع اس لیے بھی اہم ترین ہے کہ آج دُنیا میں اس موضوع کو حقیقت سے ہٹ کر بہت مبالغہ آرائی کرتے ہوئے اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ یا تو اُن کو اتنا بڑھا چڑھا کہ بیان کیا جاتا ہے کہ نبوت بھی ان کے مقام کے سامنے ہیچ نظر آنے لگتی ہے۔ اور جب اُن کی شہادت کا تذکرہ آئے تو ان کو اتنا مظلوم بنانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ایسی باتیں بھی ذکر کی جاتی ہیں کہ جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اور اگر انسان ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچے اور غور کرے تو یہ سب عجیب سا لگتا ہے، مثلاً میدان کربلا میں جناب حسین رضی اللہ عنہ کا پانی بند کر دیا جانا، جب کہ دوسری طرف یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ شہادت سے قبل انھوں نے غسل فرمایا۔ نورہ (چونا) استعمال کیا۔ اور شہادت کے لیے تیار ہوئے، اب کتنی عجیب بات ہے کہ ایک طرف پینے کے لیے ایک گھونٹ پانی میسر نہیں تو دوسری طرف غسل کے لیے پانی کہاں سے آ گیا؟

بیشک سیّدنا حسین رضی اللہ عنہ کا مقام بہت بلند اور عظیم ہے۔ لیکن اس کو اتنا بڑھا چڑھا کے پیش کرنا کہ بعض جگہ پر نبی سے بھی ان کو اونچا لے جانا میرے خیال میں یہ خود حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی توہین کے مترادف ہے۔

امام کائنات جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

«أَنْزِلُوا النَّاسَ مَنَازِلَهُمْ»

''لوگوں کو ان کے مقام پر رکھو۔''[1]

جس کا مطلب ظاہر ہے۔ نبی کا مقام نبی کو دو، صحابی کا مقام صحابی کو دو، اہل بیت کا مقام اہلِ بیت کو دو۔ نہ نبی کو اتنا بڑھاؤ کہ خدا کے برابر کر دکھاؤ۔ نہ صحابہ واہلبیت رضی اللہ عنہم کو اتنا بڑھاؤ کہ ان کے مقام کے سامنے نبوت بھی ہیچ دکھائی دے۔

---

[1] سنن أبي داود: 4842، اسناده ضعيف.

یہ تو حدیث رسول ﷺ کی بھی مخالفت ہے۔

جناب محترم ادریس فاروقی حفظہ اللہ نے یہی شاندار کاوش کی ہے۔ یہ پہلے تقریباً اڑھائی سو صفحات کی کتاب تھی، اب محترم موصوف نے جو ضروری باتیں رہ گئی تھیں انھیں بھی اس میں شامل کر دیا ہے۔ اور یہ اضافہ یونہی نہیں ہے بڑا مفید اور بامقصد ہے۔ اس سے کتاب کی علمی و تاریخی حیثیت بڑھ گئی ہے۔ موصوف کا یہ تخلیقی شاہکار ہے جو آپ نے راہ اعتدال اختیار کرتے ہوئے قوم کی خدمت میں پیش کیا ہے۔ اور یہ اعتدال قائم رکھنا ہی مشکل کام ہے۔ بیشک ایسی کتب کی فی زمانہ بہت ضرورت ہے جس سے عظمت صحابہ و شان اہل بیت رضی اللہ عنہم کے پرچم سرنگوں نہ ہونے پائے۔ اور بتایا ہے کہ حدیث اور تاریخ سے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا جو صحیح مقام بیان ہوا ہے، جس میں نہ اتنی مبالغہ آرائی کی جائے کہ ان کی محبت کی آڑ میں دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بُرا بھلا کہا جائے اور نہ ان کو اتنا مظلوم ثابت کرنے کی کوشش کی جائے کہ اُن کی طرف کچھ ایسی غیر حقیقی باتوں کو بھی منسوب کر دیا جائے جو ان کی شایان شان نہیں۔ مصنف کا خیال ہے اور بہت عمدہ خیال ہے کہ ہر قسم کی افراط و تفریط (کمی بیشی) سے بچ کر مستند اور مدلل بات عوام کے سامنے پیش کی جائے کہ جس سے حقیقت کا کچھ اندازہ ہو جھوٹ اور غلط بیانی کے بادل چھٹ جائیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے صرف یہی کچھ نہیں ملے گا بلکہ اور بھی بہت کچھ ملے گا۔ یقیناً ''سیرت حسین رضی اللہ عنہ مع سانحہ کربلا'' اپنے موضوع پر منفرد اور قابل مطالعہ کتاب ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ حضرت فاروقی صاحب حفظہ اللہ کی اس کاوش کو قبول فرمائے، اور اسے ان کی دین و دنیا کی کامیابی کا ذریعہ بنائے، آمین۔ اہل اسلام کا خواہ مخواہ آپس میں جھگڑنا اچھا نہیں۔ اور دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان سچی باتوں کو پڑھ کر حقائق سے آگاہ ہو کر سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

تقریظ 4

مؤرخ وسوانح نگار وادیب شہیر احمد کامران صاحب، دارالسلام لاہور

جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے شام کے ایک عیسائی قبیلے (Jacobite christian) کی ایک دوشیزہ میسون سے شادی کرلی۔ اس شادی سے جناب امیر رضی اللہ عنہ کا مقصد یہ تھا کہ مقامی باشندوں کی حمایت میسر آئے تاکہ اس دور افتادہ خطے میں مسلمانوں کی حکومت مضبوط بنیاد پر قائم ہوجائے۔ اس مقصد میں جناب امیر رضی اللہ عنہ خاطر خواہ طور پر کامیاب رہے۔ لیکن اس کے پہلو بہ پہلو ایک خرابی بھی پیدا ہوگئی۔ وہ یہ کہ ہر چند یزید کی والدہ مسلمان ہوگئی تھی لیکن اس کی ننھیال کے بہت سے لوگ مشرف بہ اسلام نہ ہوسکے۔ اس طرح یزید بیک وقت دو تہذیبوں کی آغوش میں پروان چڑھا۔ وہ اپنے والد گرامی کی خدمت میں ہوتا تو اسلام کی عظیم روایات اور عربی تہذیب کا بانکپن دیکھتا تھا اور والدہ کے ساتھ دمشق سے باہر شام کے سرحدی علاقے میں نانا، نانی کی جاگیر پر جاتا تھا تو وہاں اسے عیسائی تہذیب و ثقافت کے مظاہر نظر آتے تھے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یزید کی طبیعت نے بیک وقت دونوں تہذیبوں کے اثرات قبول کیے۔

رہے امام حسین رضی اللہ عنہ تو ان کے مقام ومنزلت کے بارے میں اس سے بڑھ کر اور کیا کہا جاسکتا ہے۔

؎ دنیا میں اور کون ہے شبیر کے سوا ؟ (رضی اللہ عنہ)

ایسا سوار جس کی سواری رسول ہے (صلی اللہ علیہ وسلم)

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے سردارِ دو جہاں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کندھوں پر سواری کی تھی۔ ان کی مقدس آغوش میں ہوش سنبھالا تھا۔ بانوئے محترم سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا جیسی بے مثل ماں اور سیدنا علی کرم اللہ وجہہ جیسے باب العلم سے قرآن و سنت، ایمان و یقین، علم و نظر، تقویٰ و طہارت، جرأت و بسالت، ندرت و نفاست اور اعلیٰ شرافتوں کا سبق سیکھا تھا۔ وہ اہلِ بیت رضی اللہ عنہم ہی کے چاند نہ تھے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی آنکھوں کی ٹھنڈک بھی تھے۔ خاص طور پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو اہلِ بیت رضی اللہ عنہم کے دونوں شہزادوں حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہما سے اپنی اولاد سے بھی بڑھ کر محبت کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ان شہزادوں کو دیکھتے تھے تو فوراً گلے سے لگا لیتے تھے۔ فرماتے تھے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشابہت رکھتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر سیّدنا و مولانا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جمالِ بے مثال نظروں میں پھر جاتا ہے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی محبت اور وارفتگی کا عجیب عالم تھا۔ آپ ہی کا دورِ خلافت تھا۔ حاکم یمن نے بہت سی عمدہ پوشاکیں بھیجیں۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے عام مسلمانوں میں تقسیم فرما دیں۔ پھر اچانک حسن رضی اللہ عنہ اور حسین رضی اللہ عنہ پر نظر پڑی۔ کاشانہ نبوت کے یہ دونوں شہزادے معمولی سا لباس پہنے ہوئے تھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بے قرار ہوگئے۔ فوراً حاکم یمن کو لکھا کہ نہایت شاندار دو جوڑے اور بھیجو۔ یہ جوڑے آئے اور جناب حسن و حسین رضی اللہ عنہما نے پہنے۔ تب جا کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو چین نصیب ہوا۔ ان حوالوں سے شبیر و یزید کی شخصیتوں طبیعتوں اور مرتبہ و منزلت میں جو فرق اور فاصلہ

نظر آتا ہے، وہ ایسی ظاہر و باہر حقیقت ہے جسے تاریخ کی گونج ہمیشہ نمایاں کرتی رہے گی۔

سانحۂ کربلا سے پہلے ماضی کے خیابان میں کچھ دور پلٹ جائیے اور صورتحال کا نقشہ دیکھیے تو کئی حقائق بڑی وضاحت سے سامنے آتے ہیں۔ امام حسین رضی اللہ عنہ اپنے عہد کے بڑے سکالر، انتہائی ذہین و فطین دانشور اور بے مثل خطیب تھے۔ ان کا دینی اور سیاسی اعتقاد یہ تھا کہ مملکت کا اصل مالک اللہ رب العزت ہے۔ اس لیے مملکت پر صرف اسی مردِ مجاہد کی حکومت ہونی چاہیے جس پر امت مسلمہ اظہار اعتماد کرے، جو سرکاری خزانے کا امین ہو اور اس میں ذاتی تصرف نہ کرے۔ جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے تک اسلام کے اساسی جوہر محفوظ تھے۔ اس لیے اپنے برادرِ معظم امام حسن رضی اللہ عنہ کی طرح حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے بھی جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت تسلیم کر لی۔ انھوں نے ان کی فرمانروائی کے خلاف کبھی کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ حتیٰ کہ جب امام حسن رضی اللہ عنہ وفات پا گئے تو کوفیوں نے سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ سے کہا کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا معاہدۂ بیعت حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا، آپ کے ساتھ نہیں تھا۔ اس لیے آپ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیجیے۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے یہ مشورہ دینے والوں کو حقارت سے جھڑک دیا اور جناب امیر رضی اللہ عنہ معاویہ کی حکومت کی بدستور اطاعت کرتے رہے۔ لیکن جب وقت کا دھارا بدلا اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے شورائی طریق انتخاب کے برعکس یزید کی نامزدگی عمل میں آئی اور پھر اس کی بیعت کا مطالبہ سامنے آیا تو سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ اس سے متفق نہ ہو سکے۔ انھوں نے اس بیعت سے صاف انکار کر دیا۔ اس باب میں امام محترم رضی اللہ عنہ کے خطبات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یزید کی نامزدگی کو اسلام کے سیاسی نظام میں بگاڑ کا موجب سمجھتے تھے۔ وہ یہ

محسوس فرماتے تھے کہ اس نامزدگی سے خلافت کی جگہ عجمی اور موروثی شہنشاہیت جیسے نظامِ حکومت کی داغ بیل پڑ جائے گی۔ ان کی رائے بے بنیاد نہیں تھی۔ اور انھیں اپنی رائے کے اظہار و اعلان کا حق بہر حال حاصل تھا۔

کفار کی جارحیت سے مقابلہ آ پڑے تو مسلمانوں کو ان کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا اور دندان شکن جواب دینا چاہیے۔ لیکن جب خود مسلمانوں ہی کی حکومت میں کوئی بگاڑ راہ پانے لگے تو اس صورت میں ایک مردِ مومن کا کیا رول ہونا چاہیے؟ اس سوال کا جواب امام حسین رضی اللہ عنہ نے اپنی ٹوٹی ہوئی تلوار، بکھری ہوئی زرہ، اپنے اور اہل بیت رضی اللہ عنہم کے بہتے ہوئے خون اور پُر جلال چہروں سے دیا۔ یوں انھوں نے ہمیشہ کے لیے بتا دیا کہ انسان کا اصل فرض صرف اللہ رب العزت کی بندگی اور اقدارِ عظیمہ کی حفاظت و اشاعت کرنا ہے۔ اگر کوئی مسلمان حکمران دینی نظامِ زندگی کے کسی بھی شعبے میں انحراف و اختلال کی ڈگر پر چل پڑے تو چپ چاپ نہیں بیٹھنا چاہیے، اصلاحِ احوال کے لیے اٹھ کھڑا ہونا چاہیے۔ چاہے اس کوشش میں جان چلی جائے۔ چنانچہ وہ آخر دم تک یزید کی بیعت سے انکار کرتے رہے۔ جب کربلا میں کوفی و شامی جدال و قتال کے درپے ہوئے تو امام الشہداء نے آخر دم تک خونریزی سے بچنے کی پوری کوشش کی۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میں واپس مکہ مکرمہ جانے کو تیار ہوں۔ مجھے جانے دو۔ کوفی نہ مانے تو آپ رضی اللہ عنہ نے دوسری تجویز یہ پیش کی کہ مجھے سرحد پر جانے دو تاکہ میں کفار سے جہاد کروں۔ یہ تجویز بھی مسترد کر دی گئی تو آپ رضی اللہ عنہ نے تیسری تجویز پیش فرمائی کہ مجھے یزید کے پاس جانے دو۔ میں اس سے خود بات کروں گا۔ سید الشہداء کی یہ تینوں تجاویز کتنی مہذب، کس قدر مبنی اصول، کتنی معقول اور بے ضرر تھیں۔ ان تجاویز سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت المحترم رضی اللہ عنہ لشکر کوفی و شامی سے لڑائی کے ہرگز خواہش مند

نہیں تھے۔ پھر وہ کونسی سفاک خواہش تھی جس کی تسکین کے لیے کوفی سپاہ کی تلواریں اہل بیت کے سروں پر چمکنے لگیں؟

کمریں کسے ہوئے تھا زمانہ جدال پر
کیا وقت پڑ گیا تھا محمد (ﷺ) کے لال پر!

کیا یہ خون آشام فضا یہ بتانے کے لیے کافی نہیں کہ جاہ و حشمت اور دولت و حکومت کے متوالے کوفی بالشتیے، شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار تھے۔ وہ یزید کی نظر میں اپنا قد بڑھانے کے لیے امام حسین رضی اللہ عنہ سے بیعت کا مطالبہ کر رہے تھے۔ ان بالشتیوں کو اہل بیت کے سربلند سردار کی سربلندی گوارا نہ تھی۔ پس ان بونوں کی تلواریں بے نیام ہوئیں اور دیکھتی آنکھوں سادات کے خون سے رنگین ہو گئیں۔ اس مقدس خون کی ہر بوند نے عرب و عجم کے ان تمام جری انسانوں کو جو حق و باطل کی لا متناہی جنگ میں مصروف ہیں یہ دائمی سبق سکھایا کہ اعلیٰ مقاصد اور اقدار جلیلہ کی علمبرداری کے لیے ہمیشہ اور ہر حال میں پوری ثابت قدمی سے ڈٹے رہنا چاہیے، چاہے اس کے لیے کتنی ہی بڑی قیمت دینی پڑے۔

اے خاکِ کربلا! اس احسان کو نہ بھول
تڑپی ہے تجھ پہ لاشِ جگر گوشۂ رسول (ﷺ)
سادات کے لہو سے تری پیاس بجھ گئی
سیراب کر گیا تجھے خونِ رگِ بتول (رضی اللہ عنہا)

یہ جگر پاش سانحہ 61 ہجری سے آج تک مسلسل آنسوؤں کی برسات میں پڑھا جا رہا ہے اور جب تک زمانہ گردش میں رہے گا خلیفہ مظلوم سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے خونِ ناحق کی طرح سانحہ کربلا بھی ہماری آنکھوں سے آنسو چھینتا رہے گا۔ اس سانحے کے

جو الم انگیز اور تباہ کن نتائج نکلے، وہ بہت سی کتابوں میں چھپ چکے ہیں۔ اس سانحے کا ایک انتہائی روح فرسا نتیجہ یہ نکلا کہ امتِ مسلمہ کی وحدت میں دراڑیں پڑ گئیں۔ دین حنیف کی رُو سے سب مسلمان ایک دوسرے کے جان نثار بھائی ہیں اور انھیں باہم اخوت و محبت ہی سے رہنا چاہیے، سانحۂ کربلا نے اس وحدت و اخوت کو ماؤف کر کے انھیں فرقہ واریت کے ناپاک اور ہلاکت بار سانچوں میں ڈھال دیا۔ یوں امتِ مسلمہ تاریخ کے جبر کا شکار ہو کر شیعہ، سنّی کے خانوں میں بٹ گئی۔ بعض علمائے کرام نے لکھا ہے کہ تشیّع کی بنیاد اسی وقت پڑ گئی تھی جب حضرت علی کرم اللہ وجھہ کا ٹکراؤ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور خارجیوں سے ہوا۔ اس زمانے میں اہلِ بیت رضی اللہ عنہم کے لیے کوئی مخصوص امتیازی لقب اختیار نہیں کیا گیا تھا۔ اس وقت تک امتِ مسلمہ کا یہ عظمت مآب طبقہ ''بنو ہاشم'' ہی کہلاتا تھا۔ اور اس کا سب سے بڑا شرف و مجد یہی تھا کہ یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پاکباز گھرانہ ہے۔ یہی حال بنی امیہ کا تھا۔ انھوں نے بھی اپنے لیے کوئی مخصوص تعظیمی لقب رائج نہیں کیا۔ عام مسلمان انھیں محض ''اموی'' کہتے تھے۔ اس وقت تک اہل سنت والجماعت کا بھی کوئی نام بطور ٹائٹل سننے میں نہیں آیا تھا، سب اپنے آپ کو صرف مسلمان کہتے تھے۔ اللہ رب العزت کو وحدہٗ لاشریک مانتے تھے۔ قرآن کو حرفِ آخر گردانتے تھے۔ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں پر عمل کے زیادہ سے زیادہ متمنی رہتے تھے اور خود کو خیر الامم کہلوا کر خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ کربلا کے الم انگیز سانحے کے بعد یہ صورتحال بدل گئی۔ سانحۂ کربلا کے نتائج کو عام علمی دنیا کس نقطہ نظر سے دیکھتی ہے؟ اس بارے میں مشہور مؤرخ پروفیسر فلپ کے ہٹی کی تحریر پڑھیے۔ اس نے سانحہ کربلا تفصیل سے لکھا ہے اور آخر میں یہ ریمارکس دیے ہیں:

The blood of Husayn, even more than that of his father, proved to be the seed of the shi, ite' church shi ism was born on the tenth of Muharram.....Hiatory of the Arabs p.191.

"یعنی حضرت امام حسین کی شہادت ان کے والد گرامی سیدنا علی کرام اللہ وجہہ کی شہادت سے کہیں زیادہ الم انگیز اور روافض خیز ثابت ہوئی۔ اور خونِ رگِ تبول رضی اللہ عنہا سے اسلام میں شیعہ مکتب فکر کی بنیا پڑگئی۔ تشیع کا آغاز فی الحقیقت 10 محرم ہی سے ہوا۔"......

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مُثلے کی ممانعت فرمائی تھی۔ اس مقدس تعلیم وتاکید کی سر عام خلاف ورزی کی گئی۔ سید السادات سمیت شہدائے کربلا کے سر قلم کر کے دمشق بھیج دیے گئے۔ افسوس! نیزوں میں پروئی ہوئی مقدس گردنوں سے خون کی ٹپکتی ہوئی بوندیں دیکھ کر بھی کسی نے صدائے احتجاج بلند نہیں کی۔ کوفہ کے ایوانوں اور دمشق کے محلات میں سناٹا چھا گیا۔ کوئی متنفس ایسا نہ تھا جو فرمانروائے وقت سے اتنا ہی پوچھ لیتا کہ کیا کربلا کے ریگزار میں حسین اور ان کے جلیل القدر خانوادے کا بہتا ہوا خون بھی تمھاری انانیت کی پیاس بجھانے کے لیے ناکافی تھا؟ تم نے یزید کے لیے بیعت طلب کی۔ حسین رضی اللہ عنہ نے انکار کردیا۔ تم نے انھیں مار ڈالا۔ قصہ ختم۔ تم حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے پیاروں کی تڑپتی ہوئی لاشوں سے اُن کی زندگی کی آخری رمق چھیننے کے بعد بھی شادکام نہیں ہوئے۔ آخر تم کیا چاہتے تھے؟ تمھیں یہ حق کس نے دیا کہ تم مقدس مظلوموں کی لاشوں کے سر کاٹ ڈالو۔ اور زمانۂ جاہلیت کی وہ مذموم رسم پھر جاری کردو جس کا اللہ کے آخری رسول اور حسین کے بے مثل نانا صلی اللہ علیہ وسلم نے سد باب کردیا تھا؟ ...... اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ جسد ملت پر اس سفا کی اور شقی القلبی کی ضرب کس طور پر، کیسے کیسے پیرائے میں، کس وقت تک کہاں، کہاں پڑتی

رہے گی؟

راقم الحروف نے سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کی سیرت اور سانحۂ کربلا کے بارے میں جو کچھ پڑھا ہے اس سے طبیعت مطمئن نہیں ہوئی۔ ہمیشہ یہی محسوس ہوا جیسے مؤرخین کہیں نہ کہیں تاریخ کے بے لچک معیار و مقیاس سے دور ہٹ گئے ہیں اور افراط و تفریط سے کام لے رہے ہیں۔ اس باب میں راقم بھارت کے مرحوم صدر ڈاکٹر ذاکر حسین رحمہ اللہ کے ایک بصیرت افروز مقالے سے متاثر ہوا۔ مرحوم نے کسی کی مدح و ذم کا قصہ ہی نہیں چھیڑا۔ انھوں نے اپنے حرفِ شیریں ترجمان کے ذریعے سادہ، متوازن اور نہایت دل گداز اسلوب میں صرف سانحۂ کربلا کا نتیجہ اور ضمناً لا الٰہ الا اللّٰہ کی ایمان افروز حقیقت بیان کی اور علامہ اقبال رحمہ اللہ کے اس شعر کی بے مثل تشریح کردی ہے ۔

نقشِ الا اللہ برصحرا نوشت
سطر عنوانِ نجات ما نوشت!

مولانا محمد ادریس فاروقی رحمہ اللہ ایک موقع پر سوہدرہ سے اپنے عالم باعمل صاحبزادے مولانا حافظ محمد نعمان فاروقی حفظہ اللہ سے ملنے لاہور تشریف لائے تو ''سیرت حسین رضی اللہ عنہ مع سانحہ کربلا'' کے زیرِ عنوان اپنی تالیف کا مسودہ بھی ساتھ لائے۔ مجھے اس کتاب کا مسودہ پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ پہلا باب، دوسرا باب، تیسرا باب، میں اسی طرح بتدریج پڑھتا اور آگے بڑھتا گیا۔ ہر باب گزشتہ باب سے بڑھ کر آگہی بخش نکلا۔ یوں محترم فاروقی صاحب رحمہ اللہ اپنے رشحاتِ قلم کے ذریعے ماضی کے آئینے دکھاتے رہے...... انھوں نے کتنے قدیم حقائق کس خوبی سے جدید پیکر و پیراہن میں پیش کیے ہیں اور کتنی بڑی شخصیت اور کتنے نازک موضوع پر کیسی بے لاگ علمی دستاویز مرتب کردی ہے۔ انھوں نے قرآنِ کریم اور احادیث مقدسہ کی روشنی میں تاریخ کے

نشیب و فراز کے مطالعے کے بعد بڑی احتیاط سے سیرت حسینی کے پھول چنے ہیں۔ اس سلسلے میں جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور یزید کا تذکرہ ناگزیر تھا، محترم فاروقی صاحب رحمہ اللہ اس مرحلے سے جس اعتدال سے گزرے، وہ ان کی فکری سلامتی کی بڑی مستند پہچان ہے۔ انھوں نے تاریخی دلائل کی روشنی میں سانحۂ کربلا اس طرح بیان کیا کہ ایک طرف اس سانحے کی الم انگیزی ہلا کر رکھ دیتی ہے تو دوسری طرف ان کی تحریر کے کندھے پر غلو کا کوئی بوجھ نظر نہیں آتا۔ یوں لگتا ہے جیسے محترم مؤلف کی محتاط نگاہیں Search Light کی طرح کام کرتی ہیں۔ انھوں نے آثار صحابہ رضی اللہ عنہم اور تاریخ کے بے شمار اوراق کھنگالے ہیں، اس دوران وہ ہر اہم موڑ پر رُکے ہیں۔ واقعات و حالات کا جائزہ لیا ہے، ہر معاملے کی جانچ پرکھ کی ہے اور جو واقعہ جس شکل میں نظر آیا ہے اسے اسی صورت میں اس کتاب کے اوراق پر پھیلا دیا ہے۔ انھوں نے کسی کی مدحت یا مذمت سے کوئی سروکار نہیں رکھا۔ کسی قسم کی کوئی رنگ آمیزی نہیں کی۔ کہیں کوئی مبالغہ نہیں کیا۔ وہ مَنْ قَالَ (کس نے کہا) سے زیادہ مَاقِیلَ (کیا کہا گیا) کے قائل ہیں۔ انھوں نے حقائق کے چہرے پر جذبات کے چھینٹے نہیں پڑنے دیے۔ انھوں نے ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مؤقف بڑی صراحت سے بیان کیا ہے جو نظامِ حکومت میں بڑھتے ہوئے عجمی اثر و رسوخ کی روک تھام، امتِ مسلمہ کے اتحاد اور یک جہتی کی خاطر یزید کی بیعت پر راضی ہوگئے۔ ان کی حریتِ فکر، وسعتِ نظر، عالی ظرفی اور بے تعصبی کا یہ عالم ہے کہ بریلوی مکتبۂ فکر کے کسی بزرگ نے بھی کوئی حق بات کہہ دی ہے تو انھوں نے اس کا بھی لحاظ رکھا ہے اور ان کے موقف کا اندراج کر کے التزام سے اس کا حوالہ دیا ہے۔

جناب فاروقی صاحب نے محدثین کرام رحمہم اللہ کے ارشادات اور ثقہ مؤرخین کی کتابوں کے حوالے بڑی کثرت سے دیے ہیں اور یزید کے بارے میں اس کے

ناقدوں اور مدّاحوں کے تأثرات بے کم وکاست بیان کردیے ہیں۔ یوں انھوں نے قارئین کرام کو...... تو ''خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل'' ...... کا موقع فراہم کیا ہے۔

جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے جن توقعات اور اسباب و مصالح کے پیش نظر یزید کو اپنا جانشین بنایا تھا، محترم فاروقی صاحب نے ان کا تجزیہ بڑی محنت اور جرأت سے کیا ہے۔ اور جو حضرات جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے کدر رکھتے ہیں انھیں دلیل اور دردمندی سے یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ بالفرض جناب امیر رضی اللہ عنہ سے کوئی اجتہادی بھول چوک ہو بھی گئی ہو تب بھی انھیں نقد و نظر کی سان پر رکھنا ہرگز مناسب نہیں۔ اس لیے کہ

ع...... خطائے بزرگاں گرفتن خطاست!

''بزرگوں کی غلطیاں پکڑنا بجائے خود ایک غلطی ہے۔''

رجب 60 ہجری میں جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بیمار ہو کر پابند بستر ہو گئے۔ اس سے آپ نے یزید کو بلا بھیجا۔ وہ حاضر ہوا تو اسے یہ وصیت فرمائی:

''اے یزید! ہمیشہ اللہ سے ڈرتے رہنا، خلافت کا معاملہ تمھارے سپرد ہوا، اب تم ان تمام معاملات پر با اختیار ہو جن پر میں تھا...... لوگوں سے نرم برتاؤ کرنا، ان کی طرف سے تمھارے لیے تکلیف دِہ اور ہتک آمیز باتیں سرزد ہوں گی۔ مگر تم چشم پوشی کرنا...... خبردار! بزرگوں اور نیک لوگوں کا ہمیشہ خیال رکھنا، ان کے ساتھ کبھی توہین یا تکبر سے پیش نہ آنا...... جب کسی کام کا ارادہ کرو، تو نیک، پرہیزگار، عمر رسیدہ اور آزمودہ کار لوگوں کو بلا کر مشورہ کرنا...... ہر وقت مستعد رہنا، اپنے لشکر کی حفاظت رکھنا، نیز اپنے آپ کی اصلاح کرتے رہنا...... اپنے بارے میں لوگوں کو انگلیاں اٹھانے کا موقع نہ دینا، کیونکہ عام

لوگ عیب جوئی میں جلد باز ہوتے ہیں...... نماز میں ہمیشہ حاضر رہنا...... یاد رکھو! اہل مکہ و مدینہ کے عزوشرف پر کبھی آنچ نہ آنے پائے...... مختلف علاقوں سے آنے والے وفود سے اچھا برتاؤ کرنا...... بدخواہوں اور چغل خوروں کو چنداں اہمیت نہ دینا۔[1]

بظاہر یہ ایک بیٹے کو ایک جلیل القدر باپ کی وصیت ہے۔ مگر دیکھیے کہ ان سیدھے سادھے مسخر کر لینے والے دانش آموز جملوں میں ایک بڑے انسان کا پاکیزہ باطن کس طرح جگمگا رہا ہے۔ یہ وصیت عمل میں آجاتی تو انتشار و افتراق اور درد و درماندگی کے مجموعے کی بجائے آج ہماری تاریخ کتنی شاندار ہوتی۔

محترم فاروقی صاحب رحمہ اللہ جس معروف اور مکرم علمی خانوادے کے چشم و چراغ تھے وہ عرصہ دراز سے غیر منقطع طور پر اہم دینی اور علمی خدمات انجام دیتا آرہا ہے۔ محترم فاروقی صاحب نے اپنے علم اور اپنی اُجلی سیرت سے اپنے بزرگوں کا نام روشن کیا ہے۔ اور اپنے علمی کارناموں سے اپنے آبائے کرام کے دینی اور علمی اثاثوں میں بیش قیمت اضافہ فرمایا ہے۔ اس طرح انھوں نے نئی نسلوں کو ماضی کی اقدار اور روایات سونپ کر انھیں گزشتہ سے پیوستہ کرنے کی سعیِ جمیل کی ہے۔ یہ بجائے خود ایک بڑا کارنامہ ہے جو اچھی سیرت سازی کے لیے نامعلوم مدت تک بڑے مبارک وسیلے کا کام دے گا۔

آج کل کے نوجوان سائنس کے نت نئے انکشافات اور ٹیکنالوجی کے کمالات کی زد میں آکر ہکا بکا ہوگئے ہیں۔ وہ دینی علوم سے بے گانہ ہیں۔ اپنی تاریخ سے نابلد ہیں۔ انھیں اس حقیقت کا احساس ہی نہیں کہ آبرو اور آسودگی کی زندگی اغراض سے نہیں اعلیٰ اقدار سے نصیب ہوتی ہے۔ اس لیے ہمارے عزیز نوجوانوں کو یہ کتاب ضرور پڑھنی

---

[1] ملخص از البداية والنهاية : 230/8.

چاہیے۔ سیرت حسین رضی اللہ عنہ کی عظمت و رفعت دیکھ کر انھیں معلوم ہوگا کہ اسلامی تعلیمات نے کیسے کیسے نادر اور بہادر انسان پیدا کیے ہیں۔ جنہوں نے صرف اللہ کے بھروسے پر اپنے بے سروسامان ارادوں سے تاریخ کے دھارے بدل ڈالے۔ ان شاء اللہ اس کتاب کے مطالعے سے انھیں فکری طہارت نصیب ہوگی، خیابانِ اسلام کی مہک میسر آئے گی۔ ان کا ایمان مضبوط ہوگا اور ان کے رویوں میں خوش آئند تبدیلی آئے گی...... فی الجملہ یہ کتاب تمام مسلمانوں بالخصوص نوجوانوں کو یہی دعوت دیتی ہے ؎

سفالِ پاک سے مینا و جام پیدا کر
نئے زمانے، نئے صبح و شام پیدا کر

احمد کامران

یکے از خدام دارالسلام، لاہور

تقریظ 5

مؤرخ وسوانح نگار کامران اعظم سوہدروی ڈبل ایم اے۔ مؤلف کتب کثیرہ

علامہ محمد ادریس فاروقی ﷾ جن کا تعلق عالمِ شہیر خطیبِ بے بدل حضرت مولانا عبدالمجید سوہدروی ؒ کے معزز علوی خانوادے سے ہے، علمی اعتبار سے اپنے آباء کی عین روش پر ہیں۔ موصوف کا تفصیلی تذکرہ میں نے اپنی تالیف ''تاریخ سوہدرہ'' میں کیا ہوا ہے۔ آپ کی زندگی کا ایک طویل حصہ دینی تبلیغ اور قرآن وسنت کی نشرواشاعت میں گزرا ہے۔ اس سلسلہ میں تحریراً انھوں نے اسلامی مجلّاتی صحافت اور تصنیفی شعبہ اختیار کیا ہے۔

صحافتی میدان میں ''ضیائے حدیث'' ان کے تبلیغی نہج کا آرگن ہے۔ جبکہ میدان تصنیف وتالیف میں انھوں نے اپنے ادارہ مسلم پبلی کیشنز کی بنیاد رکھی ہے۔ جو اُن کے دادا کے ادارے ''مسلمان کمپنی'' کا ہی تسلسل ہے۔ مسلم پبلی کیشنز کے تحت محترم موصوف کی اپنی کتب کے علاوہ دیگر مصنفین بالخصوص ان کے دادا جان حضرۃ العلام مولانا عبدالمجید خادم سوہدروی کی تصانیف شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اب تک موصوف اسلامی وطبی کوئی چالیس کتب شائع کر کے اپنے آباؤ اجداد کی گرانقدر خدمات اور ان کے اسلامی وطبی اداروں کا تحفظ کر چکے ہیں۔ اور سارا کام آپ نے کسی دوسرے کے سہارے بغیر اللہ کے سہارے پر خود ہی انجام دیا۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ دعا ہے اللہ کریم آپ کو اور ہمت عطا فرمائے۔ تا کہ آپ یہ کام

اور وسیع پیمانے پر سرانجام دے کر دینی وقومی خدمت بجا لاسکیں۔

''سیرت حسین رضی اللہ عنہ'' مسلم پبلی کیشنز سوہدرہ نے فروری 1989ء میں پہلی بار طبع کی، اس میں مولانا موصوف نے عالی مقام حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی حیات طیبہ کے روشن اور تابندہ پہلوؤں کو بہت خوبصورتی کے ساتھ طشت از بام کیا۔ان کی زندگی کے ہر گوشے پر جہاں انھوں نے روشنی ڈالی، وہاں اس میں واقعہ کربلا کو بھی تاریخی حوالہ جات کے ساتھ شرح وبسط کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔ یہ باتیں اس طرح کسی اور کتاب میں نظر نہیں آتیں۔ اور موجودہ ناگزیر علمی اور تاریخی اضافے نے اس کتاب میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ اس کتاب کے بغیر کسی لائبریری اور عالم ومبلّغ دین کے لیے بہت بڑا خلا ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے۔

میرے استاد المکرّم علامہ ادریس فاروقی نے بہت سی ایسی روایات کو آشکار کیا ہے جو پردہ اخفا میں تھیں یا ان کا مفہوم اور ہے مگر اور لیا جاتا ہے۔ اور اس سے بڑے بڑے مسئلے حل اور عقدے وا ہو جاتے ہیں۔ قارئین کو وہ مقامات دوران مطالعہ خود معلوم ہو جائیں گے اور بڑا لطف آئے گا۔ عامۃ الناس کو کئی موضوع روایات کے شہرہ کی وجہ سے ان حقائق سے اختلاف تو ضرور ہوسکتا ہے مگر تاریخی ثقہ روایات سے انکار بھی ممکن نہیں۔

98-1997ء میں بندہ چکوال بغرض ملازمت (OGDCL) تعینات تھا۔ وہاں ڈھڈیال اکثر آنا جانا رہتا تھا۔ وہاں ایک لائبریری سے کتب بغرض مطالعہ لے جا کر مطالعہ کرتا۔ وہاں سب سے پہلے حضرۃ العلام فاروقی صاحب حفظہ اللہ کی اس کتاب کو دیکھا اور پڑھا، نہایت پُر مغز، اور دلچسپ پیرائے میں لکھا پایا۔ ابھی اس کتاب میں خاصہ اضافہ کیا گیا ہے جو یقیناً وقت کی اہم ضرورت کے پیش نظر کیا گیا ہے۔ میرے خیال میں علمائے اہلحدیث میں اس موضوع پر یہ پہلی کتاب ہو گی۔ جو اپنے مواد، اثرانگیزی، جدّت، ندرتِ خیال اور فکری عمدگی اور ٹھوس مواد کے اعتبار سے، جامع اور

مکمل سوانح کا بہترین پہلا نمونہ ہے جو واقعاتِ تاریخ کربلا کو اپنے اندر شیعہ سنّی ٹھوس اور کثیر حوالہ جات کے ساتھ سموئے ہوئے ہے۔ ما شاء اللّٰه ولا قوّة إلا باللّٰه.

علامہ محمد ادریس فاروقی رحمہ اللہ نے امام حسین رضی اللہ عنہ کے حالات زندگی بڑی تفصیل کے ساتھ قلمبند کیے ہیں۔ جس سے اس بات کا اظہار بھی ہوتا ہے کہ اہل سنت کے فقہی گروہوں اور اہل تشیُّع کے علاوہ اہل حدیث بھی ان کی عقیدت کا اظہار بڑے والہانہ طریقے سے کرتے ہیں اور ایسے انداز میں کرتے ہیں کہ جو حقائق وصداقت پر مبنی ہے اور جو کتاب وسنت سے ثابت اور اس کے مطابق ہے۔ پھر واقعہ کربلا میں بھی جس انداز کو اپنایا ہے اس میں بھی امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کو خوش اسلوبی اور اثر وتاثیر میں ڈوبے ہوئے قلم کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔

کتاب میں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہونے والے ظلم کو حوالہ جات کی روشنی میں بیان کیا ہے۔ امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کو نہایت معتبر روایات کے سانچے میں اتارا ہے کہ اختلافات کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت یا واقعہ کربلا کے بارے میں عموماً مسالک اسلام میں دو نظریات پائے جاتے ہیں، ایک یزید کے مخالف ہیں اور دوسرا یزید کو اس واقعہ سے بریٔ الذمہ قرار دیتے ہیں۔

یزید سے متعلقہ یہ اختلاف فریقین کے اپنے اپنے دلائل سے آراستہ ہے۔ مگر حقیقت کچھ اور ہے۔ وہ اعتدال کا راستہ ہے۔ حضرۃ العلامہ محمد ادریس فاروقی صاحب نے اسی اعتدال کے راستے کو اختیار کیا ہے۔ اور جہاں یزید کو صحابی کے بیٹے اور مسلمان ہونے کی نسبت سے شہادت حسین رضی اللہ عنہ سے بَری قرار دیا ہے وہاں اس کی بعض غلط روشوں کا بھی برملا اظہار کر دیا ہے۔ اور شہادت حسین رضی اللہ عنہ کے واقعہ کو محض غلط فہمیوں اور کوفیوں کی منافقانہ روش کا حاصل قرار دیا ہے۔

یزید کے بارے میں حضرت مولانا محمد ادریس فاروقی صاحب لکھتے ہیں:

"یزید کے بارے میں یہ جو عوام کی زبان پر فاسق و فاجر کے الفاظ ہیں یہ الفاظ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے بھی باوجود یزید سے اختلاف رکھنے کے استعمال نہ کیے۔"[1]

دوسری جگہ لکھتے ہیں: "یزید حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا احترام بجا لاتا تھا۔ ان کی عظمت کا معترف تھا اور ان کی اہمیت کو جانتا تھا۔"[2]

کتاب میں واقعہ کربلا کا اصل مجرم ابن زیاد کو قرار دیا گیا ہے۔ جس نے فریب کاری کے ذریعہ جنگ جیسے حالات پیدا کر دیے۔ دوسری طرف اہل کوفہ کی غداری بھی اس سانحہ کا سبب بنی۔[3]

علامہ محمد ادریس فاروقی حفظہ اللہ نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ ایسے حقائق عیاں کیے جائیں جو عوام کی نظر سے تو اوجھل ہیں مگر مبنی بر حقیقت ہیں۔ جو اصل تاریخ ہیں۔ کتاب جاندار اور شاندار ہے۔ جو اللہ کے فضل و کرم سے حوالہ جات سے آراستہ و پیراستہ ہے۔

یہ کتاب کا تیسرا ایڈیشن ہے، جس کو حک و اضافہ کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔ کئی موضوعات جو ایڈیشن اول میں نہ تھے ان کو مناسب سمجھتے ہوئے شامل کر دیا گیا ہے تاکہ کتاب موضوع کے اعتبار سے باوزن و باحوالہ اور تکمیل بردوش بن جائے۔ صاحب ذوق افراد کے لیے یقیناً یہ کتاب سود مند ہو گی اور اس کا بنظر انصاف و اعتدال مطالعہ ان شاء اللہ انقلاب آفریں ثابت ہو گا۔ کتاب جب پڑھنا شروع کر دیں تو چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا، خواہ کتنی جلدی ہو۔ باذوق انسان اس کے بیسیوں صفحے پڑھ جاتا ہے۔

کامران اعظم سوہدروی

---

① سیرت حسین رضی اللہ عنہ، ایڈیشن اول صفحہ: 132 . ② سیرت حسین رضی اللہ عنہ: 140 . ③ ملاحظہ ہو، سیرت حسین رضی اللہ عنہ، صفحہ: 162 .

تقریظ 6

خادم علم وادب ونمونہ سلف ابوعمر سوہدروی ایم۔اے

اہل بیت رضی اللہ عنہم سے محبت عین ایمان ہے۔ تمام اہل بیت اطہار رضی اللہ عنہم کی زندگیاں مسلمانوں کے لیے مشعل راہ ہیں۔ اور جنہوں نے اہل بیت رضی اللہ عنہم میں سے صرف پانچ نفوس قدسیہ کو اہل بیت میں شامل کیا ہے وہ لوگ سراسر غلطی پر ہیں اور یہ نظریہ بھی صریحاً قرآن وسنت کے خلاف ہے اور اسی نظریے کی وجہ سے بعض مسلمان اضطراب وتذبذب کا شکار ہیں لیکن تاریخ نے اہل بیت کی اصطلاح کو بھی مسخ کر دیا جس سے مسلمانوں میں اہل بیت رضی اللہ عنہم کی محبت میں کئی فرقے بن گئے۔

اہل بیت اطہار رضی اللہ عنہم میں سیدنا حسین بن علی رضی اللہ عنہما ایسی شخصیت ہیں جن کے نام پر مسلمانوں میں تفضیلی اور غالی فرقے بن گئے جس سے مسلمان آپس میں لڑتے جھگڑتے رہے اور افسوس برصغیر پاک و ہند میں یہ جھگڑے اب بھی کم و بیش جاری ہیں۔ تاریخ کی من گھڑت روایات نے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی بے مثال سیرت اور واقعۂ کربلا کو مسخ کر دیا ہے حالانکہ قرآن وسنت کے اِستشہادات اور مستند روایات کی روشنی میں واقعۂ کربلا کا جائزہ لیں تو حقیقت یکسر الٹ نظر آتی ہے۔ اس لیے غیر مستند تاریخی روایات کوئی سند نہیں رکھتیں۔ تاریخ میں اسی ایک ہی واقعہ میں ڈھیروں تضادات دکھائی دیتے ہیں۔ تاریخ نے تو سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو بھی معاف نہیں کیا لیکن ایسی باتیں

مردود و نا قابل قبول ہیں کہ جن سے سیدنا حسن وحسین اور خاندان اہل بیت رضی اللہ عنہم اور اسی طرح صحابہ وصحابیات رضی اللہ عنہم کی عظمت ورفعت پر حرف آتا ہو۔

واقعۂ کربلا کی آڑ میں ہر سال ماہ محرم الحرام میں جس طرح کی نت نئی شرکیہ و بدعیہ رسومات دیکھنے میں آتی ہیں ان سے تو سیرت حسین رضی اللہ عنہ اور واقعۂ کربلا میں شامل نفوس قدسیہ کی عظمت ورفعت اور جانسپاری کسی حد تک پائمال دکھائی دیتی ہے، ہر مسلمان کے دل و دماغ کی عجیب کیفیت ہو جاتی ہے۔ اور یوں لگتا ہے جیسے شہادت حسین رضی اللہ عنہ کا مقصد محض رونا، واویلا کرنا مجالس برپا کرنا ہو۔ اُردو کی کتابوں میں واقعہ کربلا جس طرح لکھا ہوا ہے یا جس انداز میں واعظین سناتے ہیں وہ سراسر غلو سے بھرا ہوتا ہے جس میں من گھڑت تاریخی روایات بکثرت شامل ہوتی ہیں۔ جس سے عقائد صالحہ کو دھچکا لگتا اور سیرت صحابہ رضی اللہ عنہم کو اچھا خاصا نقصان پہنچتا ہے۔ سادہ لوح مسلمان گمراہ ہو جاتے ہیں۔ جس بیچارے کو حقیقت کا صحیح علم ہی نہ ہو اور دوسری طرف زوردار منفی پروپیگنڈہ ہو تو ناواقف لوگ اصل شاہراہ سے اتر کر گم راہ نہیں ہوں گے تو اور کیا ہوں گے؟ برصغیر پاک و ہند میں یہی واقعہ بنا سنوار کر اسٹیج پر پیش کیا جاتا تھا اور اب بھی بھارت میں ہندو ٹھاکروں کی سرپرستی میں ایسا ہو رہا ہے۔ برطانوی دورِ حکومت میں انگریز مؤرخین نے واقعۂ کربلا کی آڑ میں ہونے والی رسومات کی تصاویر اور رپورٹیں بنا کر برطانیہ کے اخبارات میں شائع کروائیں تاکہ برطانوی لوگوں میں یہ تأثر پھیلے کہ مسلمان قوم کتنی مہذب اور شائستہ ہے جو اپنے آپ کو آپ ہی مار رہی ہے۔ ایسی باتوں کا کچھ ذکر مشہور شیعہ محقق جناب ڈاکٹر موسیٰ الموسوی صاحب نے اپنی کتاب ''اصلاح شیعہ'' میں بھی فرمایا ہے۔

تیس سالہ خلافت راشدہ کے آخری دور کو محقق مؤرخین نے ''خلافت مفتونہ'' کا نام دیا ہے۔ فتنوں کے اس دور میں سبائیوں اور منافقین نے اسلام اور مسلمانوں کو اتنا

نقصان پہنچایا جس کا خمیازہ آج پوری اُمت مسلمہ کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔ واقعۂ کربلا بھی اسی دور کی کشمکش کا نتیجہ ہے ۔فتنوں کا یہ دور سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ساتویں سال سے شروع ہوتا ہے اور سیّدنا حسن رضی اللہ عنہ کی شہادت تک جاری رہتا ہے۔ شہادت عثمان رضی اللہ عنہ اور شہادت علی رضی اللہ عنہ کے واقعات کا بغور مطالعہ کریں تو بڑے حقائق سامنے آتے ہیں ۔ واقعۂ کربلا سے پہلے ہونے والی تین جنگیں، صِفّین، جَمل اور نہروان انھی فتنوں کے نتیجہ میں آپس میں لڑی گئیں۔

قرآنِ پاک میں کہیں مفصل اور کہیں مجمل قصص الانبیاء بیان کیے گئے جن میں مسلمانوں کے لیے بے شمار اسباق موجود ہیں اور ان اسباق میں ہمارے لیے عبرتیں، حکمتیں اور نصیحتیں شامل ہیں اسی طرح انبیاء علیہم السلام کے علاوہ صدّیقین، شہداء اور صالحین کی پاکیزہ زندگیاں بھی گوناں گوں اسباق سے پُر ہوتی ہیں۔ انھی شہداء اور صالحین میں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی حیات طیبہ مسلمانوں کے لیے بہت شاندار نمونہ ہے آپ کی ذات مقدسہ کے ساتھ جو سانحہ پیش آیا، اس میں تمام امتِ مسلمہ کے لیے ایک ایسا زبردست سبق ہے جو عبرت وحکمت اور لازوال نصیحت سے لبریز ہے، چاہیے تو یہ تھا ہمارے مسلمان بھائی اس دردناک والمناک واقعہ سے سبق حاصل کرتے ہوئے اپنی زندگیوں کو سنوارتے، اپنے دل کی کھیتیوں کو توحید وسنت کے پھولوں سے سجاتے اور اپنے ایمانوں کو نکھارتے لیکن دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ بے سروپا واقعات پر یقین کرتے ہوئے اندھی محبت میں ڈوب کر شرک وبدعات کی غلیظ دلدل میں پھنس گئے اور بے شمار جانی وایمانی نقصانات کے باوجود مسلمان اسی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ انجام کار مسلمان کئی بڑے اور ذیلی فرقوں میں بٹ گئے، اسے ہم المیہ ہی کہہ سکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ سیرت حسین رضی اللہ عنہ کے خوبصورت اور صحیح نقوش اور واقعۂ کربلا کی

اصل حقیقت کو لوگوں کے سامنے پیش کرنا بہت ضروری تھا۔لیکن اکثر قصہ گو واعظین نے اس واقعہ کو مزید دھندلا دیا اور اصل مقاصد کو اوجھل کر دیا۔سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی سیرت متعدد عربی کتب میں ہے لیکن اُردو میں کافی کتب شائع ہونے کے باوجود ابھی تک سیّدنا حسین رضی اللہ عنہ کی سیرت اور واقعہ کربلا کی حقیقت تشنہ ہی ہے۔اس تشنگی کو بہت حد تک ہمارے محترم الشیخ الفاضل محمد ادریس فاروقی حفظہ اللہ کے جادوئی قلم نے بجھایا ہے۔ الشیخ فاروقی صاحب نے انتہائی محنت شاقہ اور عرقریزی و شبانہ روز محنت سے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی سیرت کو نکھارا ہے اللہ کے فضل وکرم سے واقعۂ کربلا کے اسباب و واقعات اور نتائج صحیح روایات و دلائل کے آئینہ میں واضح ہو جاتے ہیں جس سے ہر قاری کا ذہن دلائل توحید وسنت اور فضائل اہلِ بیت وصحابہ رضی اللہ عنہم سے آشنا ہو جاتا ہے۔ہم تو اس کتاب کو دیکھ کر ''ماشاء اللہ'' ہی کہتے ہیں......۔

یہ کتاب سوانح نگاری کا حسین گلدستہ ہے حضرۃ المحترم فاروقی صاحب نے اپنی اس عظیم و وقیع کتاب میں غیر مسلم مؤرخین، مستشرقین اور ہندو شعراء کی خراج عقیدت کو بھی دلکش انداز میں زینت قرطاس بنایا ہے تاکہ دنیا جان لے کہ سیّدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا کتنا بلند و بالا مقام ہے۔امید ہے کہ اب کتاب کو پہلے سے زیادہ عوام وخواص میں قبول ہوگا۔ یہ کتاب مؤلف محترم نے حبِّ حسین رضی اللہ عنہ وحب اہل بیت و حب اصحاب رسول رضی اللہ عنہم کی محبت وعقیدت میں ڈوب کر لکھی ہے۔مؤلف نے دوسروں کو بھی مطالعہ کی آزادانہ آراء دی ہیں تاکہ دوست اسے حقیقت کی آنکھ سے پڑھیں۔اور کسی کو اس کتاب کی علمی و تاریخی حیثیت کو سمجھنے میں کوئی اعتراض یا عذر نہ رہے۔ان میں کئی ڈاکٹر، پروفیسر اور اسکالر ہیں۔بہر حال اس کتاب میں جہاں اہل بیت رضی اللہ عنہم کا تحفظ کیا اور ان کے پرچم کو لہرایا گیا ہے وہاں ساتھ ہی ساتھ اصحابِ رسول رضی اللہ عنہم کے پرچم کو بھی سربلند رکھا ہے۔ فجزاه الله احسن الجزاء فی الدنیا والآخرة.

بیشک کتاب کا تعلق مطالعہ سے ہے۔ ڈانواں ڈول اور گومگو میں گرفتار احباب کے لیے یہ شاہکار ایک انمول تحفہ سے کم نہیں۔ اور کتاب ہذا کو اسی طرح شائع کیا گیا ہے جس کی یہ شایان شان ہے۔ اُمید ہے اس کتاب کے مطالعہ سے لوگ صحابہ واہلِ بیت رضی اللہ عنہم دونوں کے بارے میں احترام کا رویہ رکھیں گے۔ کیونکہ بیک وقت دونوں کا احترام لازمۂ ایمان ہے۔

مولانا محمد ادریس فاروقی رحمہ اللہ (1944-2010ء)

مولانا محمد ادریس فاروقی بن حافظ محمد یوسف سوہدروی 1944ء میں بمقام سوہدرہ (گوجرانوالہ) پیدا ہوئے۔ آپ نے مدرسہ حمیدیہ سوہدرہ کے علاوہ دارالحدیث جہلم، جامعہ سلفیہ فیصل آباد اور جامعہ اسلامیہ گوجرانوالہ سے تعلیم حاصل کی۔ آپ کے علوم دینیہ میں یہ اساتذہ کرام یہ تھے:

حافظ محمد یوسف سوہدروی، حضرت مولانا عبدالمجید سوہدروی، حافظ محمد محدث گوندلوی، مولانا ابوالبرکات احمد، شیخ الحدیث حافظ عبداللہ بڈھیمالوی، مولانا شریف خان (مولانا مودودی آپ کے شاگرد تھے)، مولانا محمد صادق خلیل، مولانا پیر محمد یعقوب، شیخ الحدیث مولانا عبداللہ امجد، مولانا علی محمد، شیخ الحدیث مولانا محمد علی جانباز، شیخ الحدیث مولانا حافظ بنیامین، شیخ الحدیث مولانا محمد بھٹوی (مولانا عبدالسلام بھٹوی کے والد ہیں)، شیخ الحدیث مولانا فاروق احمد راشدی، مولانا عبدالمجید برادر علامہ یوسف کلکتوی، مولانا عبداللہ مظفر گڑھی، مولانا علم الدین سوہدروی، پروفیسر عبدالعزیز ایم۔اے۔

ارباب علم وفضل میں آپ کے آئیڈیل مختلف مشاہیر تھے۔ اردو ادب میں ابوالکلام آزاد، مولانا مودودی، شورش کاشمیری، تفسیر میں مولانا محمد اسماعیل سلفی، حدیث میں مولانا عطاء اللہ حنیف، تقریر میں مولانا عبدالمجید سوہدروی، تدریس میں حافظ محمد یوسف

سوہدروی اور حافظ محمد محدث گوندلوی رحمہم اللہ ہیں۔

آپ کے ہم عصر اور ہم جماعت دوستوں میں مولانا محمود احمد غضنفر، مولانا عبدالرحمٰن لدھیانوی، مولانا حافظ عبداللہ شیخوپوری، علامہ احسان الٰہی ظہیر، قاری محمد صدیق الریاض، شیخ الحدیث مولانا عبدالعزیز، مولانا حفیظ الرحمٰن لکھوی، مولانا محمد جہلمی مرحوم، مولانا محمد اکرم جمیل، مولانا ارشاد الحق اثری، مولانا محمود احمد میر پوری، مولانا محمد گرجاکھی، مولانا حبیب الرحمٰن یزدانی، مولانا عبدالسلام بھٹوی، مولانا عبدالرحمٰن واصل، مولانا عبدالرحمٰن راسخ، مولانا حکیم سلیم اللہ اعوان، مولانا محمد بشیر آبپارہ اسلام آباد تھے۔

آپ فاضل درس نظامی' فاضل عربی پنجاب یونیورسٹی' فاضل دورہ تدریبیہ سعودیہ' فاضل عربی بالراديو قاهره' فاضل الطب بلوچستان کالج کوئٹہ اور گریجوایٹ تھے۔

تحریر وتقریر میں طاق تھے۔ آپ 1969ء تا 1991ء صوبہ بلوچستان کے عروس البلاد کوئٹہ میں رہے۔ وہاں آپ تدریس وخطابت کے علاوہ ریڈیو پروگریمز میں قومی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ وہاں آپ کے ہزاروں شاگرد اور عقیدت مند ہیں۔ آپ نے وہاں درس قرآن کے ذریعے جگہ جگہ توحید وسنت کا نور پھیلایا۔

آپ رؤیت ہلال کمیٹی اور عربی نصاب کمیٹی صوبہ بلوچستان کے رکن، مرکزی جمعیت اہل حدیث صوبہ بلوچستان کے امیر اور مجلس تحفظ ختم نبوت صوبہ بلوچستان کے نائب امیر رہے۔ آپ میاں سیف اللہ پراچہ صوبائی وزیر اور ملک خدا بخش مری چیف جسٹس کے گھرانوں کے اتالیق بھی رہے۔ کوئٹہ شہر کی انجمن اسلامیہ کے تحت چلنے والے اداروں میں سب سے بڑا تعلیمی ادارہ اسلامیہ ہائی سکول تھا آپ اس کے شعبہ اردو، اسلامیات، شعبہ بزم ادب اور لائبریری کے انچارج تھے۔

سیرت وکردار کی پختگی، محنت ولگن، فرض شناسی، مستقل مزاجی، اخلاقی بلندی، مزاج کی نفاست، جدت طرازی، جودت خیال، علم کے رسوخ اور خدمت ملک وملت کے

بے تابانہ جذبے نے آپ کو ایک خاص مقام عطا کر دیا تھا۔ مذہبی' سیاسی علمی' ادبی اور حکومتی غرض ہر حلقہ میں آپ کو احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

آپ تصنیف و تالیف کا بھی اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ اور آپ نے کئی کتب تصنیف بھی کیں جن کا مختصر تعارف یہ ہے:

1 مسائل رمضان و عیدین: اس میں رمضان اور دونوں عیدوں کے مسائل مذکور ہیں۔ کوئٹہ میں طبع ہوئی۔

2 انوار حدیث: حدیث کی اہمیت اور شان بیان کی گئی ہے۔ حدیث پر اعتراضات کے جوابات دیئے ہیں۔ اور آخر میں تقلید کی تردید کی گئی ہے۔ ٹھوس حقائق پر مبنی کتاب ہے۔

3 مقام رسالت: کتاب ہذا میں دلائل کے ساتھ مقام رسالت آشکارا کیا ہے۔

4 نبی رحمت ﷺ: یہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح آپ کو کائنات کے لیے رحمت بنایا۔

5 سیرت خدیجۃ الکبری رضی اللہ عنہا: موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں میں سب سے بہتر کتاب ہے۔ خواتین کے لیے تحفہ ہے۔

6 سیرت حسین رضی اللہ عنہ مع سانحہ کربلا: حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی سیرت کے علاوہ واقعات کربلا بھی بیان ہوئے ہیں۔ کتاب کی بڑی خوبی یہ ہے کہ مستند واقعات پر مبنی ہے۔ اور صحابہ و اہل بیت رضی اللہ عنہم دونوں کی فضیلت کا خیال رکھا گیا ہے۔ اس وقت یہی کتاب آپ کے زیر مطالعہ ہے۔

7 مسئلہ تقلید: تقلید و جمود کی تردید پر قابل مطالعہ کتاب ہے۔

8 عفیفہ کائنات رضی اللہ عنہا: ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی سوانح عمری کا ایمان افروز تذکرہ۔ اور ان سے مروی چالیس احادیث کا ترجمہ اور تشریح۔

اس کے علاوہ آپ کے بہت سے مسودے بھی موجود ہیں جو آہستہ آہستہ منظر پر آتے رہیں گے۔ ان شاء اللہ۔

علاوہ ازیں دعوت وتبلیغ کے لیے آپ نے 1991ء میں ضیائے حدیث کے نام سے ایک رسالے کا اجراء کیا۔ اس رسالے کو ایک منفرد مقام حاصل ہے اور اب یہ دارالسلام کے تحت شایانِ شان طریقے سے جاری وساری ہے۔

مولانا محمد ادریس فاروقی رحمہ اللہ نے مسلم پبلی کیشنز کے نام سے اشاعتی ادارے کا قیام بھی کیا اور متعدد کتب شائع بھی کیں۔

الغرض ہر لحاظ سے آپ نے دعوت وتبلیغ کا کام کیا اور بالآخر 5 جون 2010 کو دفتر ضیائے حدیث واقع دارالسلام میں اپنی کتاب ''مقامِ رسالت'' پر کام کرتے ہوئے اس جہان فانی سے رخصت ہوئے۔

اللہ تعالیٰ آپ کی اولاد اور آپ کے شاگردوں کو آپ کے لیے بہترین صدقہ جاریہ بنائے۔ اور آپ کی تحریر وتقریر کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی توفیق دے۔ آمین۔

عرض ناشر

ذرا پاکستان سمیت پورے عالم اسلام کی حالت کا جائزہ لیجیے؟ یہ حالت اتنی واضح اور نمایاں ہے کہ اسے ایک اندھا بھی آسانی سے دیکھ سکتا ہے۔ سب سے پہلے حکمرانوں کو دیکھیے کہ وہ کیا کر رہے ہیں؟ الا ماشاء اللہ یہ سب کے سب صرف طاغوتی طاقتوں کی کاسہ لیسی اور اپنے اقتدار کے قلعے مضبوط کر رہے ہیں۔ علمائے کرام کو دیکھیے تو ان کی بہت بڑی اکثریت فرقہ واریت میں الجھی ہوئی ہے۔ شریفانہ زندگی بسر کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے کیا احکام دیے؟ اور ہمارے رہبرِ اعظم حضرت محمد ﷺ نے ان احکام پر عمل کر کے صراطِ مستقیم کو کتنا روشن اور آسان بنا دیا؟ یہ باتیں بس خال خال علمائے کرام ہی بتاتے ہیں۔ سیاسی پارٹیوں پر نظر ڈالیے۔ ان کے لیڈروں اور ورکروں کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ یہ سب کیچڑ بردار ہیں۔ اور انھیں ایک دوسرے پر کیچڑ اُچھالنے کے سوا اور کوئی کام نہیں۔ سول سوسائٹی کو دیکھیے تو ہمارے ڈاکٹروں، انجینئروں، مسندِ عدل کے شہ نشینوں وکیلوں، ماہرینِ تعلیم، صنعتکاروں، تاجروں سرمایہ داروں اور سرکاری افسروں کی بھاری اکثریت نے صرف دولت کو اپنا معبود بنا رکھا ہے۔ رہے عوام تو ان بے چاروں کو اپنی روٹی روزی کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ یہ اپنے دال دلیے اور ساگ ستو کے علاوہ کسی اور چیز کا تصور ہی نہیں کر پاتے۔ مطلب یہ کہ ہمارے معاشرے کے ہر طبقے اور ہر فرد کو اپنی اپنی پڑی ہوئی ہے۔ سب اپنی غرض کے پتلے،

اپنے مقاصد کے غلام اور اپنے مفادات کے دلال ہیں۔ دین حنیف سے کسی کو سرے سے کوئی لگاؤ ہی نہیں۔ بلاشبہ یہ نہایت قلق انگیز سانحات ہیں ...... لیکن ان سے کہیں زیادہ قیامت خیز المیہ ایک اور ہے وہ یہ کہ دنیا بھر کے کروڑوں مسلمان نوجوان مغربی تہذیب پر شدید دیوانگی کے ساتھ فدا ہوکر فکری ارتداد اور عملی فسق وفجور کا شکار ہوتے جارہے ہیں۔ اور اسلام اس دنیائے ہست وبود میں انتہائی مظلومیت کی حالت میں گھرا ہوا ہے۔ اب تک کی معلومہ تاریخ میں کفر اور شرک کی قوتیں اتنی ہیبت ناک اور ہلاکت بار طاقت کے ساتھ کبھی نمایاں نہیں ہوئیں جس طرح آج عیاں ہوگئی ہیں۔ آج ہر مسلمان خاص طور پر علمائے کرام کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ عالم اسلام کی نئی نسل کی دولت ایمان کو بچائیں اور کفر وشرک کے جہنم میں گرنے سے روکیں۔ اس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ہمارے علمائے کرام فرقہ واریت سے توبہ کریں۔ صرف قرآن اور سنت کی تعلیمات عام کریں اور ان تعلیمات کو عام مسلمانوں کے ذہن میں اس قدر راسخ کردیں کہ ان کا ایمان ناقابلِ تسخیر بن جائے۔ حق یہ ہے کہ مغربی دنیا کی ساری ایجادات اور ٹیکنالوجی کے سارے کمالات دین حنیف کی طاقت اور صداقت کے آگے ہیچ اور ناقابل توجہ ہیں۔ اسلام رب ذوالجلال کا محبوب دین ہے۔ صرف اسی سچے دین کے طریقے اصل عزت اور کامیابی پانے کا واحد ذریعہ ہیں۔ اس دین کے علاوہ باقی جتنے بھی نظریات اور اسالیب زندگی ہیں وہ سب کے سب دھوکے، فریب ذلت اور ہلاکت کی پوٹ ہیں۔ خاص طور پر مغربی تہذیب کی بنیاد ہی وحی کی نفی پر ہے ، اسے سود خور دولت مندوں نے پروان چڑھایا ہے اور اس کی عریانیوں نے انسانیت کا جنازہ نکال دیا ہے۔ اس کے برعکس اسلام سارے عالم انسانیت کے لیے سایۂ رحمت ہے۔ اس رفیع و وقیع دین کے لیے محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنا مقدس خون بہایا۔ اسی دین کے لیے صحابہ کرام نے بدر، احد اور حنین میں اپنی جان کا نذرانہ دیا۔ اسی دین کی

آبیاری کے لیے سیدنا عمر، سیدنا عثمان، سیدنا علی، سیدنا حسین رضی اللہ عنہم اور ان کے عزیزوں اور فدائیوں نے جام شہادت نوش کیا۔

آج اسلام ان علمائے حق کی راہ دیکھ رہا ہے جو خاص طور پر امتِ مسلمہ کے نوجوانوں کو استناد کے ساتھ نوجوانانِ جنت کے سردار سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی سیرت کے جوہر دکھائیں اور ان کی متاعِ ایمان کو مغربی تہذیب کی غارتگری سے محفوظ رکھیں۔

الحمد للہ! میرے والد گرامی مولانا محمد ادریس فاروقی رحمہ اللہ انھی علمائے حق میں سے ایک تھے جو آج کی بھٹکی ہوئی نسلوں کو اسلام کا رُوئے زیبا دکھاتے اور اس کی سچی اور ابدی تعلیمات پر کامل یقین کے ساتھ عمل کی دعوت دیتے تھے۔ وہ زندگی کے آخری سانس تک قرآن وسنت کے علوم کی تبلیغ و دعوت کا کام کرتے رہے، وہ طبیب بھی تھے، ادیب بھی تھے، خطیب بھی تھے۔ دھیمے لہجے میں بولتے تھے۔ بڑے، میٹھے، ملائم اور نپے تلے الفاظ (well cal culated) میں اسلامی سیرت سازی کے مضامین لکھتے تھے۔ انھوں نے ''مقامِ رسالت'' پر کام کرتے ہوئے دم توڑا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعہ! آج بھی یقین نہیں آتا کہ ان کی محبت و مرحمت کا چھڑکاؤ کرنے والی مہربان آنکھوں میں موت کی نیند بھر گئی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ ابھی کروٹ لیں گے اور پوچھیں گے: میری کتاب ''سیرتِ حسین رضی اللہ عنہ'' طباعت کی کس منزل میں ہے؟

''سیرتِ حسین رضی اللہ عنہ مع سانحہ کربلا'' مرحوم کی خصوصی کاوش ہے۔ یہ کتاب لکھ کر جہاں انھوں نے تاریخ کی شاندار خدمت کی وہیں مسلمان نوجوانوں کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی پاکیزہ سیرت کے جواہر پارے دکھا کر یہ سبق دیا کہ فرزندانِ اسلام دینِ حنیف کی دعوت و تبلیغ کے لیے جیتے ہیں اور اسلامی نظام کی حفاظت ہی کے لیے اپنی جان قربان کر دیتے ہیں۔

جب سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی زندگی میں وہ موڑ آیا کہ ان کے برادر معظم حضرت

حسن رضی اللہ عنہ وفات پا گئے تو بعض کوفی آئے۔ انھوں نے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ سے کہا کہ جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے مابین صلح صفائی کا جو معاہدہ ہوا تھا وہ صرف حضرت حسن رضی اللہ عنہ تک محدود تھا۔ آپ کا اس معاہدے سے کوئی تعلق نہیں۔ اب آپ جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیجیے۔

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے یہ مشورہ دینے والوں کو حقارت سے دھتکار دیا اور پوری صدق دلی سے جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی اطاعت کرتے رہے۔ لیکن جب خلافت کے لیے یزید کی نامزدگی عمل میں آئی تو وہ اس سے متفق نہ ہو سکے۔ انھوں نے یزید کے برسر اقتدار آ جانے کے بعد محسوس کیا کہ اب اسلام کے سیاسی نظام کی گاڑی خلفائے راشدین کی خلافت اور نظامِ شورائیت کی ڈگر سے ہٹ کر ملوکیت کی پٹری پر چڑھ گئی ہے۔ انھوں نے اسلام کے سیاسی نظام کا یہ بگاڑ گوارا نہیں کیا اور یزید کی بیعت سے انکار کر دیا۔ یہی حرف انکار 61 ھ میں سانحہ کربلا کا موجب بن گیا۔

61 ھ سے اب تک سانحہ کربلا پر اللہ جانے کتنے آنسوؤں کی ندیاں بہہ چکی ہیں اور کتنی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ ان کتابوں کے ذخیرے میں زیر نظر کتاب ایک گرانمایہ اضافہ ہے۔ اس کی امتیازی خوبی یہ ہے کہ میرے والد گرامی رحمہ اللہ نے ایک سچے مؤرخ کی حیثیت سے قلم اٹھایا ہے۔ وہ کسی کی مدح وذم کے چکر میں نہیں پڑے نہ جذبات کے بھنور میں آئے نہ خوش اعتقادی کے اسیر ہوئے، بس انھوں نے خاموشی اور خلوص کے ساتھ اسلاف کرام کی تحریروں کے تاریخی سرمائے کا باریک بینی سے مطالعہ کیا۔ اس مطالعے کے آئینے میں انھیں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی سیرت وشخصیت کا جو دل ربا چہرہ نظر آیا، اس کی انھوں نے اپنے بے لاگ قلم سے تصویر کھینچ دی۔ سیرت حسینی کی طرح انھوں نے سانحہ کربلا کی داستان بھی اسلاف کرام کے مستند لٹریچر کی روشنی میں لکھی انھوں نے ہر مکتبۂ فکر کی کتابیں پڑھیں، اسلاف کی کتابیں بھی پڑھیں، اخلاف کی

کتابیں بھی پڑھیں، مستند بھی پڑھیں، غیر مستند بھی پڑھیں، حتی کہ اس موضوع پر غیر مسلم سکالروں کی تصنیفات بھی دیکھیں۔ انھوں نے کسی کتاب کو معمولی نہیں سمجھا۔ سب کو توجہ سے دیکھا مگر ہر چمکتی ہوئی چیز کو سونا اور ہر آگ کو شعلہ طور نہیں سمجھا۔ انھوں نے اپنے حاصل مطالعہ کو استناد کی کسوٹی پر جانچا، تولا اور پرکھا۔ بعد ازاں کربلا میں پیش آمدہ تمام حالات و حوادث بے کم و کاست بیان کر دیے۔

میں اپنے والدِ بزرگوار کے قلم سے نکلی ہوئی ایک ایک سطر کا قدر شناس ہوں۔ میرا یہ عمل پدر و پسر کے رشتے یا خوش عقیدگی کی بنا پر نہیں، ٹھوس حقائق کی اساس پر استوار ہے۔ اس کتاب پر آپ سرسری نظر بھی ڈالیں گے تو حیرت زدہ رہ جائیں گے۔ اس کتاب کے ہر صفحے پر آپ کو ایک حیرت کدہ آباد اور ایک جہانِ معنی کھلا ہوا نظر آئے گا۔ تاریخ کے جبر اور حالات و حوادث کی رفتار نے صورتحال ایسی بنا دی ہے کہ جونھی سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا اسم گرامی سامنے آتا ہے، یزید کا تصور بھی آپ ہی آپ خواہ مخواہ اُبھرنے لگتا ہے۔ قدیم و جدید مورخین نے اپنے اپنے داخلی میلانات و رجحانات کی بنیاد پر یزید کی مختلف تصویریں بنائی ہیں۔ فاروقی صاحب نے بھی تاریخ کے اس مشہور ترین شخص پر قلم اٹھایا ہے، اس موقع پر فاروقی صاحب رحمہ اللہ کی علمی دیانت طرح طرح سے نمایاں ہوتی ہے اور ان کی بڑائی کی گواہی دیتی ہے۔ انھوں نے جھوٹی روایات و خرافات کو جھٹک کر ایک بے لچک مؤرخ کی حیثیت سے یزید کا جائزہ لیا ہے اور بڑی جرأت اور صداقت سے اپنا موقف بیان کر دیا ہے۔ انھوں نے شروع ہی میں لکھ دیا ہے کہ میں یزید کی وکالت سے معذور ہوں، میں نے اوراقِ تاریخ کا ایک ایک صفحہ ٹٹولا اور کھنگالا، مجھے کہیں کوئی ثبوت ایسا نہیں ملا جس سے یہ واضح ہو کہ یزید براہِ راست قتلِ حسین رضی اللہ عنہ میں ملوث تھا یا نہیں۔ اس معاملے کی اصل حقیقت ہمارا دانائے قلوب پروردگار ہی جانتا ہے۔ ہم اُسے براہِ راست ملزم نہیں ٹھہرا سکتے، تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یزید نے

قاتلانِ حسین رضی اللہ عنہ کو کوئی سزا دی نہ ان کے عہدوں سے معزول کیا۔ اس کے بعد فاروقی صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ شہادتِ حسین رضی اللہ عنہ کے بعد یزید کو کبھی چین نصیب نہیں ہوا۔ وہ زیادہ دیر حکومت نہ کر سکا اور 683ء میں اس دنیا سے چل بسا۔

فاروقی صاحب اصل قاتلانِ حسین رضی اللہ عنہ کو بے نقاب کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''66ھ میں عبدالملک بن مروان کے عہدِ اقتدار میں مختار ثقفی کوفہ کا گورنر مقرر ہوا تو اس نے قاتلانِ حسین کو چن چن کر ہلاک کرایا۔ اس سانحے کا سب سے بڑا مجرم شمر ذی الجوشن یہ حالات دیکھ کر کوفہ سے نکل بھاگا۔ مختار کی سپاہ نے اس کا تعاقب کیا۔ وہ پکڑا گیا۔ ثقفی نے اسے ہلاک کر دیا، پھر اس کی منحوس لاش کتوں کے آگے پھینک دی جنھوں نے اس کی ایک ایک بوٹی چبا ڈالی۔

مرحوم کا اسلوبِ تحریر بڑا سادہ اور سلیس ہے۔ وہ قاری کو اپنے ساتھ بہائے لیے جاتے ہیں۔ من گھڑت باتوں کو جھٹلاتے ہیں۔ سچائیوں کے موتی نکالتے ہیں۔ حقائق کے پھول کھلاتے ہیں اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہ ان کے محترم عزیزوں اور فدائیوں پر جدال و قتال کا جو ریلا گزرا اُسے ایسے حقیقت پسندانہ پیرائے میں بیان کرتے ہیں کہ پڑھ کر آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ فاروقی صاحب اتنے مہذب اور متین ہیں کہ انھوں نے شیعہ علماء کی تحریروں کے حوالے بھی شریفانہ اسلوب میں دیے ہیں۔ اور ان کی باتوں کی تردید بھی شائستہ پیرائے میں کی ہے۔ یہ تردید کرتے ہوئے بھی ان کے دل سے یہ صدا اٹھی ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے بغض نہ رکھو۔ دوزخ کے انگاروں سے بچو اور اہلِ بیت رضی اللہ عنہم سمیت تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا احترام کرو۔

اب میں اس عظیم کتاب کی چہرہ کشائی کرتا ہوں اور چند جھلکیاں دکھاتا ہوں۔ والد گرامی نے شروع ہی میں بتا دیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لاڈلوں حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کی تربیت کس طرح ہوئی۔ ملاحظہ فرمائیے:

والدہ ماجدہ کا اسلوب تربیت

''ابھی حسن اور حسین رضی اللہ عنہما چھوٹے سے تھے۔ کسی بات پر لڑ پڑے۔ اسی طرح باہم لڑتے جھگڑتے اپنی جلیل القدر ماں سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس پہنچے اور ایک دوسرے کی شکایت کرنے لگے۔ ایک صاحبزادے نے انگشت نمائی کی اور کہا: مادر مہربان! جھگڑا انھوں نے شروع کیا تھا۔ دوسرے صاحبزادے نے کہا: مادر عالی قدر! انھوں نے مجھے مارا ہے۔ سیدہ نے دونوں لاڈلوں کے بیانات وقار کے ساتھ سنے۔ پھر قدرے برہمی سے فرمایا: تم دونوں آپس میں لڑے ہو۔ مجھے معلوم نہیں، کس نے مارا ہے اور کون پٹا ہے؟ میں تو بس اتنا ہی جان پائی ہوں کہ تم دونوں آپس میں لڑے ہو۔ اس لیے تم دونوں خطا وار ہو۔ میرے دل کے ٹکڑو! اللہ تعالیٰ کا حکم سنو۔ ہمارے وحدہ لاشریک پروردگار نے فرمایا ہے: ﴿لَا تُفْسِدُوْا فِي الْأَرْضِ﴾ زمین میں دنگا فساد نہ کرو۔...... افسوس! تم آپس میں لڑتے ہو۔ جاؤ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو اور اپنی خطا بخشواؤ۔ ...... پھر ان دونوں شہزادوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کی اور عہد کیا کہ ہم آئندہ کبھی نہیں جھگڑیں گے۔''

بے مثل نانا صلی اللہ علیہ وسلم کا اسلوب نصیحت

اللہ کے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ بغل میں حسن رضی اللہ عنہ بھی بیٹھے تھے۔ اسی دوران کسی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں صدقے کی کھجوریں پیش کیں۔ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے جھٹ ہاتھ بڑھایا اور ایک کھجور منہ میں ڈال لی۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً ان کے منہ میں اُنگلی ڈال کر فرمایا ''کخ کخ!'' اسے اُگل دو۔ اسے اُگل دو ''کیا تمھیں معلوم نہیں کہ خاندانِ نبوت کے لیے صدقے کی چیز کھانا جائز نہیں؟'' ننھے حسن رضی اللہ عنہ نے وہ کھجور فوراً اُگل دی۔ پھر کبھی کوئی چیز از خود نہیں کھائی۔ بس جو کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم، علی رضی اللہ عنہ یا ان کی والدہ ماجدہ رضی اللہ عنہا مرحمت فرماتی تھیں وہی تناول فرماتے تھے۔

مردِ مجاہد بننے کی تڑپ

عرب بچے ایک خاص قسم کی کبڈی کھیلتے تھے۔ اس کھیل کو ''عاقب'' کہا جاتا تھا۔ حسین رضی اللہ عنہ کبڈی کے شائق تھے۔ بھاگ دوڑ کے مقابلوں میں خوب حصہ لیتے تھے۔ وہ ایک دفعہ دو بچوں کے ساتھ دوڑ لگا رہے تھے کہ ان کے والد گرامی سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے انھیں آواز دی اور اس مقابلے سے روک دیا۔ حسین رضی اللہ عنہ فوراً رُک گئے۔ تاہم کسی قدر رنجیدگی سے عرض کیا: پیارے ابا جان! آپ مجھے بھاگ دوڑ کے مقابلے سے کیوں روکتے ہیں؟ کیا میں مجاہد نہ بنوں؟'' سیدنا علی رضی اللہ عنہ ہونہار بیٹے کی یہ بات سن کر بہت خوش ہوئے اور بھاگ دوڑ کی اجازت دے دی۔

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات! یہی حسین رضی اللہ عنہ جوان ہو کر اسلام کے بازوئے شمشیرزن بن گئے۔ وہ کربلا کے میدان میں صرف اس لیے ڈٹ گئے کہ ان کے لیے اسلام کے اس سیاسی نظام میں ذرہ بھر بگاڑ بھی ناقابل برداشت تھا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمایا تھا جسے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے اپنے خون سے مستحکم کیا تھا اور جس کی بدولت تاریخ میں پہلی اسلامی شورائی اور فلاحی ریاست مدینہ وجود میں آئی اور حسنات و برکات کے عالمگیر برگ و بار لائی۔ کیسے برگ و بار؟ ایسے برگ و بار کہ مدینہ سے لے کر افغانستان تک پھیلی ہوئی اس اسلامی Super Power کا سربراہ عمر رضی اللہ عنہ خود اپنی پیٹھ پر غلے کی بوری لادتا تھا اور بھوک سے بلکتے ہوئے بچوں کے جھونپڑے تک پہنچا کر واپس آتا تھا۔ اس اسلامی شورائی ریاست نے فلاحی ثمرات کو اونچے سے اونچے ایوان سے لے کر گلی محلوں کے نچلے سے نچلے طبقے کے عام آدمی تک پہنچا دیا تھا۔ اس ریاست نے ہر مسلمان کے قالب میں ایمان واحتساب کی ایسی روح پھونک دی تھی جس کی مثال بڑے سے بڑے نام نہاد جمہوری ملک میں بھی سامنے نہیں آئی۔

یزید کے عہدِ حکومت میں اس اسلامی وشورائی ریاست کی حالت وہ نہ رہی جو خلفائے راشدین کے زمانے میں تھی۔ یزید کے زمانۂ اقتدار میں اِس ریاست کے سیاسی نظام کوملوکیت میں بدل دیا گیا اور خلافت وشورائیت کے گوہر نکال دیے گئے۔ حسین رضی اللہ عنہ اسلامی نظام سیاست کی یہ ہتک برداشت نہ کر سکے اور تن تنہا اپنے عہد کے حکمرانوں سے ٹکرا کر امر ہو گئے۔ حسین رضی اللہ عنہ کے سامنے تو اسلام کے صرف ایک پہلو یعنی سیاسی نظام میں سے خلافت اور شورائیت نکالی جا رہی تھی۔ یہ حالت دیکھ کر حسین رضی اللہ عنہ نے زندہ رہنا گوارا نہ کیا۔ آج آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ آپ کی کھلی ہوئی آنکھوں کے سامنے آپ کے وطن کے ہر ادارے سے پورے اسلام کو نکالا جا رہا ہے مگر آپ کی غیرت نہیں جاگتی۔ آپ بے حس لاش کی طرح پاؤں پسارے پڑے ہیں، آپ کے سامنے بموں سے بھون کر لال مسجد سے قرآن پڑھنے والی معصوم بچیوں کے جنازے نکال دیے گئے۔ آپ کے سامنے ایک بد باطن حکمران نے ڈالروں کے بدلے قوم کی بیٹی عافیہ کو پاکستان سے نکال دیا۔ آپ کے سامنے بنکوں کی شکل میں اللہ اور اس کے رسول کے خلاف مورچے بنے ہوئے ہیں۔ وہاں سود خوری کی دیواریں اونچی کی جا رہی ہیں اور تجارت کی برکتوں کو نکالا جا رہا ہے۔ ذرا کسی عدالت کچہری کا پھیرا لگائیے۔ وہاں قدم قدم پر رشوت کھانے والے بھوکے بھیڑیے جبڑا کھولے بیٹھے ہیں۔ یہ لوگ ظلم کی کاشت کر کے عدالتوں سے عدل و انصاف کو بے دخل کر رہے ہیں۔ آپ کے سامنے آپ کے بچوں کے درسی نصاب سے قرآن کریم کی آیات نکالی جا رہی ہیں مگر آپ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ آخر کیوں؟ صرف اس لیے کہ بطور فرد اور معاشرہ ہم سب مغربی تہذیب کے قیدی ہیں۔ یہی تہذیب عہد جدید کی کربلا اور ہمارے حکمران دور حاضر کے شمر ہیں۔ ان سے پوری قوت سے ٹکرا جائیے۔ ان سے ٹکراؤ کے لیے گولی اور توپ وتفنگ کی ہرگز ضرورت نہیں۔ آپ کے پاس قرآن و

سنت کی شکل میں بہت بڑا ہتھیار موجود ہے۔ اَن دیکھی قوتوں کے قفل آپ کے ایمان کی مضبوطی اور صالح اعمال کی کنجی ہی سے کھل سکتے ہیں۔ دل کی گہرائیوں سے اس یقین میں روز بروز اضافہ کیجیے کہ دین حنیف آسمان سے اترا ہے۔ یہ اٹل سچائیوں کا مجموعہ ہے۔ ہم کوشش کریں کہ سب کے دل سے شرک اور بدعت کی گندگی نکالیں۔ سیرت حسین رضی اللہ عنہ کا ہم سب سے یہی تقاضا ہے۔ جو یہ تقاضا پورا کرے گا وہی آج کے دور کا حسین، زمانے کا فاتح اور تاریخ کا آقا کہلائے گا۔

جب میرے والد گرامی رحمہ اللہ نے یہ کتاب لکھی تھی تو ان کے دل میں یہی مقصد کام کر رہا تھا کہ دجلہ وفرات کے گیسو آج بھی تابدار ہیں۔ نوجوان اسے توجہ سے پڑھیں اور اپنے عمل کو سیرت حسین رضی اللہ عنہ کی طرح درخشندہ کر کے تاریخ کا دھارا بدل ڈالیں۔ آیئے! راہِ عمل پر آگے بڑھیے۔ مستقبل آپ کی راہ دیکھ رہا ہے ؎

کچھ نہ زمان و مکاں، کچھ نہ سفید و سیاہ
اشہد ان لا الٰہ، اشہد ان لا الٰہ!

آخر میں میں اپنے برادر اصغر حافظ نعمان فاروقی کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے انتہائی لگن سے اس کتاب کی تیاری میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اور مولانا عمران فردوسی نے بھی اس میں حصہ لیا۔ علاوہ ازیں برادرم نجم المجید کا بھی جنھوں نے ڈیزائننگ کی اور محترم محمد رمضان شاد صاحب جنھوں نے کمپوزنگ کے مراحل سے گزارا۔ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو مسلمانوں کے لیے نفع بخش بنائے، آمین۔

قمر الحمید فیصل (الریاض)

نومبر 2012ء/ذوالحجہ 1433ھ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حرفِ اوّل

بزرگانِ دین وملت کے حالات زندگی اس لیے لکھے اور پڑھے جاتے ہیں تاکہ مسلمان ان کی پاکیزہ سیرتوں سے سبق اور نصیحت حاصل کریں، ان کی تعلیمات اپنائیں اور ان کے نقش قدم پر چلیں، ان کے سنہرے کردار کو اختیار کریں، ان کے اقوال و افعال کو راہنما بنائیں۔ اور یوں دین و دنیا میں سرفراز اور فائز المرام ہو کر رضائے الٰہی حاصل کریں اور اللہ تعالیٰ کے دربارِ عالی سے وہ اجر جزیل پائیں جو آخرت میں نیکو کاروں اور پرہیزگاروں کو نصیب ہوگا۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے بہت سے قصے بیان فرمائے ہیں اور حدیث شریف میں رسول اللہ ﷺ نے متعدد واقعات ارشاد فرمائے ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ قارئین اچھے لوگوں اور نیک قوموں کے حالات سے درس و موعظت حاصل کریں۔ اور جن اعمال صالحہ سے انھوں نے اللہ جل شانہٗ کو راضی کر کے اس سے انعام و اکرام پائے ہیں ان کو حرزِ جاں بنائیں۔ اسی طرح برے لوگوں کے احوال سے عبرت پکڑیں اور ان کی بدکرداریوں، ان کے خطرناک عواقب، ان کے مہلک نتائج اور خوفناک انجام سے بچیں۔ اور ہر حال میں خدائے منتقم کے قہر وغضب سے ڈرتے رہیں۔

مثلاً: ابو البشر آدم علیہ السلام کے قصے میں یہ نصیحت ہے کہ وہ شیطان مردود کے جھانسے

میں آئے مگر صدق دل سے توبہ و استغفار کرنے کا صلہ بھی مل گیا کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں نبوت عطا فرمائی اور زمین کا خلیفہ بنا دیا۔ شیطان لعین کے قصے میں یہ عبرت ہے کہ اس کو انکار و استکبار، سرکشی و نافرمانی کی ایسی عبرتناک سزا دی گئی کہ وہ بارگاہِ الٰہی سے دھتکارا گیا اور اس کو لعنت کا طوق پہنایا گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں تبلیغ حق کے اسباق ہیں۔ اور فرعون کے قصے میں عبرت ہے کہ یہ خدائی کا دعویٰ کرنے والا، رب اکرم سے بغاوت کر کے کس طرح اپنے لاؤ لشکر سمیت سمندر میں غرق ہو گیا۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے قصے میں ہستی باری تعالیٰ، توحید الٰہی، رد شرک و ضلالت، صبر و استقامت، اور ایثار و قربانی وغیرہ کے دروس مضمر ہیں۔ اور نمرود مردود کے قصے میں اس کی شکست، اس کے مشن کی ناکامی و نامرادی اور اس کی عبرت انگیز موت کا بیان ہے۔ یوسف علیہ السلام کا قصہ عصمت و پاک دامنی کا مظہر ہے۔ اور برادران یوسف علیہ السلام کے قصے میں مکر و فریب، ظلم و تشدد، کذب و زُور سے بچنے کی نصیحت اور متوکّلین کی عظمت کا بیان ہے۔

اسی طرح حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی داستان میں بہت سے نصائح ہیں اور آپ رضی اللہ عنہ کا ایک ایک عمل، ایک ایک کردار لائق اطاعت و اتباع ہے، صرف اس لیے نہیں کہ آپ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ و سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے فرزند گرامی تھے، بلکہ اس لیے کہ آپ کی پاکیزہ زندگی اعمال صالحہ سے معمور تھی۔ آپ کا کوئی فعل قرآن کریم اور سنت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف نہیں تھا۔

سیدنا حسین بن علی رضی اللہ عنہما نے اگر عزت و عظمت پائی ہے تو اس وجہ سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انھوں نے تربیت پائی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے انھوں نے تعلیم حاصل کی۔ اپنی مقدس زندگی کو قرآن و سنت کے سانچے میں ڈھالا، اپنی عادات و خصائل، اپنے اعمال و افعال کو اپنے محترم نانا جان صلی اللہ علیہ وسلم کے عادات و اعمال کے مطابق بنا لیا، ہر بات اور ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اختیار کی اور یوں

دربارِ رسالت سے "سیّد شباب اہل الجنۃ" کا خطاب پایا۔

سبحان اللہ! نانا سیّد المرسلین، والدہ سیدۃ نساء العالمین اور خود سیّد شباب اہل الجنۃ۔

ملی اس کو عزت یہ حق کی رضا سے

وفائے جناب شہ دوسرا (ﷺ) سے

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس وقت حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی جس قدر سیرت کی کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں سوانح نگاروں نے اپنی ساری قوتِ بیاں اور پورا زورِ قلم واقعہ شہادت پر صرف کر دیا ہے۔ اور ایسی مبالغہ آمیزیوں، باطل طرازیوں اور دروغ گوئیوں سے کام لیا ہے اور حق و باطل کا کچھ اس طرح امتزاج کیا ہے کہ اصل واقعات تو بہت کم منظرِ عام پر آئے ہیں مگر من گھڑت افسانوں کا ایک پلندہ تیار کر دیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ ﴾

"سچ کو جھوٹ سے خلط ملط نہ کرو۔"[1]

مطلب یہ کہ سچ میں جھوٹ کی آمیزش نہ کرو، مگر یہاں یہ حال ہے کہ سچی جھوٹی باتیں ترتیب دے کر ایک کتاب یا تقریر مرتب کر لی جاتی ہے جس کے پڑھنے سننے سے کوئی بھی فائدہ نہیں ہوتا، بلکہ الٹا نقصان ہی ہوتا ہے۔

سوانح حسین رضی اللہ عنہ سے متعلقہ کتب میں عام طور پر واقعۂ شہادت پر زور دے کر ماتم وغم اور نوحہ ومرثیہ میں مبتلا رہنے کی تلقین کی گئی ہے، تابوت وتعزیہ بنانے، ضریح وشبیہہ دیکھنے دکھانے، علَم وفرس نکالنے، سینہ کوبی کرنے، منہ نوچنے اور خون بہانے پر خوب ابھارا گیا ہے، مگر سیّدنا حسین رضی اللہ عنہ کو جن اعمالِ حسنہ کے سبب درجات بلند عطا ہوئے اور جن خصائل وفضائل کی وجہ سے رفیع وعظیم مراتب تفویض کیے گئے ان پر کوئی توجہ

---

[1] البقرہ 2: 42.

نہیں دی گئی، بلکہ ایسی کتابوں میں اس قسم کے مضمون بھر دیئے گئے ہیں جن کو پڑھنا، سننا اور جن پر عمل کرنا بہت بڑا گناہ ہی نہیں، موجب عذاب الیم بھی ہے۔ اور جس سے ایک مسلمان اسلام ہی سے دور ہو جاتا ہے۔ ایسی غیر معیاری اور بے مقصد کتابیں مارکیٹ میں عام ملتی ہیں۔

اپنی اس کتاب ''سیرت حسین رضی اللہ عنہ مع سانحہ کربلا'' میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے بیٹے یزید کا ذکر لانا ناگزیر تھا۔ عام بازار میں فروخت ہونے والی کتابوں کی چلتتر روش سے ہٹ کر ہم نے ان کا قدرے مفصل ذکر کیا ہے۔ اور اس ضمن میں طرفین کے کچھ افراد کا ذکر بھی آیا ہے۔ تاریخی حیثیت سے جن اشخاص کا تذکرہ ضروری تھا ان کا تذکرہ اور اس کے ساتھ ان پر مناسب تبصرہ بھی کیا گیا ہے۔ اور اس سلسلے میں باوجود حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ والہانہ عقیدت ومحبت رکھنے کے فریق ثانی پر یونہی الزامات عائد نہیں کیے گئے جیسا کہ عام لوگوں کا مشغلہ ہے۔ ہاں، جو الزام لگتا ہے وہ لگایا ہے۔ اس سلسلے میں خواہ مخواہ کسی کی پیروی کی ہے نہ مخالفت۔

اس کتاب میں بحمد اللہ دلائل، براہین اور استشہادات سے کام لیا گیا ہے۔ اور وہ راہ اختیار کی گئی ہے کہ جس سے مسلک اہل سنت پر حرف آئے نہ صحابہ واہل بیت رضی اللہ عنہم کی حیثیت مجروح ہو۔ آپ دیکھیں گے کہ بڑے بڑے نازک اور حساس مباحث سے گزرتے ہوئے کہیں بھی حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور آپ کے اعزہ کی عظمت کا پرچم سرنگوں نہیں ہونے دیا۔ فَلِلّٰہِ الْحَمْدُ.

اور اس پر ہمیں فخر ہے۔ عالی مقام حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا اپنا ایک منفرد اور ممتاز مقام ہے جس کا تقریباً ثلث کتاب میں کھل کر ذکر کیا گیا ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہمارا اپنا مؤقف اور نقطۂ نظر یہی ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ حد درجہ فضیلت وبزرگی کے حامل ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب ترین نواسے اور کربلا کے مظلوم ترین شہید ہیں۔ آپ

کا غایت درجہ احترام بجا لانا چاہیے۔ آپ رضی اللہ عنہ گروہِ اہل بیت رضی اللہ عنہم کے اہم رکن تھے۔ جملہ اہل بیت رضی اللہ عنہم ہماری نگاہ میں اسی طرح عزت کے قابل ہیں جس طرح جمیع اصحاب رسول (رضی اللہ عنہم) احترام کے قابل ہیں بلکہ قرابت نبوی کی بنا پر ان سے فائق۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحابیت اور قرابت دونوں نسبتیں حاصل ہیں۔اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ صحابہ واہل بیت رضی اللہ عنہم کے کسی بھی فرد سے عناد رکھنا مسلکِ اہل سنت کے خلاف ہے۔ کتاب ہٰذا میں مناقب حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ ساتھ معتدل مؤقف کو بادلائل مبرہن اور واضح کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ لیکن افسوس! جب اس موضوع پر بازار میں بکنے والی عام کتب کا جائزہ لیا گیا تو اکثر کتب ضد اور تعصب سے اٹے ہوئے نظریات اور بیکار باتوں سے لتھڑی نظر آئیں جن میں مکھی پر مکھی ماری گئی اور تحقیق کا دعویٰ کر کے تحقیق سے کام نہیں لیا گیا بلکہ اس کے برعکس تحقیق کا منہ چڑایا گیا۔ ان میں محض رونے رلانے کا اہتمام کیا گیا ہے یا اہل بیت کے فضائل ومناقب اور یزید کے عیوب ونقائص بیان کرنے پر زور دیا گیا اور سیدھی سادھی قوم کے جذبات سے کھیلنے اور امر واقعہ کو غلط رخ دینے کی ناروا کوشش کی گئی۔ جس سے ان کتب کے معیار کا بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ان حالات میں ضرورت تھی کہ عالی مقام حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے حالات اور سانحہ کربلا پر مشتمل ایک ایسی جامع، معتدل اور مدلل کتاب تالیف کی جائے جس میں امکانی حد تک صحیح تاریخی واقعات درج ہوں اور جس میں مایۂ ناز شہید رضی اللہ عنہ کی ان بلند کرداریوں، نیکوکاریوں، عزم وثبات اور نظریہ توحید وسنت کو اجاگر کیا جائے تاکہ ان پر عمل کرنے سے ایک مسلمان، صادق مؤمن بن سکے اور اپنی دنیوی زندگی کو جنت نظیر بنا سکے۔

ہم نے امام موصوف رضی اللہ عنہ کی سیرت مبارکہ کو جہاں تک ہو سکا حقائق کا لباس پہنایا ہے اور جہاں تک ہو سکا کتاب ہٰذا سے دعوت وتبلیغ، اصلاح احوال اور اتحاد

بین المسلمین کا کام لیا ہے۔(یہ اہم ترین موضوع ہیں مگر افسوس، ان سے عام کتب عاری دکھائی دیتی ہیں۔)

بہرکیف اللہ کی توفیق سے متعدد کتب سیر وسوانح کے گہرے مطالعہ اور اخبار و آثار کے استفادہ کے بعد ایک ایسی کتاب ترتیب دینے میں کامیابی حاصل کرنے کی کوشش کی ہے جس میں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے ممکن حد تک صحیح حالات بھی ہیں اور ان گمراہ کن اور بدعت انگیز باتوں کی تردید بھی ہے، جو مسلمانوں کو ضلالت و جہالت کے عمیق گڑھوں میں دھکیل رہی ہیں۔ اور ان کے دین و ایمان اور ان کے اصول وعقائد کو تباہ کررہی ہیں۔ بدعت، گمراہی اور شرک سے اجتناب برتنے اور اپنے اعتقادات کو درست رکھنے کے لیے ایسی کتابوں کو زیرِ مطالعہ رکھنے کی بے حد ضرورت ہے جو اسلام کی حقیقی تعلیمات سے رُوشناس کرائیں اور غلط کاریوں سے بچائیں۔ علاوہ ازیں کتاب ہٰذا میں ایسی بہت سی باتیں بھی ہیں جو بڑی تاریخی، معلوماتی اور چشم کشا ہیں۔ اور طرفین کا لٹریچر پڑھنے کے بعد کسی کا نام لیے بغیر ضروری بحث کی گئی ہے۔ ایسی بصیرت افروز باتیں شاید آپ کو اور کسی کتاب میں یکجا نہ ملیں۔

اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ سبائیت اور ناصبیت دونوں راہیں، اعتدال سے ہٹی ہوئی ہیں۔ اس کتاب میں بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں صدقِ واقعات کے ساتھ عدل و انصاف کی راہ اختیار کی گئی ہے، اور بلا دلیل وبرہان کسی کی مخالفت کی گئی ہے نہ موافقت۔ اور کسی صحیح مصنف کا یہی بڑا امتحان ہے۔ شکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سلسلے میں ہماری مدد فرمائی۔ قارئین خود مطالعہ فرما کر جان لیں گے۔

دانا کہتے ہیں ''مشک آنست کہ خود ببوئید نہ کہ عطار بگوید'' یعنی صحیح اور اصلی خوشبو وہ ہوتی ہے جو خود بخود سونگھی جائے۔ خوشبو بیچنے والے کو اس کے تعارف کی ضرورت ہی نہ ہو، الحمدللہ، یہی حال اس کتاب کا ہے۔

بحمد اللہ! ”ادارہ مسلم پبلی کیشنز سوہدرہ / لاہور“ اسی قسم کی منتخب اور بیش بہا کتابیں شائع کر رہا ہے، اس سے پہلے وہ اصحاب بدر رضی اللہ عنہم، عشرہ مبشرہ رضی اللہ عنہم، نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم، رہبر کامل صلی اللہ علیہ وسلم، سیرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا، سیرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا، سیرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، سیرت آزاد رحمہ اللہ، نقوش ابوالکلام رحمہ اللہ، سیرت الائمہ رحمہم اللہ، سیرت ابوحنیفہ رحمہ اللہ، سیرت ثنائی رحمہ اللہ، استاد پنجاب رحمہ اللہ، تذکرہ بزرگان علوی سوہدرہ رحمہم اللہ جیسی نادر ونایاب، سبق آموز اور بصیرت افروز کتب سیر شائع کر چکا ہے۔ ہماری ایک بالکل نئی اور قابل مطالعہ کتاب ’عفیفہ کائنات رضی اللہ عنہا‘، جو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے سوانح پر ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے، مارکیٹ میں آ کر ختم ہو چکی ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن بھی اختتام کو پہنچ چکا ہے اور دیگر کتب مثلاً ممتاز صحابہ رضی اللہ عنہم، مذاہب عالم، انوار الحدیث، تفسیر سورۂ فاتحہ، عشرہ مبشرہ رضی اللہ عنہم، اُمہات النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور تاریخ المشاہیر، دولتمند صحابہ رضی اللہ عنہم، خلافت راشدہ اور ختم نبوت بھی حسن ترتیب کے ساتھ روح کو راحت اور آنکھوں کو طراوت بہم پہنچانے کے لئے بازار علم وفضل میں آ رہی ہیں۔ اور اب ”سیرت حسین رضی اللہ عنہ مع سانحہ کربلا“ کا تیسرا ایڈیشن بڑے شاندار اور قیمتی حک و اضافہ کو اپنے دامن میں لئے چار سو سے زائد ایمان افروز صفحات اور خوبصورت تاریخی و جغرافیائی نقشوں کے ساتھ آپ کے ہاتھوں کی زینت ہے، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ یہ کتاب جس سال طبع ہوئی، بحمد اللہ اسی سال ختم ہو گئی، ہاں اتنا ضرور ہے چونکہ کارکنانِ ادارہ نے اور بھی کتب چھپوانا ہوتی ہیں اس لیے کتب اپنی باری پر چھپتی ہیں۔ اور بعض کی طباعت میں تاخیر ہو جانا قدرتی امر ہے۔ بہرحال آئندہ اس کمی کو دور کرنے کی ممکنہ کوشش کی جائے گی، ان شاء اللہ۔ تاکہ عوام وخواص کو تاخیر کی یہ شکایت نہ رہے۔ اور ادارہ کوشش کرے گا کہ اس کی ہر کتاب ہر وقت موجود رہے۔

الحمد للہ! ”سیرت حسین رضی اللہ عنہ مع سانحہ کربلا“ کا موجودہ ایڈیشن پہلے ایڈیشنوں سے

بہر پہلو بہتر، جامع اور کامل ہے، جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ بفضلہٖ ازاں قبل اس موضوع پر اس سے بہتر مدلل اور سلیس کتاب شاید آپ نے ملاحظہ نہ فرمائی ہو۔ اس میں جو اچھی بات ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو کمزور بات ہے وہ ہماری طرف سے ہے، جس کی ہم اللہ تعالیٰ سے معافی کی التجاء کرتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ اسے پسندیدہ نگاہوں سے دیکھیں گے اور ہماری محنت کی داد دیں گے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی مدد اور قارئین کا تعاون ہمارے شامل حال رہا اور باذوق دوستوں نے ہماری کتابوں کی اشاعت میں حوصلہ افزائی فرمائی تو یہ سلسلہ بفضلہٖ تعالیٰ جاری رہے گا اور ہم اچھی سے اچھی کتابیں تالیف کر کے شائع کرتے اور آپ کے مشتاق ہاتھوں میں پہنچاتے رہیں گے۔ یاد رکھیے! کسی نیک کام میں ہاتھ بٹانا اور کام کرنے والے کی مدد کرنا بھی نیکی میں داخل ہے اور اجر وثواب کا موجب ہے۔ جو اصحاب ان دینی واصلاحی اور تاریخی کتابوں کی اشاعت بڑھائیں گے، وہ یقیناً تبلیغ حق اور خدمت اسلام کا ثواب پائیں گے۔ ہم ان کی مخلصانہ معاونت سے زیادہ سے زیادہ تبلیغی، اصلاحی، اخلاقی، تاریخی اور دوسری مذہبی کتابیں شائع کر سکیں گے۔

آپ کا مخلص

محمد ادریس فاروقی (رحمہ اللہ)

مسلم پبلی کیشنز، سوہدرہ / لاہور

باب 1:

ولادت باسعادت اور تعلیم وتربیت

ولادت باسعادت

سیدنا حسین بن علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ بتاریخ 5 شعبان المعظم 4ھ بروز شنبہ بوقت شب سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا بنت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بطن مبارک سے منصۂ شہود پر جلوہ آرا ہوئے۔[1]

آپ رضی اللہ عنہ کی ولادت کی اطلاع جب سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی تو حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسرت وانبساط کا اظہار فرمایا اور خبر سنتے ہی سیدۂ عالم رضی اللہ عنہا کے مشکوئے معلیٰ میں تشریف لے گئے۔ اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا نے کپڑے میں لپیٹ کر ان کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ کمال محبت وشفقت' ان کو اپنی آغوش میں لے لیا، دائیں کان میں اذان کہی، برکت کے لیے اپنی زبان مبارک ان کے منہ میں ڈالی، پھر خرما چبا کر اس کی ''گھٹی'' دی اور ''حسین'' نام رکھا۔[2]

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ رضی اللہ عنہ کے سر کے بال ترشوائے اور اس کے ہم وزن چاندی صدقہ فرمائی، ساتویں دن دو مینڈھے ذبح کر کے عقیقہ کیا اور ایک روایت کے مطابق اسی روز ان کا ختنہ بھی کرا دیا۔[3]

---

① البداية والنهاية: 90/4، الاصابة: 332/1. ② موطأ امام مالك، العقيقة، باب ماجاء في العقيقة، ومستدرك حاكم: 179/3. ③ ابوداود، الضحايا، باب في العقيقة، حديث: 2841.

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ بہت خوبصورت تھے۔ شکل و صورت میں اپنے محترم نانا جان علیہ الصلوٰۃ والسلام سے مشابہت رکھتے تھے۔[1] آپ رضی اللہ عنہ کی پیدائش پر جس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خوش ہوئے اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور دوسرے مسلمانوں کو بھی خوشی ہوئی۔

آپ رضی اللہ عنہ کی کنیت ابوعبداللہ ہے اور سیّد، شہید، طیّب، زکی، سبط، رشید، مبارک، وفی، تابع لمرضاۃِ اللہ وغیرہ آپ کے القاب ہیں۔ اور آپ کو ''شبّیر'' بھی کہا جاتا ہے۔

آپ رضی اللہ عنہ کا مختصر شجرۂ نسب یہ ہے: حسین بن علی رضی اللہ عنہما بن ابی طالب بن عبدالمطلب۔ یعنی تیسری پشت میں آپ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جا ملتے ہیں۔

غلط روایات

افسوس ہے کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی ولادت اور رضاعت سے متعلق جھوٹے افسانے گھڑ لیے گئے ہیں، مثلاً یہ کہ ان کا نام حسین رضی اللہ عنہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں رکھا تھا بلکہ سیدنا جبرئیل علیہ السلام نے رکھا تھا، نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا پر القا کیا تھا کہ آپ کے ہاں جو بچہ پیدا ہوگا، اس کا نام حسین رضی اللہ عنہ رکھنا ہوگا،[2] وغیرہ وغیرہ لیکن تحقیق کے معیار میں یہ سب ڈھکوسلے ہیں۔

پھر حضرت ممدوح رضی اللہ عنہ کی شیر خوارگی کے متعلق عجیب و غریب بے سر و پا بے بنیاد حکایات تراش لی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ تولّد ہوئے تو حق تعالیٰ نے ان سے کہہ دیا کہ کسی عورت کا دودھ نہ پینا، یہاں تک کہ اپنی والدہ کے دودھ کو بھی منہ نہ لگانا ورنہ ''نسائیت'' یعنی عورت پن پیدا ہو کر وہ شجاعت و پامردی جاتی رہے گی جس کے جوہر کربلا میں دکھانے ہیں، اس ''ہدایت'' کے بموجب انھوں نے نہ اپنی ماں

◄◄ سنن نسائی، العقیقۃ، باب کم یعق عن الجاریۃ، حدیث : 4224، والسنن الکبریٰ للبیہقی: 9/304۔ [1] صحیح البخاری، فضائل اصحاب النبی، باب مناقب الحسن والحسین رضی اللہ عنہما، حدیث: 3748۔ [2] سیر اعلام النبلاء : 3/284۔

کا دودھ پیا، نہ کسی اور خاتون کا، بلکہ ان کے اپنے انگوٹھے یا بازو میں دودھ اتر آتا تھا جسے پی کر وہ سیر ہو جاتے تھے۔

دوسری گھڑی ہوئی روایت یہ ہے کہ حسین رضی اللہ عنہ دودھ پینے کی بجائے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک چوس کر پیٹ بھر لیتے تھے۔

تیسری روایت یہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا انگوٹھا چوستے تھے جس سے دودھ نکل آتا تھا اور اسی پر انھوں نے پرورش پائی وغیرہ۔

اس قسم کے غلط قصے محض ''خوش اعتقادی'' کی بنیاد پر اور حسین رضی اللہ عنہ کی تمام مخلوق پر برتری اور فوقیت اور فضیلت دینے اور مافوق الفطرت شخصیت ظاہر کرنے کے لیے تصنیف کیے گئے ہیں، جن کا فطرت انسانی، عقل سلیم، دینی تفضّل اور مذہبی و تاریخی روایات سے کوئی واسطہ نہیں۔ جس طرح دوسرے تمام انسانوں نے، انبیاء و مرسلین نے اور اولیاء و ائمہ نے اپنی ماؤں یا دوسری عورتوں کا دودھ پیا ہے اسی طرح حسین رضی اللہ عنہ نے پیا ہے۔ کیا عجیب معاملہ ہے کہ شاہِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم شیر مرضعہ نوش فرما سکتے ہیں، علی رضی اللہ عنہ اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کی پرورش نسوانی دودھ سے ہو سکتی ہے، حضرت حسن رضی اللہ عنہ خاتون کا دودھ پی سکتے ہیں، لیکن حسین رضی اللہ عنہ کے لیے شیر نسواں چکھنا اور چھونا ممنوع کر دیا گیا؟ سیدنا علی رضی اللہ عنہ عورت کا دودھ پی کر شیر خدا، مجاہد اعظم، بے مثل پہلوان اور فاتح خیبر بن سکتے ہیں، مگر حسین رضی اللہ عنہ عورت کے دودھ کا ایک قطرہ حلق سے اتار لیں تو ان کی شہہ زوری اور طاقت وبسالت رخصت ہو جاتی ہے؟ اور وہ میدان کربلا میں لڑنے کے قابل نہیں رہتے؟...... ع

جو بات کی، خدا قسم! لاجواب کی

ان خرافات کی تردید میں ایک روایت سن لیجیے، سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی ولادت سے

پیشتر رسول اللہ ﷺ کی چچی اور سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کی زوجہ ام فضل بنت حارث رضی اللہ عنہا خواب دیکھتی ہیں کہ نبی علیہ السلام کے جسم اطہر کا ایک ٹکڑا ان کی جھولی میں آ گرا ہے، وہ گھبرا کر اٹھیں اور رسول اللہ ﷺ کے پاس خواب بیان کیا، حضور ﷺ نے مسکرا کر فرمایا: چچی! غم نہ کرو، خواب بہت مبارک ہے، عنقریب فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کے بطن سے ایک بچہ پیدا ہوگا جس کی پرورش تمھارے ذمے ہوگی اور تم اس کو دودھ پلاؤ گی، چنانچہ جب حسین رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے تو انھیں ام فضل رضی اللہ عنہا کے سپرد کیا گیا اور جب تک حسین رضی اللہ عنہ چلنا نہیں سیکھے تھے وہی ان کو دودھ پلاتی رہیں۔[1]

ایک اور روایت ہے کہ یقطر کی بیوی نے بھی آپ رضی اللہ عنہ کو دودھ پلایا تھا۔[2] اور عبداللہ بن یقطر آپ رضی اللہ عنہ کے رضاعی بھائی تھے۔ مطلب یہ کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اپنی والدہ کا دودھ پیا ہو یا ام الفضل کا یا زوجہ یقطر کا، بہر حال آپ رضی اللہ عنہ نسوانی دودھ پر پلے ہیں۔ اس سے نام نہاد عاشقان حسین رضی اللہ عنہ کے جہالت خیز اعتقادات کی قلعی کھلتی ہے جو دوسروں کو گمراہ کرنے کے لیے گھڑے گئے ہیں۔

شفقتِ رسول ﷺ

رسول اللہ ﷺ کو اپنے نواسوں اور نواسیوں سے بے حد محبت تھی، یہ غلط ہے کہ آپ ﷺ حسین رضی اللہ عنہ کو سب سے زیادہ چاہتے تھے اور حسن رضی اللہ عنہ، زینب رضی اللہ عنہا، ام کلثوم رضی اللہ عنہا، اور رقیہ رضی اللہ عنہا سے چنداں التفات نہ فرماتے تھے۔ حضور ﷺ کو جیسی اپنی اولاد سے محبت تھی ویسی ہی اپنی اولاد کی اولاد سے بھی محبت تھی۔ حضور ﷺ اپنے نواسوں کو گود میں لیے پھرتے، کندھوں پر اٹھا لیتے، ان سے لاڈ کرتے اور ان کے لاڈ دیکھتے۔ کیا مجال جو ان کی کسی حرکت واداسے پیشانی مبارک پر شکن آئے، یا آثار

---

① دلائل النبوة للبيهقي: 6/469، ومستدرك حاكم: 3/176-177. ② تاريخ طبري: 5/282، والكامل لا بن اثير: 3/278، والبداية والنهاية: 8/170.

ملال ظاہر ہوں۔ سیدنا حسن وحسین رضی اللہ عنہما کی شان میں فرمایا:

«إِنَّهُمَا رَيْحَانَتَايَ مِنَ الدُّنْيَا»

''یہ دونوں تو دنیا میں میرے پھول ہیں۔''[1]

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم حسن رضی اللہ عنہ اور حسین رضی اللہ عنہ کو دوش مبارک پر سوار کرتے تو فرماتے:

«اَللّٰهُمَّ إِنِّي أُحِبُّهُمَا فَأَحِبَّهُمَا وَأَحِبَّ مَنْ يُّحِبُّهُمَا»

''مالک وقدوس! جس طرح میں ان دونوں سے محبت رکھتا ہوں، تو بھی ان سے محبت رکھ اور جو ان دونوں کو محبوب رکھے تو بھی اس کو محبوب بنا لے۔''[2]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی دونوں صاحبزادوں کو اٹھاتے، کلمہ خیر پڑھتے، ان کے لیے دعا فرماتے اور پاکیزہ الفاظ زبان اقدس سے نکالتے، تاکہ جو پاک الفاظ ان کے پردۂ گوش سے ٹکرائیں، ان کے دل و دماغ پر نقش ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں ان پر نازل ہوتی رہیں۔

ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کے مکان کے قریب سے گزر رہے تھے کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے رونے کی آواز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کانوں میں پہنچی، فوراً پلٹے اور جا کر سیّدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:

«أَلَمْ تَعْلَمِيْ أَنَّ بُكَائَهُ يُؤْذِيْنِي؟»

''کیا تُو نہیں جانتی کہ اس کے رونے سے مجھے تکلیف ہوتی ہے؟''

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آگے بڑھ کر انھیں اٹھا لیا، پیار کیا اور جب تک وہ چپ نہ

---

[1] صحيح البخاري، فضائل أصحاب النبي، باب مناقب الحسن والحسين، حديث: 3753. [2] جامع الترمذي، المناقب، باب مناقب أبي محمد الحسن ابن علي رضي الله عنهما، حديث: 3769.

ہوئے گھر سے باہر نہ نکلے۔ ①

حضور ﷺ ان کے دیکھنے کو اکثر بے تاب رہتے، یا تو سیّدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر جا کر ان کو دیکھتے یا اپنے پاس منگوا لیتے، کہیں گلی کوچے میں کھیلتا دیکھتے فوراً اٹھا لیتے، سر منہ چومتے، پیار کرتے، سینے سے لگاتے اور دعائیں دیتے۔

ایک غلطی کا ازالہ

اہل بیت اطہار رضی اللہ عنہم کے غالی ''معتقد'' جو اپنی شکم زاد روایات بیان کرنے میں نظیر نہیں رکھتے، اکثر کہا کرتے ہیں کہ جب حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہما شیر خوارگی میں تھے، تو نبی کریم ﷺ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے منہ کو چوما کرتے اور کہتے کہ میرے اس نواسے کو منہ کے راستے زہر دیا جائے گا...... اور سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے حلق کو چومتے اور فرماتے کہ میرے اس بیٹے کا گلا کاٹا جائے گا۔ یہ سب روایتیں ایک خانہ ساز افسانے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں اور نہ حدیث و آثار یا سیرت کی کتابوں میں ان کا کہیں ذکر ملتا ہے۔

پھر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دونوں صاحبزادے ابھی چلنا پھرنا بھی نہ سیکھے تھے کہ نبی کریم ﷺ کو ان کے متعلق وحی آنا شروع ہوگئی، جس میں دونوں کی شہادت کی نسبت اطلاعات دی گئیں اور بتایا گیا کہ بنی امیہ ان کے دشمن ہیں اور معاویہ و ابن معاویہ ان کی جان لے کر چھوڑیں گے۔ معاویہ امام حسن رضی اللہ عنہ کو زہر دلوائے گا اور یزید امام حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کرائے گا، چنانچہ دونوں کے واقعات شہادت کی تفصیل اور تاریخ تک رسول اللہ ﷺ کو بتا دی گئی۔ یہ سب باتیں کذب بیانی اور دروغ بافی سے تعلق رکھتی ہیں اور کسی کتاب میں ان کا قطعی ثبوت نہیں ملتا ہے۔ محض ''پنجتن پاک'' اور اہل بیت رضی اللہ عنہم

① تهذيب تاريخ دمشق : 7/125، وطبراني في الكبير : 3/116، حديث: 2847.

کی فضیلت جتانے کے لیے ایسی روایتیں گھڑی گئی ہیں۔

سیدنا حسن و حسین رضی اللہ عنہما سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت

اس میں کوئی کلام نہیں کہ حضور شاہِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما سے بے حد محبت تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم انھیں دیکھ دیکھ کر خوشی میں پھولے نہ سماتے تھے۔

ایک دفعہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اہل بیت رضی اللہ عنہم میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کس کو زیادہ محبوب رکھتے ہیں؟ فرمایا: ''اولاد میں فاطمہ رضی اللہ عنہا کو۔ اور اولاد کی اولاد میں حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کو۔''[1]

اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: ایک شب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دولت کدہ پر حاضر ہوا اور دروازہ کھٹکھٹایا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی چیز پر چادر لپیٹی ہوئی تھی، میں نے عرض کیا: ''حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی شئے کو لپیٹ رکھا ہے......؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چادر اٹھا دی تو دو خوبصورت بچے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں پہلوؤں سے لگے ہوئے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اسامہ! یہ دونوں میرے بیٹے ہیں، میری بیٹی فاطمہ (رضی اللہ عنہا) کے بیٹے ہیں، میرے دوست علی (رضی اللہ عنہ) کے بیٹے ہیں۔ جو ان سے محبت کرے میں بھی اس سے محبت کرتا ہوں۔''[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یوں تو بچوں سے بہت محبت تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو تاکید فرماتے کہ وہ اپنے بچوں سے محبت کیا کریں، پھر حسن اور حسین رضی اللہ عنہما تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم کے ٹکڑے تھے، ان سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت فطری تقاضے کے ماتحت تھی اور بے حد تھی۔

ایک دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم حسن رضی اللہ عنہ کے بوسے لے رہے تھے تو اقرع بن حابس تمیمی رضی اللہ عنہ

---

① جامع الترمذي، المناقب: باب مناقب أبي محمد الحسن بن علي، حديث: 3772.

② جامع الترمذي،المناقب، باب مناقب أبي محمد الحسن بن علي، حديث: 3769.

نے عرض کیا کہ میرے دس بیٹے ہیں، میں نے تو اپنے بچوں کو کبھی نہیں چوما؟

رسول اللہ ﷺ نے اُن کی طرف دیکھا اور فرمایا:

«مَنْ لَّا يَرْحَمُ لَا يُرْحَمُ»

''جو شخص رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں ہوتا۔''[1]

سیدنا حسن وحسین رضی اللہ عنہما کبھی کھیلتے ہوئے اپنے محترم نانا جان ﷺ کو آتے دیکھ کر ان سے لپٹ جاتے اور آپ ﷺ کے اوپر چڑھنے کی کوشش کرتے، آنحضرت ﷺ جھک جاتے اور وہ آپ ﷺ کے پاؤں پر پاؤں رکھ کر سینے کی طرف چڑھ جاتے، آپ ﷺ ان کو کندھوں پر اٹھا لیتے یا بغل میں لے لیتے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک بار آپ ﷺ تشریف لائے تو آپ ﷺ کے ایک دوش پر حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور دوسرے پر حضرت حسین رضی اللہ عنہ تھے اور آپ ﷺ باری باری دونوں کے بوسے لیتے تھے، جب آپ ﷺ ہمارے نزدیک آئے تو فرمایا:

''جو ان دونوں کو دوست رکھے وہ میرا دوست ہے اور جو ان سے دشمنی کرے وہ میرا دشمن ہے۔''[2]

اس قسم کی متعدد روایات کتب احادیث وتاریخ میں مذکور ہیں جن سے آپ ﷺ کی اپنے نواسوں سے بے پناہ محبت کا پتہ چلتا ہے۔

بچپن کے چند واقعات

یہی نہیں کہ نبی اکرم ﷺ ہی اپنے نواسوں سے پیار کرتے تھے بلکہ یہ دونوں صاحبزادے بھی آپ ﷺ سے بے حد مانوس تھے اور جب تک اپنے محترم نانا جان ﷺ

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 5997 وصحيح مسلم، حديث: 2318 [2] مستدرك حاكم: 122/3 و 166/3.

کو دیکھ نہ لیتے چین نہ پاتے، حضور ﷺ جہاں بھی ہوتے وہ فوراً آپ ﷺ کی خدمت میں پہنچتے۔ مسجد میں، مجلس میں، نماز میں، خطبے میں، ہر جگہ وہ آن موجود ہوتے۔

ایک جمعہ کو حضور ﷺ خطبہ دے رہے تھے کہ حسن اور حسین رضی اللہ عنہما بھی گرتے پڑتے مسجد میں آ پہنچے، آپ ﷺ نے انھیں دیکھا تو محبت غالب آ گئی، فوراً منبر سے اترے اور دونوں کو اٹھا کر منبر پر اپنے ساتھ بٹھا لیا۔[1]

ایک روز حضرت حسن رضی اللہ عنہ یا حسین رضی اللہ عنہ کو لے کر آپ ﷺ مسجد میں تشریف لے گئے اور ان کو الگ بٹھا کر نماز پڑھنے لگے۔ جب حضور ﷺ سجدے میں گئے تو حسین رضی اللہ عنہ اپنی جگہ سے اٹھے اور نانا جان کی پیٹھ پر سوار ہو گئے۔ آپ ﷺ نے اس وقت تک سر نہ اٹھایا جب تک وہ پشت مبارک سے اتر نہ گئے۔[2]

اسی طرح ایک مرتبہ حضور ﷺ نماز میں مصروف تھے کہ حسین رضی اللہ عنہ آئے۔ اور جب آپ ﷺ سجدے میں گئے تو آپ ﷺ کی گردن مبارک سے لپٹ گئے، آپ ﷺ نے تھوڑی دیر توقف کیا، مگر جب تک وہ علیحدہ نہ ہوئے تو ایک ہاتھ سے انھیں پکڑے رکھا تاکہ گر نہ جائیں اور اسی طرح ان کو پکڑے ہوئے قیام و رکوع فرماتے رہے۔[3]

کبھی یہ دونوں صاحبزادے نماز کی حالت میں حضور ﷺ کے پاس آ جاتے تو آپ ﷺ کی مبارک ٹانگوں سے لپٹ جاتے۔ آپ ﷺ اپنی مبارک ٹانگیں پھیلا

---

① سنن أبي داود، الصلاة: باب الامام يقطع الخطبة لأمر يحدث، حديث: 1109، وجامع الترمذي، المناقب، باب مناقب أبي محمد الحسن بن علي، حديث: 3774، وسنن نسائي، الجمعة، باب نزول الامام عن المنبر قبل فراغه......، حديث: 1414، سنن ابن ماجه، اللباس، باب لبس الأحمر للرجال، حديث: 3600. ② سنن نسائي، التطبيق، باب هل يجوز أن تكون سجدة أطول من سجدة، حديث: 1142. ③ مستدرك حاكم: 167/3.

دیتے تاکہ درمیان سے نکل جائیں...... ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کسی دعوت پر تشریف لے جارہے تھے راستے میں دیکھا کہ حسین رضی اللہ عنہ لڑکوں سے کھیل رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے انھیں پکڑنے کو ہاتھ بڑھایا مگر وہ ادھر ادھر دوڑنے لگے، آنحضرت ﷺ بھی مسکراتے ہوئے ان کے ساتھ بھاگتے رہے اور آخر پکڑ کر ان کا منہ چوم لیا۔[1]

ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضور ﷺ پیارے نواسوں حسن و حسین رضی اللہ عنہما سے کس قدر محبت رکھتے اور کس طرح ان کی دلداری فرماتے تھے اور کسی حالت میں بھی ان سے ناراض و خشمگیں نہ ہوتے تھے۔ (اللہ تعالیٰ ہمیں اس سنت نبوی پر عمل کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین)

بچپن کے مشاغل

حضرت حسین رضی اللہ عنہ اپنے ہمجولیوں کے ساتھ کھیل کود کرتے تھے۔ عرب کے بچے کبڈی کی قسم کا ایک کھیل کھیلتے تھے، جسے عاقب یا عقاب کہتے ہیں، حسین رضی اللہ عنہ بھی اس میں شریک ہوتے اور اس کا اشتیاق رکھتے تھے۔ کبھی کبھی لکڑیوں اور ڈنڈوں سے بھی کھیلتے اور کبھی کنکروں اور ٹھیکریوں سے شغل فرماتے۔ بھاگ دوڑ میں بھی حصہ لیتے۔ ایک بار دو لڑکوں سے دوڑ کا مقابلہ کر رہے تھے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے روک لیا۔ انھوں نے کہا: ''ابا جان! آپ ہمیں اس لیے روک رہے ہیں کہ ہم اللہ کے سپاہی نہ بن سکیں؟'' حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ مسکرا کر خاموش ہوگئے اور دوڑنے کی اجازت دے دی۔

اسی طرح آپ رضی اللہ عنہ بچوں میں کھیل رہے تھے اور کشتی لڑنے کا مشغلہ ہو رہا تھا آپ نے چند بچوں کو کئی دفعہ پچھاڑ دیا، آنحضرت ﷺ بھی یہ منظر دیکھ رہے تھے جب کھیل

[1] مستدرك حاكم: 3/177.

ختم ہوا تو حضور ﷺ نے قریب جا کر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو اٹھا لیا اور فرمایا:

”یہ شجاع ابن شجاع بہادر بیٹا ہوگا۔“

الغرض حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے کھیل عام طور پر سپاہیانہ اور مجاہدانہ ہوا کرتے تھے، جس سے فوجی قوت اور مجاہدانہ اسپرٹ پیدا ہوتی تھی۔ آپ رضی اللہ عنہ غلیل سے بھی نشانے لگایا کرتے تھے اور اسی مشغلے نے ذرا بڑے ہو کر آپ کو تیر اندازی کا ماہر بنا دیا۔ یہ بھی روایت ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے لکڑی کی ایک تلوار بنوائی ہوئی تھی جس سے تیغ زنی کی مشق کرتے تھے۔ اور حق تو یہ ہے کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے یہی وہ مشاغل تھے جنہیں اختیار کرنے سے آپ بڑے ہو کر مجاہد اعظم بنے، تلوار کے دھنی کہلائے، متعدد جنگوں میں پامردی سے لڑے اور آخر میں میدان کربلا میں اپنی شمشیر جہانگیر کے جوہر دکھائے۔ جس کا تذکرہ اپنی جگہ آئے گا۔

تعلیم و تربیت

اوپر کے واقعات سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے نانا محترم ﷺ اور والدین گرامی قدر چپکے سے ان کے لاڈ پیار، اور چاؤ چونچلے ہی دیکھتے رہتے تھے۔ نہیں جہاں کسی بات سے روکنے کی ضرورت ہوتی، روک دیتے، کوئی ناجائز بات دیکھتے تو منع فرماتے، ان کی اصلاح پر توجہ دیتے اور فرما دیتے کہ بیٹا! یوں نہیں، یوں کرنا چاہیے، یہ کام ناجائز ہے، یہ جائز ہے، فلاں بات بری ہے فلاں اچھی۔ یوں بولنا چاہیے، یوں نہیں بولنا چاہیے۔ بڑوں سے یوں گفتگو کرنی چاہیے، کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے کے یہ یہ آداب، یہ یہ قواعد اور یہ یہ اوقات ہیں، غرض انھیں پورے اخلاق و آداب سکھائے۔

یہ ٹھیک ہے کہ سیدنا حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کو رسول اللہ ﷺ سے تربیت پانے اور تعلیم

حاصل کرنے کا زیادہ موقع نہیں ملا اور وہ ابھی کم سن ہی تھے کہ اپنے نانا جان ﷺ اور اپنی والدہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے سایۂ شفقت سے محروم ہو گئے، حسین رضی اللہ عنہ تو صرف سات ہی برس کے تھے، جب کہ نبی ﷺ کا ظل ہمایوں ان کے سر سے اٹھ گیا اور ساڑھے سات سال کی عمر میں شفیق امی جان رضی اللہ عنہا بھی اللہ تعالیٰ سے جا ملیں۔ إنا لله وإنا إليه راجعون.

لیکن اس کم عمری میں بھی انھوں نے بہت کچھ سیکھ لیا اور وقت طفلی میں ہی ان کا ذہن مانجھ دُھل کر صاف ہو گیا، ذہنِ رسا میں جلا اور چمک پیدا ہو گئی، قوت ادراک نے ترقی حاصل کی، فہم و شعور کو فروغ نصیب ہوا، حافظہ میں تیزی اور ذکاوت جلوہ گر ہوئی اور جس بچے کو امت کا ہیرو بننا تھا قدرت نے لڑکپن میں ہی اس کو صیقل کر کے مصفّٰی و مجلّٰی فرما دیا۔

بے سبب خَلق نہیں کہتی ہے فرزانہ اسے
اس کے بچپن میں ہی آثار نمایاں ہوں گے

امام ہمام رضی اللہ عنہ کی والدہ ماجدہ رضی اللہ عنہا چونکہ اپنے والد محترم ﷺ سے پوری تربیت یافتہ تھیں، اس لیے انھوں نے بھی جہاں ممکن ہوا، ان کی تعلیم و تربیت پر خوب دھیان دیا۔ سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کا یہ طریقہ تھا کہ جب اپنے فرزندوں میں کوئی لغزش پاتیں، فوراً انھیں متنبہ کرتیں، چنانچہ ایک واقعہ سنیے ! ایک دفعہ حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کسی بات پر آپس میں جھگڑ پڑے اور لڑتے جھگڑتے اپنی والدہ کے پاس پہنچے۔ ایک نے کہا: میرے ساتھ اس نے لڑائی کی ہے، دوسرا بولا: اس نے مجھے مارا ہے، محترمہ فاطمۃ الزّہراء رضی اللہ عنہا نے دونوں کے بیان سنے، پھر فرمایا: میں نہیں جانتی کہ کس نے مارا ہے اور کس نے مار کھائی ہے، میرے نزدیک تم دونوں مجرم ہو، تم دونوں نے آئین خدا اور قانون نبوی ﷺ سے روگردانی کی ہے، بیٹو !اللہ تعالیٰ نے تو حکم دیا تھا: ﴿لَا تُفْسِدُوا فِي

الْاَرْضِ : ''زمین میں لڑائی جھگڑے نہ کرو۔'' اور تم لڑتے بھڑتے ہو، جاؤ جا کر اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو اور اپنے گناہ بخشواؤ، دونوں صاحبزادوں نے والدہ ماجدہ کا انتباہ سنا تو درگاہِ ایزدی میں جا حاضر ہوئے۔ اور تائب ہو کر آئندہ صلح و صفائی سے رہنے کا اقرار کیا۔

دیکھیے! حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی کس طرح تربیت ہو رہی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ خیرات کو اپنی آل اولاد کے لیے ممنوع قرار دیا تھا۔ ایک بار صدقے کی کچھ کھجوریں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائی گئیں، اس وقت حضرت حسن رضی اللہ عنہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے۔ انھوں نے فوراً ایک کھجور لے کر منہ میں ڈالی اور چبانے لگے، حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو ان کے منہ میں انگلی ڈال کر فرمایا: ''کخ کخ'' ''(اُگل دو، اگل دو) کیا تجھے معلوم نہیں کہ خاندان نبوت میں صدقے کا مال کھانا جائز نہیں......؟'' پس وہ کھجور ان کے منہ سے باہر نکال دی گئی۔[1] اس کے بعد زندگی بھر حسین رضی اللہ عنہ نے کسی چیز کو خود بخود ہاتھ نہیں لگایا۔ جو چیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا سیدنا علی رضی اللہ عنہ و فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا دیتے کھا لیتے۔

خیال کرو! جس بچے کی ایسی تربیت ہو رہی ہو، اسے بچپن میں ہی حرام حلال کی تمیز کیوں نہ ہو؟...... وہ دین کے ضروری مسائل سے کیوں واقف نہ ہو جائے......؟ یہ ایسی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا کہ پانچ سال کی عمر میں انھوں نے نماز پڑھنا شروع کر دی اور چھ سات سال کی عمر میں روزے رکھنے کے لیے تیار ہو گئے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت حسین رضی اللہ عنہ اپنی والدہ ماجدہ اور اپنے والد بزرگوار سے تربیت پانے لگے، مگر ان کی والدہ ماجدہ رضی اللہ عنہا بھی ان کو خورد سال چھوڑ کر ہی فردوس کو سدھار گئیں۔

---

[1] صحیح البخاری، الزکاۃ: باب مایذکر فی الصدقۃ للنبی ﷺ، حدیث: 1491۔ وصحیح مسلم، الزکاۃ، باب تحریم الزکاۃ علی رسول اللہ ﷺ، حدیث: 1069.

تاریخ سے ثابت ہے کہ وفات نبوی کے بعد حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما نے ممتاز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے تعلیم پائی اور انھوں نے آپ کو خوب ٹریننگ دی، چنانچہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ، سیدنا عمر فاروق اور سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہما سے آپ نے خوب استفادہ کیا، اپنے والد معظم سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے بھی آپ سماع حدیث کرتے اور علوم دینیہ پڑھتے تھے، حضرت حسین رضی اللہ عنہ تو خصوصیت سے اصحاب کبار رضی اللہ عنہم سے تعلیم و تربیت پاتے رہے، ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بھی آپ نے بہت فیضان حاصل کیا، چنانچہ خود فرماتے ہیں:

"میں نے جس قدر تعلیم صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے پائی ہے، اتنی کسی اور سے نہیں پائی اور جو کچھ ان سے سیکھا ہے کسی دوسرے سے نہیں سیکھا۔"[1]

القصہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو انھی بزرگ ہستیوں سے تعلیم اور تربیت حاصل کرنے کا موقع نصیب ہوا، جو خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے شاگرد اور تربیت یافتہ تھے اور دار العلوم نبویہ سے سند فضیلت لے کر نکلے تھے اور انھی کے فیضِ صحبت سے امام عالی مقام رضی اللہ عنہ نے دینی و دنیوی امور میں دستگاہ کامل حاصل کی۔

نتائج تربیت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، سیدنا علی رضی اللہ عنہ، سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ٹریننگ لینے کا یہ اثر ہوا کہ حسین رضی اللہ عنہ کے جوہر کھل گئے، دل و دماغ روشن ہو گئے اور چھوٹی عمر میں ہی شعور و ادراک کی قوتیں مضبوطی پکڑ گئیں، بعض دفعہ تو آپ رضی اللہ عنہ ایسی معقول باتیں کر دیتے کہ بڑے بڑے عقلمند حیران رہ جاتے، ذہانت و فطانت اور فہم و ذکاء کا یہ حال تھا کہ جو بات ایک دفعہ سن لیتے، مدت العمر دماغ سے نہ نکلتی، جچی تلی

---

[1] تاریخ الشهداء.

گفتگو کرتے، معقول و مدلل جواب دیتے اور ایسے خوبصورت طریقے سے بیان کرتے کہ سامعین انگشت حیرت چبانے لگتے، اس سلسلے میں دو تین واقعات قارئین کی نذر ہیں۔

ایک دفعہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اپنے بزرگ نانا جان صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے، علم و عرفان کی محفل جمی ہوئی تھی، اسی مجلس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا: فرزند عزیز! بتاؤ، مرتبہ میں ہم بڑے ہیں کہ تم؟ حضرت حسین رضی اللہ عنہ ذرا تأمل کے بعد بولے: ''نانا جان! گستاخی معاف ہو تو عرض کروں، رتبے میں تو ہم ہی بڑے ہیں۔'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: ''وہ کیسے......؟'' حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''جناب! ذرا غور تو کیجیے! جیسے میرے باپ علی رضی اللہ عنہ ہیں جن کی شان میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «أَنْتَ مِنِّي بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰی»[1] اور جن کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: «يُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ أَوْقَالَ: يُحِبُّهُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ»[2] کیا ایسے باپ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی تھے؟ اور جیسی ہماری والدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا ہیں، جن کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے «سيدة نساء أهل الجنة»[3] کا خطاب دے رکھا ہے اور جن کی نسبت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: «فَاطِمَةُ بِضْعَةٌ مِنِّي»[4] کیا ویسی ماں آپ کی بھی تھیں؟ اور جیسے ہمارے نانا خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، کیا ویسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نانا بھی تھے؟''

جملہ حاضرین ایک کم سن بچے کے منہ سے برجستہ اور معقول جواب سن کر حیران رہ گئے اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کے اس جواب سے بہت خوش ہوئے۔[5]

---

① صحيح البخاري، المغازي، باب غزوة تبوك، حديث:4416. وصحيح مسلم، فضائل الصحابة رضی اللہ عنہم، باب من فضائل علي بن أبي طالب، حديث: 2404. ② صحيح البخاري، الجهاد والسير، باب ما قيل في لواء النبي ﷺ، حديث: 2975. وصحيح مسلم، حديث: 2407. ③ صحيح البخاري، المناقب، باب علامات النبوة في الاسلام، حديث: 3624. ④ صحيح البخاري، فضائل أصحاب النبي ﷺ، باب مناقب قرابة رسول الله ﷺ، حديث: 3714، وصحيح مسلم، فضائل الصحابة، باب من فضائل فاطمة رضي الله عنها، حديث: 2449. ⑤ سوانح عمری، حضرت حسین رضی اللہ عنہ، صفحہ: 12.

سیدنا حسن رضی اللہ عنہ اور حسین رضی اللہ عنہ میں ایک دفعہ رنجش ہوگئی اور دونوں نے تھوڑی دیر کے لیے علیحدگی اختیار کر لی۔ کسی نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا پیغام دیا کہ اگر میرا چھوٹا بھائی میرے پاس معذرت کرنے آ جائے تو میں فوراً صلح کر لوں گا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بھائی جان سے کہہ دو کہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہونے اور معافی مانگنے کو ہر وقت تیار ہوں، لیکن میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جو شخص روٹھے ہوئے کو منانے جائے اور معافی مانگنے میں سبقت کرے وہ معافی دینے والے سے پہلے جنت میں جائے گا۔ اور میں یہ پسند نہیں کرتا کہ اپنے بڑے بھائی سے پہلے بہشت میں داخل ہوں، اس لیے بہتر یہی ہے کہ آپ اپنا مرتبہ بڑھانے اور مجھ سے پہلے جنت میں جانے کے لیے خود میرے پاس تشریف لے آئیں اور میری دلجوئی فرمائیں۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے یہ پیغام سنا تو بہت ہنسے اور فوراً حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر ان کی دلداری کرنے لگے۔[1]

پھر اس تربیت کے تحت دوسروں کو دینی مسائل سکھانے کا طریقہ دیکھیے، ایک دفعہ کی بات ہے کہ حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما نماز سے پہلے مسجد میں کھیل رہے تھے۔ ایک بوڑھا اعرابی آیا اور وضو کرنے بیٹھ گیا۔ وہ ابھی وضو کرنے کے مسنون طریقے سے واقف نہ تھا۔ دونوں صاحبزادوں نے دیکھا کہ وہ بے چارہ غلط وضو کر رہا ہے، کبھی پاؤں پر پانی ڈالتا ہے اور کبھی چہرے پر چھینٹے مارتا ہے، تو انھوں نے اس کا مذاق اڑانے کی بجائے یہ کیا کہ اس کے قریب بیٹھ گئے، ایک نے دوسرے سے کہا: ''لو بھائی، میں وضو کرنے لگا ہوں اگر کہیں غلطی ہو جائے تو بتا دینا۔'' یہ کہہ کر اس نے وضو شروع کیا اور دیدہ دانستہ وہی غلطی کر دی، جو بوڑھے اعرابی نے کی تھی۔ دوسرے نے روکا اور آگاہ کیا کہ یوں نہیں یوں کرنا چاہیے، محترم ابا جان اسی طریقے سے وضو

[1] تهذيب تاريخ دمشق: 129/7.

کرتے ہیں، بوڑھے نے یہ دیکھا تو اپنی غلطی کا ازالہ کر لیا۔ اور درست طریقے سے وضو مکمل کر لیا اور اس کو یہ خیال تک نہ آیا کہ یہ بچے مجھے تعلیم دے رہے ہیں[1] سبحان اللہ! کیسی دانائی اور کیسی زیرکی ہے، اور یہ سب بزرگوں کی صحبت میں رہنے اور ان سے تربیت پانے کا اثر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ناقدین و نقادین کو بھی یہ فکر و دانش عطا فرمائے ورنہ یہ تو زہر میں ڈبو کر دوسروں پر سیدھے تیر پھینکتے ہیں۔ جس کا اکثر مثبت کی بجائے منفی اثر ہوتا ہے۔

ایک مجلس میں سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ وعظ فرما رہے تھے اور حسین رضی اللہ عنہ بھی وہیں تشریف رکھتے تھے، اس وقت آپ کی عمر یہی کوئی آٹھ نو برس کے قریب تھی، ایک سائل نے جناب مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے پوچھا: ''یہ تو بتایئے کہ از روئے شریعت سب سے زیادہ عقلمند کون ہے؟'' حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے والد معظم کی طرف دیکھا اور عرض کیا: ''اگر بے ادبی نہ ہو اور آپ اجازت دیں تو اس کا جواب میں دے دوں۔'' سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے مسکرا کر اجازت دے دی، سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میرے نانا جان صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے:

«اَلْعَاقِلُ مَنْ عَقَلَ لِسَانَهُ إِلَّا عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ»

''وہی شخص سب سے بڑھ کر دانا ہے جو اپنی زبان قابو میں رکھے۔ اور بجز ذکر الٰہی اور اچھی بات کے اس کو استعمال نہ کرے۔''[2]

آپ رضی اللہ عنہ کے اس مدلل اور دانشمندانہ جواب سے سائل اور حاضرین مجلس بہت حیران ہوئے، سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے آپ کو گلے سے لگا کر منہ چوم لیا...... یہ تھا پاک تعلیم کا پاک اثر!

---

[1] البداية والنهاية : 208/8. [2] ''حسین رضی اللہ عنہ سب کا'' صفحہ:102.

حضرت جدّ محترم ﷺ کا فراق

آخر وہ وقت آ پہنچا کہ سیدنا حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کے گرامی منزلت نانا جان ﷺ اپنے معصوم نواسوں کو آغوش شفقت سے محروم کر دیں اور دنیائے فانی کو چھوڑ کر اپنے اللہ سے جاملیں۔

جب رسول اللہ ﷺ کے مرض الموت کے ایام آئے، تو شروع شروع میں دونوں صاحبزادے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور آنحضرت ﷺ حسب معمول ان کو اپنے پاس بٹھاتے اور شفقت فرماتے، لیکن جب حضور ﷺ کی بیماری بڑھ گئی اور حالت خراب ہوتی گئی، تو صاحبزادوں کو آپ ﷺ کے قریب آنے سے روک دیا گیا، تا کہ وہ اپنے پیارے نانا جان ﷺ کی حالت دیکھ کر رونے نہ لگیں اور ان کے ننھے سے دل چوٹ نہ کھا جائیں، لیکن آخر انھیں حضور ﷺ کی شدت مرض کا حال معلوم ہو ہی گیا۔ اور وہ آہ وزاری میں مصروف رہنے اور یاس وقنوط کے سمندر میں غوطے کھانے لگے، جن خوبصورت زبانوں سے پیاری پیاری باتیں نکلتی تھیں وہ نانا جان ﷺ کے غم میں مسکوت کی طرح خاموش ہوگئیں، جو پھول سے جسم پیارے نانا جان ﷺ کو دیکھ کر خوشی سے کھل جاتے تھے، وہ مُرجھا کر رہ گئے اور حزن وملال نے ان کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔

ایک دن سرور دو عالم ﷺ نے دونوں نونہالوں کو بلایا، وہ حاضر ہوئے تو حضور ﷺ کی حالت دیکھ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگے، پھر اپنی والدہ کو روتے دیکھا تو اور بے چین ہوئے اور سمجھ گئے کہ حضور پرنور ﷺ ہمیشہ کے لیے جدا ہونے والے ہیں۔ حضور ﷺ نے انھیں چپ کرایا، پیار کیا، چوما، تسلی دی۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ نے انھیں پیار کرنے کے بعد حاضرین کی طرف توجہ فرمائی اور ان دونوں

کے ساتھ دوسرے اہل بیت رضی اللہ عنہم کا احترام کرنے اور خیال رکھنے کی وصیت فرمائی۔[1]

اس کے تھوڑی دیر بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نزع طاری ہوئی، اور جناب رحمۃ للعالمین «اَللّٰهُمَّ فِي الرَّفِيْقِ الْاَعْلٰى» کا ورد کرتے ہوئے اپنے مولا کی آغوش رحمت میں چلے گئے۔[2]

سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی عمر آٹھ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی عمر سات سال تھی، دونوں شہزادوں کو نانا جان صلی اللہ علیہ وسلم کی فراقت کا بے حد صدمہ ہوا۔ وہ تربت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر جاتے۔ اشک غم بہاتے اور اللہ سے دعائیں مانگتے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ تو فرط الم میں کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آوازیں بھی دینے لگتے تھے اور جس جگہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم علم وعرفان کی مجلس لگاتے تھے وہاں جاتے تو ان کا اضطراب اور بھی بڑھ جاتا۔

پیاری امی جان رضی اللہ عنہا کی مفارقت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد حضرت حسین رضی اللہ عنہ اپنی پیاری امی جان سیدہ فاطمۃ الزَّہراء رضی اللہ عنہا کے زیر سایہ تربیت پانے لگے، سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا ان کا ہر طرح خیال رکھتیں، ان کی دلجوئی فرماتیں اور ان کو دین حق کے علم وعمل سے روشناس کراتیں۔

لیکن آہ ثم آہ! کہ ننھے حسین رضی اللہ عنہ کے قلب وجگر سے ابھی پیارے نانا جان صلی اللہ علیہ وسلم کا زخم جدائی مُندمل نہ ہوا تھا کہ اپنی مشفق امی جان سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی انھیں دائمی داغ فراق دینے کو تیار ہوگئیں۔

---

[1] رحمة للعالمين : 250/1 بحواله مدارج النبوة : 584/2، تهذيب تاريخ دمشق لابن عساكر : 124/7. [2] صحيح البخاري، المغازي، باب مرض النبي ﷺ ووفاته حديث: 4438.وصحيح مسلم، فضائل الصحابة ﷺ باب فضائل عائشة ام المؤمنين رضى الله عنها حديث: 2444.

سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا بستر علالت پر دراز تھیں، مرض زور پکڑ چکا تھا اور وہ ساعت قریب آ چکی تھی جس سے کسی کو مفر نہیں ہے، وفات سے ایک روز بیشتر اٹھیں، اپنے دست مبارک سے آٹا گوندھ کر پاس رکھ لیا اور فرزندان دلبند کے سر دھونے لگ گئیں، سیدنا علی کرم اللہ وجہہ تشریف لائے تو سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو مصروف دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ پوچھا: اے بضعۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہ کیا؟ کہ بیماری کے غلبہ سے تجھے اٹھنا دشوار تھا اور پھر فراق پدر میں تو شب و روز روتی رہتی اور سب کام چھوڑ بیٹھی تھی، لیکن آج خلاف معمول یہ کیا ہو رہا ہے؟ کہ آٹا پاس گوندھا پڑا ہے، بچوں کے کپڑے بھگو کر الگ رکھے ہیں اور ان کے بال بھی خود دھو رہی ہیں۔ بی بی زہرا رضی اللہ عنہا نے فرمایا: میں نے ابا جان صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا ہے کہ وہ مجھے اپنے پاس بلا رہے ہیں اور مجھے خوش خبری دی ہے کہ جلد ہی مجھ سے آملو گی۔ اس لیے خیال آیا کہ بچوں کے کپڑے اور بال دھو کر صاف کر لوں اور انھیں اپنے ہاتھ کی روٹی بھی کھلا جاؤں۔ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے بچوں کو نہلا دھلا کر ان کے بال سنوارے، کپڑے پہنائے اور روٹی پکا کر کھلائی اور فرمایا: واری جاؤں، ذرا مسجد نبوی تک ہو آؤ، اپنے لیے بھی دعا مانگو، میرے لیے بھی دعا کرو، دونوں شہزادے چلے گئے اور خاتون جنت بستر پر لیٹ گئیں، حالت ساعت بساعت خراب ہوتی گئی۔ اور دوسرے دن سچ مچ اپنے پیارے ابا جان علیہ السلام کے پاس پہنچ گئیں۔[1] اس وقت سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی عمر ساڑھے سات برس کی تھی۔ ان کو والدہ معظمہ رضی اللہ عنہا کی وفات کا سب سے زیادہ قلق ہوا، بچے ہی تو تھے، کہاں تک صبر کرتے، سخت گریہ زاری کی، مگر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے سمجھانے پر: ''بیٹا! اللہ تعالیٰ صابروں کو پسند کرتا ہے، بے صبروں کا ساتھی نہیں ہے۔ آخر صبر آ ہی گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُم بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴾

---

[1] مستدرك حاكم: 164،163/3.

''صبر کرنے والوں کو بغیر حساب کے پورا پورا اجر دیا جائے گا۔''[1]

ابا جان رضی اللہ عنہ کا ظلّ ہمایوں

دونوں مشفقوں، یعنی نانا جان اور امی جان کے انتقال پُر ملال کے بعد اب ''بے نانا'' اور ''بے ماں'' کا حسین رضی اللہ عنہ پدر بزرگ رضی اللہ عنہ کے سایہ عاطفت میں تھا، سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے توحید کے اس عظیم فرزند بننے والے بیٹے کی خوب پرورش کی، اس کو عمدہ تربیت دی، اس کی تعلیم وتدریس پر توجہ فرمائی، اس زمانے میں کالجوں اور یونیورسٹیوں اور مغربی طرز کے بڑے بڑے سکولوں کا رواج تو تھا نہیں، بچوں کو تعلیم گھر پر دی جاتی تھی، یا مسجد ومجلس میں، اس وقت علمی محفلیں منعقد ہوتی تھیں جن میں علوم دینیہ اور معرفت الٰہی کے موتی بکھیرے جاتے تھے، جناب حیدر کرّار کرم اللہ وجہہٗ بھی اپنی مجلس میں قرآن کریم اور حدیث شریف کا درس دیتے اور تشنگان کتاب وسنت کی علمی پیاس بجھاتے تھے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی اس درس میں شرکت فرماتے، کلام اللہ معظم کے رموز ومعارف سے بہرہ اندوز ہوتے، سماع حدیث کرتے اور مسائل واحکام شریعت کے حل عقد کے انداز سیکھتے۔

سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ مدرسہ نبوت کے سند یافتہ اور بچپن سے دنیا کے سب سے بڑے معلم کی شاگردی میں رہے تھے، اس لیے جس طرح وہ خود سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پابندی سے عمل فرماتے تھے اور جس طرح وہ خود قرآن وحدیث سے تمسک فرماتے تھے، اسی طرح دوسروں کو بھی مسلک نبوی پر چلنے کی تلقین کرتے اور اپنی اولاد اطہار کو بھی اسی طریق پر چلاتے تھے، چنانچہ حسین رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے والد محترم رضی اللہ عنہ سے کافی استفادہ کیا اور ہر ممکن فیض حاصل کیا۔

---

[1] الزمر 39:10.

روایت ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے فنون حرب میں خاص طور پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مشق بہم پہنچائی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ گھڑ سواری، تیر اندازی، تیغ زنی، مجاہدہ وغیرہ جیسے سپہ گری کے اصول و قواعد سیکھے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ جب کبھی آیات متعلقہ حکم جہاد تلاوت کرتے تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ ان سے جہاد کے طریقے دریافت کرتے، جنگ کے ڈھنگ پوچھتے۔ اور جب سیدنا علی رضی اللہ عنہ ان کو سمجھاتے کہ جہاد و قتال کے یہ دستور ہیں، تو پھر حسین رضی اللہ عنہ استدعا کرتے کہ مجھے عملی طور پر اس کی تربیت دی جائے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ ان کی درخواست پر انھیں جنگی مشقیں کراتے اور ان کو محاربات کی عملی تعلیم دیتے۔ حسین رضی اللہ عنہ کے اسی اشتیاق کا یہ نتیجہ تھا کہ وہ جہاد و قتال کے فنون و آداب میں ماہر کامل ہو گئے، جنگوں میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہمرکاب رہ کر دادِ شجاعت لی اور اکثر معرکوں میں فی سبیل اللہ لڑ کر نام پیدا کیا۔

باب : 2

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اور عہد صحابہ رضی اللہ عنہم

حضرات خلفائے ثلاثہ ابو بکر صدّیق، عمر فاروق اور عثمان غنی رضی اللہ عنہم پر مخالفین جو یہ الزام لگاتے ہیں کہ انھوں نے اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم کے حقوق ادا نہیں کیے اور سیدنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیتوں کے خلاف عمل کر کے آل رسول کو تکلیفیں پہنچاتے اور ان سے دشمنی کرتے رہے۔ یہ الزام سراسر غلط، بے بنیاد اور خانہ ساز ہے، اور محض رافضیت اور خارجیت کی نشوونما اور مخاصمتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کو ترقی دینے کے لیے گھڑا گیا ہے۔ ورنہ یہ حقیقت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رحلت فرمانے کے بعد اصحاب ثلاثہ رضی اللہ عنہم ممدوح نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن، حضور کی آل اطہار سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا، سیدنا علی رضی اللہ عنہ، سیدنا حسن رضی اللہ عنہ، سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی بہت زیادہ خدمت کی، ان کے حق کو سب پر مقدم سمجھا، ان کے معقول وظیفے متعین کیے اور ان کی فضیلت وفوقیت پر سر تسلیم خم کیے رکھا، پھر حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حسین رضی اللہ عنہ انھیں جان سے بھی زیادہ عزیز تھے اور وہ ان پر سب کچھ نچھاور کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ ہاں! اہل بیت رضی اللہ عنہم اور آل اطہار کی طرف سے جو مطالبہ حکم شریعت کے خلاف کیا جاتا ان کو آئین اسلام کی عائد کردہ رکاوٹوں کی وجہ سے نہیں مانتے تھے، مثلاً: سب سے بڑا الزام اصحاب ثلاثہ رضی اللہ عنہ پر دھرا جاتا ہے کہ انھوں نے باغ فدک اور دوسری املاک نبوی کو غصب کر لیا اور اس کا قبضہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو نہیں دیا۔

لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کیا صحابہ موصوف رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جاگیر پر خود قبضہ کر لیا تھا؟ یا انھوں نے بیچ کھائی تھی؟ نہیں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ بلکہ یہ املاک انھوں نے بیت المال کو دے دی اور اس کو قومی ملکیت بنا دیا تھا اور یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے بموجب کیا گیا:

«إِنَّا مَعْشَرُ الْأَنْبِيَاءِ لَا نَرِثُ وَلَا نُوْرَثُ مَا تَرَكْنَا فَهُوَ صَدَقَةٌ»

''ہم جو پیغمبروں کا گروہ ہیں ہم کوئی وراثت وغیرہ نہیں چھوڑتے، ہمارا جو ترکہ بھی ہوتا ہے وہ صدقہ وخیرات ہوتا ہے۔''[1]

اس ارشاد نبوی کے تحت ابوبکر، عمر، عثمان رضی اللہ عنہم نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ و فاطمہ رضی اللہ عنہا کا حق ملکیت تسلیم نہیں کیا، مگر پھر بھی سیدنا علی رضی اللہ عنہ مدت تک اس جاگیر سے فائدہ اٹھاتے رہے اور اس کی آمدنی استعمال میں لاتے رہے، اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو یہ دعا فرما گئے تھے:

«اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ رِزْقَ آلِ مُحَمَّدٍ قُوْتاً»

''اے اللہ! محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آل کو صرف اسی قدر روزی دینا، جس سے بس ان کی زندگی قائم رہ سکے۔''[2]

بتایئے! اس دعا کی موجودگی میں آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو جاگیروں، جائیدادوں، باغوں، زمینوں اور خطیر رقموں کی ضرورت ہی کیا تھی؟ وہ تو اللہ تعالیٰ کے پیارے اور اللہ سے لو لگانے والے تھے اور دنیا و علائق دنیا سے کوئی علاقہ نہ رکھتے تھے...... تاہم تاریخ کے اوراق الٹنے سے معلوم ہو جائے گا کہ اصحاب ثلاثہ رضی اللہ عنہم نے ان کو سب کچھ

---

[1] سنن نسائی فی الکبریٰ: 64/4، حدیث: 6309 واللفظ له، ومسند أحمد: 463/2.
[2] صحیح مسلم، الزهد، باب الدنیا سجن للمؤمن، حدیث: 7440.

دیا اور ان کی ضرورت اور احتیاج سے کہیں بڑھ کر دیا اور اپنے عزیزوں کو پیچھے ہٹا کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے عزیزوں کا زیادہ خیال رکھا۔ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اسی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا تھا: اللہ کی قسم! اپنے اقربا سے صلہ رحمی کی نسبت یہ بات مجھے کہیں زیادہ عزیز ہے کہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقربا سے صلہ رحمی کروں۔[1] ہم دیکھیں کہ تینوں خلفاء نے سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ کیونکہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ ہی اس وقت ہمارا موضوع سخن ہیں۔ اگر آپ خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم پر تفصیلی معلومات چاہتے ہوں تو ہماری کتاب "خلافتِ راشدہ" کا مطالعہ کیجیے جس میں متعدد جید علماء کے مقالات یکجا کر دیئے گئے ہیں۔ یہ اپنے موضوع پر بہترین اور قابل مطالعہ کتاب ہے۔

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اور ابو بکر صدّیق رضی اللہ عنہ

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا عہد خلافت گو بہت مختصر، یعنی کوئی سوا دو سال کے قریب رہا، مگر جتنا عرصہ بھی آپ زندہ رہے، اہل بیت رضی اللہ عنہم کا بہت خیال رکھتے تھے اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر تو آپ جان نچھاور کرتے تھے، سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ خود لوگوں کو تاکید فرماتے کہ ان کی عزت اور خدمت کرو، ان کا حق پہچانو، ان کو ضرورت سے زیادہ دو اور ان کو خوش رکھو۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ اکثر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس جاتے اور ان سے دینی و دنیوی فوائد حاصل کرتے، مسائل و احکام سیکھتے، امور ضروریہ سے واقفیت حاصل کرتے۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ فرمایا: اے حسین رضی اللہ عنہ! تم مجھے میری جان سے بھی زیادہ عزیز ہو، اس لیے کہ تم میرے آقائے نامدار کے نواسے اور میرے پیارے دوست علی مرتضی رضی اللہ عنہ کے فرزند اور جگر گوشہ رسول فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کے نور نظر ہو، تمھیں

---

[1] صحيح البخاري، المناقب، حديث: 3712

جس چیز کی ضرورت ہو، مجھ سے ضرورت پوری کرو اور بلا جھجک کہہ دیا کرو کہ فلاں شے کی طلب ہے، اگر مجھ سے نہ کہہ سکو تو اپنی نانی جان عائشہ رضی اللہ عنہا کو بتادیا کرو۔''[1]

حسین رضی اللہ عنہ دربار خلافت میں جاتے تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اٹھ کر ان کو سینے سے لگاتے اور پیشانی پر بوسہ دیتے، ایک دفعہ امام ممدوح رضی اللہ عنہ گئے تو آپ رضی اللہ عنہ نے چپکے سے انہیں کچھ رقم دی اور کہا: '' یہ اپنی والدہ ماجدہ (سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا) کے پاس لے جاؤ اور اس سے اپنی ضرورتیں پوری کرو۔''[2]

الغرض سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ خوش بھی رہے اور ان سے بہت کچھ سیکھتے بھی رہے اور گو حسین رضی اللہ عنہ ابھی بچے تھے، مگر صحبت صدّیقی نے ان کی صلاحیتوں میں چمک دمک پیدا کر دی۔

سیدنا حسین اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہما

سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے انتہائی مرتبہ شناس تھے اور تمام اہل بیت رضی اللہ عنہم کی قدر کرتے تھے۔ یہ دیکھیے ! جس عمر رضی اللہ عنہ کو آل نبی اور اہل بیت رضی اللہ عنہم کا بلکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دشمن تصور کیا جاتا ہے اور ایک حلقے میں ان کے خلاف دن رات منفی پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے، اس کا ایک واقعہ سن لیجیے، ایک دفعہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے کھیل رہے تھے، کھیلتے ہی کھیلتے دونوں میں رنجش ہوگئی، جیسا کہ بچے آپس میں جھگڑ پڑتے ہیں، حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے عبداللہ رضی اللہ عنہ سے کہا: '' ارے تو اس بات پر اِترا رہا ہے کہ تیرا باپ خلیفہ وقت ہے، مگر تو تو ہمارا غلام زادہ ہے، تیرا باپ ہمارے نانا کا غلام ہے اور میرے نانا جان صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت ہی اس کو خلافت ملی ہے۔'' یہ سن کر عبداللہ رضی اللہ عنہ روتے ہوئے اپنے باپ کے پاس گئے اور

---

① مآثر الآثار. ② تاریخ الخلفاء.

سارا ماجرا کہہ سنایا کہ حسین نے مجھے یہ یہ کہا ہے۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''کہاں ہیں حسین رضی اللہ عنہ؟ مجھے ان کے پاس لے چلو۔'' عبداللہ رضی اللہ عنہ آپ کو ان کے پاس لائے، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے بکمال شفقت کہا: ''اے فرزند رسول صلی اللہ علیہ وسلم! تو نے جو کچھ عبداللہ سے کہا ہے، وہی الفاظ میرے سامنے دہرا دے۔'' حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے جو کچھ عبداللہ سے کہا تھا، وہی عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے رُو برُو کہہ دیا۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بازو سے پکڑا اور روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر جا حاضر ہوئے۔ اور روضہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: ''اے حسین رضی اللہ عنہ! تجھے اللہ کی قسم! قیامت کے دن بھی اسی طرح گواہی دینا کہ عمر میرے نانا کا غلام ہے اور اس کی زندگی حبیب خدا کی غلامی میں گزری ہے۔'' یہ کہہ کر آپ رضی اللہ عنہ زار و قطار رونے لگے، آپ آنسو پونچھتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ عمر رضی اللہ عنہ کی اس سے بڑھ کر اور کیا سعادت ہو سکتی ہے کہ وہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اہل بیت رضی اللہ عنہم اور ان کی آل اطہار کا غلام کہلائے اور اس کو ان کی غلامی کی سند مل جائے۔[1]

اس سے اندازہ کیجیے کہ جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو سیدنا رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم، ان کی اولاد رضی اللہ عنہم اور ان کی آل رضی اللہ عنہم اور ان کے اہل بیت رضی اللہ عنہم سے کس قدر والہانہ محبت تھی؟

خلافت عمر رضی اللہ عنہ کے آغاز میں حسین رضی اللہ عنہ کی عمر یہی کوئی نو دس سال کے لگ بھگ تھی۔ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ تقریباً روزانہ ان کے پاس جاتے اور ان سے ضروری تعلیم و تربیت حاصل کرتے تھے، آپ ان کی مجلس میں بیٹھتے، ان سے فائدہ اٹھاتے، ان سے دینی و دنیوی رموز سیکھتے، شرعی معارف سے واقف ہوتے، خلافت کے نکات سمجھتے، حکمرانی کے طریقے اخذ کرتے، جہانبانی کے دستور دیکھتے اور آئین اسلام کا مطالعہ فرماتے۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی جب تک ان کو دیکھ نہ لیتے چین نہ پکڑتے، ایک بار سیدنا

[1] ''حسین رضی اللہ عنہ سب کا'' صفحہ:90.

حسین رضی اللہ عنہ دو چار دن آپ رضی اللہ عنہ کو نظر نہ آئے، ایک دن ملے تو پوچھا: ''اے حسین رضی اللہ عنہ! تم اتنے دن کہاں رہے......؟ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے کہا: یا امیر المومنین! میں فلاں وقت عبداللہ کے ساتھ حاضر ہوا تھا، مگر آپ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ خلوت میں گفتگو فرما رہے تھے، اس لیے ہم دونوں لوٹ گئے۔'' عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''واہ! تم نے آ جانا تھا، عبداللہ کی بات اور ہے، جو تمھارا مرتبہ ہے وہ اس کا نہیں ہو سکتا۔''[1]

ایک دفعہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ منبر پر خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ حسین رضی اللہ عنہ جو ابھی چھوٹے ہی تھے آئے اور آتے ہی کہنے لگے: یا امیر المومنین! میرے باپ (نانا) کے منبر سے اتر جائیے اور اپنے باپ کے منبر پر بیٹھیے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے مسکراتے ہوئے فرمایا: ''اے ریحانِ نبی! میرے باپ کا تو کوئی منبر نہیں، پھر اس پر بیٹھوں کیسے؟ اور یہ منبر تمھارے جدِّ محترم (نانا جان) نے ہی مجھے سونپ رکھا ہے، جس کی میں حفاظت کر رہا ہوں۔'' پھر آپ رضی اللہ عنہ نے ان کو اپنے پاس بٹھا لیا اور فارغ ہونے پر انھیں ساتھ گھر لے گئے۔[2]

نوٹ: یہ تینوں واقعات محض تاریخی حیثیت رکھتے ہیں جو فن حدیث کی نقد و جرح کے متحمل نہیں۔ انھیں اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ بعض مؤرخین نے انہیں بیان کیا ہے ورنہ ہمیں ان پر کوئی اصرار نہیں۔

پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی ان سے محبت اور قدر دانی کا ثبوت ایک اور واقعے سے بھی ملتا ہے، وہ یہ ہے کہ ایک دفعہ غنیمت کا مال آیا اور جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ اسے تقسیم کرنے بیٹھے، تو سیدنا حسن رضی اللہ عنہ اور حسین رضی اللہ عنہ کو آپ رضی اللہ عنہ نے پانچ ہزار درہم دیے اور اپنے بیٹے عبداللہ کو صرف ایک ہزار دیے۔ اس سے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ناراض ہو گئے، کہنے لگے: ''ابا جان! میں مہاجر ہوں، مقدّم الاسلام ہوں، خلیفۂ وقت کا بیٹا ہوں، میں زیادہ حق رکھتا ہوں۔'' عمر فاروق رضی اللہ عنہ تیوری چڑھا کر بولے: ''عبداللہ! جو تیرا حق تھا

---

[1] الإصابة: 333/1. [2] الإصابة: 333/1۔ وتاریخ بغداد: 141/1.

مل گیا، جو مرتبہ ان کا ہے وہ تیرا نہیں ہوسکتا، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے ہیں، علی رضی اللہ عنہ اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے لخت جگر ہیں۔ تو ان کے منصب کو کبھی نہیں پہنچ سکتا۔" اس پر عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ خاموش ہوگئے۔ [1]

اسی طرح ایک بار حاکم یمن نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں کچھ حُلے بھیجے، آپ رضی اللہ عنہ نے وہ لوگوں میں تقسیم کر دیے۔ جب آپ رضی اللہ عنہ تمام حُلے بانٹ چکے، تو حسن اور حسین رضی اللہ عنہما بھی تشریف لائے، انھیں دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا چہرہ متغیر ہوگیا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے حاضرین سے مخاطب ہو کر فرمایا: تم لوگوں کو حلے دے کر میں ذرا بھی خوش نہیں ہوا۔ کیونکہ حسن رضی اللہ عنہ اور حسین رضی اللہ عنہ کو کوئی حلہ نہیں دیا گیا۔ اور یہ اس لیے کہ جو حلے تقسیم کیے گئے ہیں وہ ان کے پہننے کے لائق نہ تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے حاکم یمن کو لکھا کہ اعلیٰ قسم کے دو حُلے جلد از جلد بھیج دیجیے۔ اس نے فوراً تعمیل حکم کی اور دو بہترین حلے بھیج دیے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے وہ حلے سیدنا حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کو پہنا دیے اور فرمایا:

"شکر ہے اس اللہ کا جس نے میرا دل ٹھنڈا کیا ہے۔" [2]

ان واقعات کو پڑھیے اور بار بار پڑھیے اور غور کیجیے کہ مخالفین، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر کس قدر غلط الزامات لگا رہے ہیں، حالانکہ عمر رضی اللہ عنہ وہ ہیں جنھوں نے آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل بیت رضی اللہ عنہم کا حق سب پر مقدم اور فائق رکھا اور ان کے بڑے بڑے وظیفے مقرر کیے، ان کو خطیر عطیے دیتے رہے، کثیر رقمیں عطا کرتے رہے، ان کا ادب و احترام بجا لاتے رہے اور جنھوں نے اپنے عزیز و اقارب کے حقوق کو ان کے حقوق کے مقابلے میں نظر انداز کر دیا۔

اگر پھر بھی یہ بہتان باندھا جائے کہ عمر (اللہ کی اس عظیم ہستی پر کروڑوں اربوں

---

[1] سیر أعلام النبلاء: 285/3. مختصراً "تذکرة الخواص" میں بھی اس کا ذکر ہے۔ [2] سیر أعلام النبلاء: 285/3، تاریخ کبیر جلد:4.

رضائیں نازل ہوں) نعوذ باللہ دشمن رسول، دشمن آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مخالف اہل بیت رضی اللہ عنہم تھا، تو سوائے اس سوچ پر افسوس کرنے اور ہدایت کی دعا دینے کے ہم کیا کر سکتے ہیں؟

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اور عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ خلافت فاروقی میں ہی عمر رُشد و بلوغ کو پہنچ چکے تھے اور سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد میں تو وہ بھر پور جوان تھے۔ عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے پیش روؤں کی طرح آل نبی اور اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم کے حقوق اور احترام کو ملحوظ رکھا، یوں بھی عثمان رضی اللہ عنہ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کے خالو تھے، آپ قرابتداری کے آداب وقواعد سے خوب واقف تھے اور ارشاد نبوی کے مطابق سب کو علیٰ قدر مراتب رکھتے، اور سب کا درجہ ومرتبہ جانتے پہچانتے تھے۔

ایک بار سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے منبر پر خطبہ دیتے وقت خود فرمایا کہ لوگو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے بعد غدیر خم کے مقام پر جو تقریر فرمائی تھی، اس کا ایک ایک لفظ یاد کرو اور اس کے ایک ایک حرف پر عمل کرو۔ ایک شخص نے کھڑے ہو کر دریافت کیا کہ یا امیر المومنین! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا تھا؟ آپ رضی اللہ عنہ نے کہا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

«يَأَيُّهَا النَّاسُ! فَإِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ يُوشِكُ أَنْ يَأْتِيَ رَسُولُ رَبِّي فَأُجِيبَ وَأَنَا تَارِكٌ فِيكُمْ ثَقَلَيْنِ: أَوَّلُهُمَا كِتَابُ اللّٰهِ فِيهِ الْهُدٰى وَالنُّورُ، فَخُذُوْا بِكِتَابِ اللّٰهِ وَاسْتَمْسِكُوْا بِهِ فَحَثَّ عَلٰى كِتَابِ اللّٰهِ وَرَغَّبَ فِيهِ، ثُمَّ وَأَهْلُ بَيْتِي أُذَكِّرُكُمُ اللّٰهَ فِي أَهْلِ بَيْتِي، أُذَكِّرُكُمُ اللّٰهَ فِي أَهْلِ بَيْتِي، أُذَكِّرُكُمُ اللّٰهَ فِي أَهْلِ بَيْتِي»

”خبردار اے لوگو! بیشک میں انسان ہوں، قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا

نمائندہ آئے تو میں اس کی دعوت کو قبول کروں، یعنی فوت ہو جاؤں۔ مسلمانو! میں تمھارے درمیان دو بھاری چیزیں چھوڑ چلا ہوں، ان میں سے ایک تو اللہ کی کتاب (قرآن مجید) ہے جس میں روشنی اور ہدایت ہے، سو اللہ کی کتاب کو خوب مضبوطی سے پکڑے رکھو اور اس کے ایک ایک حکم پر عمل کرو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو کتاب اللہ کی رغبت دلائی۔ دوسری چیز میرے اہل بیت رضی اللہ عنہم ہیں۔ میں ان کے بارے میں تمھیں اللہ تعالیٰ یاد دلاتا ہوں، میں اپنے اہل بیت کے بارے میں اللہ کی یاد دلاتا ہوں کہ ان کے حقوق و مراعات کا ہر ممکن خیال رکھا جائے۔''[1]

اس خطبے میں سیدنا حسن و حسین رضی اللہ عنہما بھی بیٹھے تھے، حدیث پڑھ کر عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے دونوں صاحبزادوں کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھتا ہے، اس کا فرض ہے کہ وہ ان سے بھی محبت رکھے اور ان کے درجات پہچانے۔''[2]

یہ واقعہ اس بات کا مظہر ہے کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ اہل بیت رضی اللہ عنہم کی عظمت سے خوب واقف تھے اور وصایائے نبوی پر کما حقہ عمل کرتے تھے۔ مخالفین ان پر جو اتہامات لگاتے ہیں بالکل بے سروپا اور قطعاً بے بنیاد ہیں۔ قرآن ان کی تائید کرتا ہے نہ حدیث، اور نہ حقائق و شواہد۔

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ بھی آپ سے بہت محبت کرتے تھے، جس کا ثبوت یہ ہے کہ باغیان خلافت نے جس وقت سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے مکان کا محاصرہ کیا تو سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے برادر معظم سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے ہمراہ باغیوں کو منتشر کرنے اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا خون بہانے سے روکنے کی کوشش کی۔ سیدنا علی کرّم اللہ وجہہ نے ان کو خاص طور پر عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی حفاظت پر مقرر کیا تھا اور اس بلوہ میں ایک تیر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو بھی

---

① صحیح مسلم، فضائل الصحابۃ، باب من فضائل علی بن أبی طالب، حدیث: 2408.

② سیرۃ الخلفاء، مطبوعہ مصر.

لگ گیا تھا، جس سے وہ شدید زخمی ہو گئے تھے۔

لیکن باغیوں نے حفاظتی حلقوں کو توڑ کر سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر میں داخل ہونا شروع کر دیا اور ان کو شہید کر کے اپنے اعمال نامے سیاہ کر لیے تو سیدنا حسن و حسین رضی اللہ عنہما شہادت کی خبر پاتے ہی اندر گئے۔ یہ دیکھ کر کہ عثمان رضی اللہ عنہ خون میں لت پت پڑے ہیں اور اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں، زار و قطار رونے لگے، پھر سیدنا علی رضی اللہ عنہ تشریف لائے، انھوں نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید دیکھ کر دونوں صاحبزادوں سے سخت باز پرس کی، انھوں نے کہا: ''ہم نے حفاظت کی بہت کوشش کی، مگر باغی زور دے کر اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے۔'' لیکن سیدنا علی رضی اللہ عنہ اس قدر مضطرب تھے کہ غصے میں حضرت حسین و حسن رضی اللہ عنہما کو سخت سُست کہا۔

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ مدت تک شہادت عثمان رضی اللہ عنہ پر کف افسوس ملتے رہے اور جب کسی مجلس میں بیٹھتے، تو رو رو کر سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے اوصاف بیان کرتے اور فرماتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس داماد نے آخر دم تک ہمارا خیال رکھا اور ہمارے حقوق کو زائل نہیں ہونے دیا۔''[1]

ایک دفعہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''عثمان رضی اللہ عنہ نے ہمیں سیراب کیا، اللہ ان کو سیراب کرے۔ عثمان رضی اللہ عنہ نے ہمیں اتنا دیا کہ ہم ہر چیز سے بے نیاز ہو گئے۔ عثمان رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیتوں کو بحسن و خوبی پورا کیا، وہ بڑی خوبیوں کے مالک تھے، میں ان کے فضائل کے علاوہ ان کے متعلق اور کچھ نہیں جانتا۔''

مطلب یہ کہ ان میں خوبیاں ہی خوبیاں تھیں۔

اللہ اللہ! حضرت حسین رضی اللہ عنہ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تعریف میں رطب اللسان ہیں، مگر افسوس کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے جھوٹے معتقد سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ پر سبّ و شتم کر رہے

---

① تاریخ الخلفاء سیوطی، ص: 159.

ہیں اور نیکی سمجھ کر کر رہے ہیں۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔ ایسے لوگوں کے لئے ہم سوائے ہدایت کے اور کیا دعا کر سکتے ہیں؟

حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور بیعت خلفاء رضی اللہ عنہم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں یہ قاعدہ تھا کہ کمسن بچے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کرتے تھے، چنانچہ سیدنا حسن اور حسین رضی اللہ عنہما نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ کی معیت میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی، اس وقت ان سب کی عمریں چھ سے آٹھ سال تک تھیں۔[1]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عہد خلافت میں بھی یہی دستور رہا، لیکن واضح رہے کہ بچوں کو بیعت پر مجبور نہیں کیا جاتا تھا، خصوصاً جو بچے پیدائشی مسلمان ہوتے تھے انھیں بیعت کرنا ضروری نہ تھا۔ ''کنز التواریخ'' کے مطابق حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے نانا جان صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کی، اس وقت ان کی عمر نو سال کے قریب تھی، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور چار اور لڑکے بھی بیعتِ صدّیقی میں شامل ہوئے۔

حضرت موصوف رضی اللہ عنہ نے گیارہ یا بارہ سال کی عمر میں سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے بیعت لیتے وقت فرمایا:

> ''بیعت ایک عہد ہے، جو محبت اور وفاداری کے لیے باندھا جاتا ہے، بیعت سے نہ کسی کا مرتبہ بڑا ہو جاتا ہے نہ گھٹ سکتا ہے۔''[2]

جب سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ مسند آرائے خلافت ہوئے تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے ان کی بھی بیعت کی۔ ایک انگریز مؤرخ مسٹر جی، بی کوکس اپنی کتاب ''ہسٹری آف اسلام''

---

① تهذیب تاریخ دمشق: 129/7، ابن عساکر۔ ② ''ہسٹری آف اسلام'' صفحہ: 241.

مطبوعہ آکسفورڈ پریس میں لکھتا ہے:

''جس وقت عثمان غنی رضی اللہ عنہ خلیفہ چنے گئے تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے والد علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور اپنے بڑے بھائی حسن رضی اللہ عنہ کے ساتھ ان کی بیعت کی اور یہ بیعت مسجد نبوی میں کی گئی۔''

اصحاب ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے مخالفوں کا یہ دعویٰ کہ'' سیدنا علی رضی اللہ عنہ خلیفہ بلا فصل تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علی رضی اللہ عنہ کے سوا کسی کو خلافت نہ دی تھی'' بے بنیاد ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور تاریخی کتابوں سے اس کا واضح ثبوت ملتا ہے کہ سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اپنے فرزندان گرامی سمیت تینوں خلفاء ابوبکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت کی تھی اور کسی اکراہ و مجبوری یا مصلحت وخوف اور تقیہ سے نہیں بلکہ برضا و رغبت کی تھی۔ (زیادہ تفصیل مطلوب ہو تو ہماری قابلِ مطالعہ کتاب ''خلافت راشدہ'' کا مطالعہ فرمائیں۔ ان شاء اللہ اس کے مطالعہ سے کافی الجھنیں دور ہو جائیں گی۔)

سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد جب سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے عنانِ خلافت سنبھالی تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے بھائی جان کے ساتھ ان کی بیعت بھی کی۔

محاربات میں شرکت

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اکثر محاربات میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہمرکاب رہے، سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں آپ ابھی بچے تھے۔اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں آپ رضی اللہ عنہ ہنوز سن رشد و بلوغت ہی کو پہنچے تھے، اس لیے ان کے وقت میں آپ رضی اللہ عنہ کا کسی جنگ میں شریک ہونا ثابت نہیں ہے۔

آپ رضی اللہ عنہ نے محاربات کا آغاز دور عثمانی میں کیا۔ سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ جہاں کہیں مجاہدین کے لشکر بھیجتے، سیدنا حسین رضی اللہ عنہ برابر ان میں شامل ہوتے اور میدان جہاد میں

دادِ شجاعت دیتے، چنانچہ عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ نے جو فوج افریقہ روانہ فرمائی، آپ رضی اللہ عنہ بھی اس میں شریک ہوئے اور افریقہ فتح ہونے تک دشمنوں سے لڑتے رہے۔

طرابلس میں رومیوں سے جو لڑائی ہوئی، حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اس میں بھی مقابلہ ومقاتلہ کیا اور رومی لشکر کو ہزیمت اٹھانا پڑی۔

سبیطلہ میں اس کے حاکم جرجیر کی ڈیڑھ لاکھ فوج سے جہاد کیا اور فتح مند ہوئے۔

قفصہ کی جنگ میں بھی تلوار کے جوہر دکھائے اور کامران رہے، بعد ازاں قلعہ اجم کے محاصرہ و یلغار میں بھی امام ممدوح رضی اللہ عنہ کا برابر حصہ تھا اور اس میں بھی آپ مظفر و منصور رہے۔

مشہور مؤرخ ابن خلدون کی روایت کے مطابق حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے بہت سی مغربی جنگوں میں پامردی سے جہاد فرمایا۔

30 ہجری میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے طبرستان پر لشکر کشی کی، حضرت موصوف اس میں بھی موجود تھے۔[1]

علاوہ بریں خراسان، قومس، نہاوند، جرجان، طمیسہ، بحیرہ، دہستان ایسی متعدد لڑائیوں میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے شرکت فرمائی، اور لطف یہ کہ جس جنگ میں بھی آپ رضی اللہ عنہ نے حصہ لیا، اس میں اللہ تعالیٰ نے اہل اسلام کو فتح و نصرت عطا فرمائی، یہ تمام فتوحات سیدنا عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے عہد مبارک میں ہوئیں۔

سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ اپنے والد معظم رضی اللہ عنہ کے شریک کار تھے اور ان کے ہمرکاب رہ کر جنگوں میں شامل ہوتے تھے، چنانچہ جنگِ جمل، جنگ صفین، جنگ خوارج میں اپنے والد گرامی کے ساتھ تھے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا زمانہ حکومت چونکہ خانہ جنگیوں میں گزرا ہے، اس لیے دشمنان دین کے ساتھ جہاد

---

[1] الکامل لابن الأثیر: 3/84.

کرنے کا انھیں کم موقع ملا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے شش ماہہ دور خلافت میں بھی امیر معاویہ رضی اللہ عنہ ہی سے لڑائی ہوتی رہی اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ اپنے بھائی کی طرف سے لشکر میں جاتے اور فوج معاویہ رضی اللہ عنہ سے لڑتے رہے۔[1]

الغرض حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے مجاہدانہ کارنامے سنہری الفاظ میں ثبت کرنے کے قابل ہیں۔ ثبت کرنے کے قابل کیوں نہ ہوں آپ رضی اللہ عنہ شجاع ابن شجاع تھے۔ بہادر باپ کے بہادر فرزند تھے۔ اسی بنا پر ہر مجادلہ و محاربہ میں اپنی قابلیت کے وہ جوہر دکھاتے کہ اللہ اللہ! البتہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے وقتوں میں جو خانہ جنگیاں ہوئی ہیں تاریخ کا یہ خونیں باب بہت پُر حیف اور تاسّف انگیز ہے۔ اسلام کے مخالفوں اور منافقوں نے سازشیں کرا کر اسلامی لشکروں کی لڑائیوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ جنگِ جمل میں ہزار ہا مسلمان تہ تیغ ہوئے۔ اور جنگِ صفّین میں کتنے ہی مسلمان مارے گئے۔ دونوں فریقوں کے لیڈر حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ، جھکنے اور صلح کرنے پر آمادہ ہوتے اور اپنے دل میں مسلمانوں کی ناحق خونریزی کا احساس رکھتے مگر اسلام کو ضعف پہنچانے والے شریر لوگ بڑے مکر سے دونوں کو پھر بھڑکاتے اور ان کے دلوں میں عداوت ڈال دیتے، سوچا جائے تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے اسباب انھی شیطان طبیعت اور فتنہ انگیز انسانوں نے پیدا کیے تھے جو سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو ساری عمر لڑاتے رہے اور اس لڑائی سے کئی قسم کے سیاسی فوائد حاصل کرتے رہے۔

---

① سیر الصحابة: 149/4.

نوٹ: قرونِ اولیٰ کی لڑائیاں بعض فکری اور اجتہادی غلطیوں کی بنا پر ٹھن جاتی تھیں، انھیں اسلام اور کفر کی جنگیں کہنا صحیح نہیں کیونکہ دونوں طرف نیک اور مخلص مسلمان ہی ہوتے تھے۔ خلوص نیت کی بنا پر اجتہادی خطائیں معاف ہو جاتی ہیں ان کا مؤاخذہ نہیں ہوتا۔

باب : 3

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے فضائل ومناقب

درحقیقت یہی وہ باب ہے جو حسین بن علی رضی اللہ عنہما کی زندگی کی روح ہے۔ جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ حضرت موصوف اخلاق وتہذیب، علم و دانش، فہم و ذکاء، شجاعت و بسالت، خدمت وتواضع، صبر وقناعت، حلم ورفق، عفو وکرم، جود وسخا میں کیا عادات و خصائل رکھتے تھے، ان کا تفقُّہ فی الدّین کیسا تھا، وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ومتابعت کتنی کرتے، اور کیونکر کرتے تھے، ان کی عبادت وریاضت کیسی تھی......، اور ان میں کیا سپرٹ اور کون سی روح کارفرما تھی جس کی بدولت انھیں عظمت نصیب ہوئی اور جوانانِ جنت کی سرداری ملی، اس وقت تک ان کے درجہ ومرتبہ کو پہچانا نہیں جاسکتا، ان کے اعمال صالحہ اور بلند کرداری کو اجاگر نہیں کیا جاسکتا اور ان کی شہادت کو تفوّق وتفضّل حاصل نہیں ہوسکتا۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر لکھی گئی اکثر کتب ہائے سیرت میں اول تو ان باتوں کا فقدان ہے اور اگر آپ رضی اللہ عنہ کے فضائل وخصائل پر کچھ لکھا بھی گیا ہے، تو وہ حقائق سے دور اور مبالغہ سے بھرپور ہے۔ اور ایسی روایتیں درج کردی گئی ہیں جن کا مذہب سے کوئی تعلق ہے نہ عقل انسانی سے کوئی واسطہ...... اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے صحیح فضائل اوراعلیٰ عادات واطوار سے قارئین کو روشناس کرایا جائے، تاکہ وہ اپنے عالی مقام قائد ومحسن کو بہترین اور حقیقی کیریکٹر میں دیکھ سکیں اور ان کی پیروی سے دنیا اور اپنی عاقبت سنوار سکیں۔

❁ صحیح بخاری، مناقب الحسنین رضی اللہ عنہما میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث ہے:

«قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: إِنَّهُمَا رَيْحَانَتَايَ مِنَ الدُّنْيَا»

’’نبی ﷺ نے فرمایا: حسن اور حسین دنیا میں میرے دو پھول ہیں......‘‘ (رضی اللہ عنہما) [1]

اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما چمنستان رسالت کے وہ عطر بیز اور خوشنما پھول ہیں جو اپنی حیثیت اور شان میں یگانہ شان کے حامل ہیں۔

❁ صحیح حدیث میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

«مَن سَرَّهُ أَنْ يَنْظُرَ إِلٰى رَجُلٍ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ فَلْيَنْظُرْ إِلَى الْحُسَيْنِ»

’’جو کسی جنتی کو دیکھنا چاہتا ہے تو وہ حسین کو دیکھ لے۔‘‘ (رضی اللہ عنہ) [2]

❁ ایک مرتبہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کعبۃ اللہ میں تھے۔ انھوں نے وہاں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو دیکھا تو فرمایا:

’’یہ اس وقت آسمان والوں کے ہاں سب زمین والوں سے زیادہ محبوب ہیں۔‘‘ [3]

خلاصہ کلام یہ کہ آپ رضی اللہ عنہ آسمان علم وفضل کے درخشندہ ستارے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ کو عزت واحترام اور عقیدت ومحبت کی نگاہ سے دیکھنا ہر صاحبِ ایمان کے لیے ضروری ہے۔

❁ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، ہم نے ایک روز آنحضرت ﷺ کو بہت مسرور دیکھا۔ ہم نے خوشی کا سبب پوچھا، تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَتَانِي جِبْرِيلُ فَبَشَّرَنِي أَنَّ حَسَنًا وَحُسَيْنًا سَيِّدَا شَبَابِ أَهْلِ

---

[1] صحيح البخاري، المناقب، حديث: 3753. [2] یہ حدیث متعدد کتب میں آئی ہے، مثلاً: مجمع الزوائد: 192/9، مسند أبي يعلىٰ: 397/3، حديث: 1874، المسند بتحقيق الاثرى: 348/2، حديث: 1868، صحيح موارد الظمان إلى زوائد ابن حبّان: 368/2، فضائل الصحابة للامام احمد بن حنبل: 973/2، سلسلة الاحاديث الصحيحة: 1732/7، حديث: 4003 جملہ محدثین کرام رحمہم اللہ نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ [3] سير أعلام النبلاء: 285/3، ترجمة الحسين الشهيد.

الْجَنَّةِ وَأَبُوهُمَا أَفْضَلُ مِنْهُمَا.

"جبرائیل علیہ السلام ابھی میرے پاس آئے ہیں اور انھوں نے مجھے بشارت دی ہے کہ بیشک حسن و حسین (رضی اللہ عنہما) نوجوانانِ جنت کے سردار ہیں اور ان کا باپ (علی رضی اللہ عنہ) ان سے بھی افضل ہے۔"[1]

✽ حضرت یعلیٰ بن مُرّہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«حُسَيْنٌ مِنِّي وَأَنَا مِنَ الْحُسَيْنِ أَحَبَّ اللّٰهُ مَنْ أَحَبَّ حُسَيْنًا»

"حسین مجھ سے ہے اور میں حسین سے ہوں۔ اللہ تعالیٰ اسے محبوب جانے جو حسین سے محبت کرے۔"[2]

اللہ تعالیٰ تمام اہل اسلام کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے سچی اور دائمی محبت عطا فرمائے۔ آمین۔

قرآن کریم سے محبت

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کتاب اللہ سے بے حد محبت رکھتے اور اس کی والہانہ محبت میں سرشار رہتے تھے۔ چھوٹی ہی عمر میں قرآن پاک حفظ فرما لیا تھا۔ جب اپنے محترم نانا جان صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبتوں میں تھے تو جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نئی آیات نازل ہونے کی اطلاع صحابہ رضی اللہ عنہم کو دیتے اور ان کو سناتے یا لکھواتے تو سیدنا حسین رضی اللہ عنہ بھی غور سے کلام اللہ کو سنتے رہتے، پھر جب ذرا سن شعور کو پہنچے اور سمجھنے، جاننے، پہچاننے کی قوت آئی تو آپ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے آیات مقدسہ سن کر ان کو پوپلے منہ اور توتلی زبان سے دہرانے کی کوشش کرتے اور بعض چھوٹی چھوٹی آیتیں انھیں یاد بھی ہو جاتیں۔

جب سن شریف پانچ برس کا ہوا، تو کتاب اللہ کو سبقاً پڑھنے لگے، با قاعدہ درس

[1] کنز العمال: 108/7. [2] جامع الترمذی، حدیث: 3775.

میں بیٹھنے لگے۔ یہ بھی روایت ہے کہ کبھی کبھی آپ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس بھی جاتے اوران سے بھی سبق لیتے تھے،[1] کیونکہ عورتوں اور بچوں کو پڑھانا انھی کے سپرد تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال پُرملال کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم اور خصوصاً جامع القرآن سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ ان کے استاد بنے۔ لکھا ہے کہ حسین رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سماع حدیث کرتے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے قرآن کا درس لیتے، یہی سبب تھا جو آپ کے دل میں کلام الٰہی کی بے پناہ وارفتگی پیدا ہوئی۔ دن رات تلاوت میں لگے رہتے، نماز سے فارغ ہو کر ایک دو منزل یا کم وبیش قرآن ضرور پڑھتے، ٹھہر ٹھہر کر سمجھ کر غور وفکر کر کے پڑھتے، ایک ایک آیت پر وقفہ کرتے اور اس کے رموز ومعارف کی گہرائیوں میں پہنچنے کی کوشش فرماتے۔

امام ممدوح رضی اللہ عنہ کی زندگی قرآن مجید کی اطاعت میں گزری۔ آپ رضی اللہ عنہ نہ صرف خود اس پر عمل کرتے بلکہ دوسروں سے بھی عمل کراتے اور تلقین فرماتے کہ کتاب اللہ کے تمسّک کے بغیر کسی کا ایمان کامل اور دین مضبوط نہیں ہو سکتا۔

ایک بار فرمایا: ''لوگو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو یاد کرو، جو بار بار فرمائے گئے ہیں کہ ضلالت سے وہی شخص بچ سکتا ہے جو اللہ کے کلام اور سنت رسول پر تعامل رکھے اور اس کو مضبوطی سے پکڑے۔''

سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت

خداوند کریم نے اپنی کتاب حکیم میں ہر مسلمان کو حکم دیا ہے:

﴿ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ ﴾

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم جس کام اور جس بات کے کرنے کا تمھیں حکم دیں، اس پر عمل کرو۔

اور جس سے تم کو منع کریں فوراً رک جاؤ۔‘‘[1]

اس ارشاد الٰہی کی موجودگی میں یہ کیونکر ممکن تھا کہ جس حسین رضی اللہ عنہ کو حبر الامۃ بننا تھا، جس حسین رضی اللہ عنہ کو دربار نبوت سے سید شباب اہل الجنۃ[1] کا خطاب ملا تھا۔ اور جو حسین رضی اللہ عنہ گلستان رسالت کا ایک خوشنما اور خوشبودار پھول تھا، وہ اپنے پاک نانا صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک قدموں پر قدم نہ رکھتا، ان کے ایک ایک عمل ایک ایک ادا کی پیروی نہ کرتا اور اپنے قلب اطہر میں ان کی سنت کا دیپ روشن نہ رکھتا؟ وہ جس طرح شمع نبوت کا پروانہ تھا اسی طرح سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی دیوانہ تھا اور جس طرح نانا جان صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھے بغیر چین نہ پاتا تھا اسی طرح ان کے ہر فعل کی اتباع اور ہر حکم کی اطاعت کیے بغیر قرار نہ پکڑتا تھا۔

یہ درست ہے کہ حسین رضی اللہ عنہ کو صرف سات برس کی عمر تک سردار دو جہاں کے تلمذ میں رہنا نصیب ہوا، مگر ہونہار اور دانا و زیرک بچے کا دماغ ایک آئینے کی مانند ہوتا ہے، وہ جو کچھ کسی کو کرتے دیکھتا ہے، اس کی تصویر اس کے دماغ میں کھنچ جاتی ہے۔ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اپنے معصوم زمانہ طفلی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کام کرتے دیکھتے، ذہن پر نقش ہو جاتا۔ جو بات ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سن پاتے، حافظہ اسے عمر بھر کے لیے محفوظ کر لیتا۔ اور کتابوں سے ثابت ہے کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بابرکت زندگی میں ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عالی اخلاق اور پیارے طریق پر چلنے لگ گئے تھے، وضو کرتے تو سنت کے مطابق، نماز پڑھتے تو مسنون طریقے سے، مسائل بیان کرتے تو حدیث کے موافق، جواب دیتے تو ایسا جچا تلا معقول و مدلّل کہ اس میں ارشادات نبوی کی جھلک نمایاں طور موجود ہوتی تھی، جد محترم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جن بزرگوں سے تربیت پانے کا موقع ملا، وہ خود سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وارفتہ اور قرآن و

---

[1] سورۃ الحشر، آیت: 8.

حدیث کے دیوانے تھے۔ اماں جان بضعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھیں۔ اور ہر کام میں اپنے مقدس باپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری پوری پیروی کرتی تھیں۔ ابا جان داماد رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے جو بمطابق حدیث «بمنزلة هارون من موسٰی»[1] تھے۔ ان کا ایک ایک کردار دین و دنیا کے سردار صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال واطوار سے مطابقت رکھتا تھا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ، عثمان رضی اللہ عنہ اور علی رضی اللہ عنہ وہ عظیم وافضل امت تھے کہ ان کی زندگیاں احیائے سنت اور بقائے حدیث کے لیے وقف تھیں۔ ان کا تو یہ حال تھا کہ اپنے محبوب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے سانس کے ساتھ سانس لیتے تھے، کیا مجال جو سنت کے خلاف ذرا بھی ادھر سے ادھر ہوں۔ اور اسی محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم، اسی جنون سنت کی بدولت حضور ختمی رسالت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چاروں۔ اور آگے ان کے عین نقشِ پا پر قدم رکھنے والے بلند بخت خلفاء کے متعلق فرمایا:

«عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَ سُنَّةِ الْخُلَفَآءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ»

''لوگو! میری اور میرے خلفائے راشدین ومہدیین کی سنت پر چلو۔''[2]

اور یہ اس لیے فرمایا کہ خلفائے اربعہ رضی اللہ عنہم کا طریق کار اور مسلک بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا طریق و مسلک ہے، کیونکہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے مطیع وفرمانبردار اور سچے دوست تھے۔

پس غور کیجیے، جب حسین رضی اللہ عنہ کو ایسے فداکاران حدیث وسنت اتالیق ملے، تو پھر وہ خود کیوں نہ عامل سنت اور حامل حدیث ہوں گے؟ یقیناً ان کی پوری زندگی کتاب و سنت کے سانچے میں ڈھل چکی تھی، لکھا ہے کہ ایک مرتبہ کسی شخص نے مسجد نبوی میں نماز پڑھی مگر وہ سنت کے مطابق نہ تھی، سیدنا حسین رضی اللہ عنہ دیکھ رہے تھے، جب وہ شخص نماز سے فارغ ہوا تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''بھائی! اب میں تجھے نماز دہرانے کا حکم نہیں

[1] جامع الترمذي، المناقب، باب مناقب ابي محمد الحسن بن علي رضي الله عنه، حديث: 3768. [2] صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4416.

دیتا۔ مگر یہ ضرور کہتا ہوں کہ آئندہ اس طریقے سے نماز پڑھا کرو جس طریقے سے رسول اللہ ﷺ پڑھا کرتے تھے۔ اور یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب مبین میں فرماتا ہے:

﴿ وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝﴾

''مسلمانو! نماز پڑھو اور زکوٰۃ ادا کرو اور رسول اللہ (ﷺ) کی فرمانبرداری کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔''[1]

اے دوست! اس آیت سے معلوم ہو جاتا ہے کہ جب تک رسول اللہ ﷺ کی سنت پر عمل نہ کیا جائے، نہ کسی کی نماز قبول ہوتی ہے، نہ زکوٰۃ، اور نہ اس پر رحم کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ایسا شخص رحم کا حق دار ہی نہیں ہوتا۔ اور رسول اللہ ﷺ کا بھی یہی ارشاد ہے کہ خلاف سنت عمل کرنے والے شخص کا کوئی صالح سے صالح عمل' کوئی نیک سے نیک کام بھی قبول نہیں ہوتا، حتیٰ کہ اس کی نماز اس کا روزہ، اس کی زکوٰۃ' اس کا حج بھی منظور نہیں کیا جاتا، تاوقت یہ کہ سچے دل سے نبی کریم ﷺ کی اور آپ ﷺ کی سنت شریفہ کی دل کی خوشی سے متابعت نہ کرے۔''

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی یہ نصیحت سن کر وہ شخص معذرت خواہ ہوا اور عہد کیا کہ آئندہ مسنون طریقے سے نماز پڑھا کرے گا اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کو مضبوطی سے پکڑ کر رکھے گا۔'' جو لوگ اپنے الگ الگ طریقے پر نمازیں ادا کرتے ہیں انھیں بھی نمازِ نبوی کو اپنانا چاہیے۔ آخر وہ نمازِ نبوی کیوں نہیں اپناتے؟ کیا وہ مفقود ہو گئی ہے؟ یا اس میں کوئی شک وشبہ ہے؟ یا اپنی سستی ہے۔ آخر کوئی تو وجہ ہے؟

اسی ایک واقعہ سے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی اطاعت سنت کا روشن ثبوت مل جاتا ہے، ایک موقع پر آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''جو رسول اللہ ﷺ کی سنت پر عمل نہیں کرتا وہ حضور ﷺ سے محبت بھی نہیں

---

[1] سورۃ النور' 24: 56.

رکھتا۔“[1]

اسی طرح ایک دفعہ کچھ لوگوں نے روزہ افطار کرنے میں دیر لگائی تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”اے لوگو! اللہ کا خوف کرو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر چلو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ روزہ کھولنے میں جلدی کرو اور سحری کھانے میں دیر کرو، مگر تم اس کے برعکس کر رہے ہو۔“

ایک بار سیدنا علی رضی اللہ عنہ کہیں باہر تشریف لے گئے تھے، حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے جمعہ کا خطبہ دیا اور اس میں سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع پر زور دیتے ہوئے کہا: ”چونکہ خود سنت نبوی کا پابند ہوں اور ہمارے گھر کے تمام افراد کتاب و سنت پر ہی عمل کرتے ہیں، اس لیے میں کسی کام کو دیکھ کر جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہ ہو، خاموش نہیں رہ سکتا، میں ہر اس شخص سے لڑوں گا جو دین میں بدعتیں نکالے گا، جو محدثات کو ایجاد کرے گا جو سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خلاف ورزی کرے گا، ایسا شخص مردود ہے، مردود ہے، مردود ہے۔ اور میرے نانا محترم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر لعنت کی ہے۔“

درسِ قرآن وحدیث

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو چونکہ اپنے والد معظم رضی اللہ عنہ کی طرح خانہ جنگیوں کے دفاع سے بہت کم فرصت ملی ہے، اس لیے آپ رضی اللہ عنہ باقاعدگی کے ساتھ قرآن و حدیث کا درس نہیں دے سکے، والد بزرگوار کی زندگی میں آپ رضی اللہ عنہ مختلف مہمات میں مصروف رہے، سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت میں بھی ان کا ساتھ دینا پڑا۔ اور ان کے بعد تو حالات میں ہی انقلاب آ گیا، تاہم تاریخ اسلام کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ جب بھی آپ کو دوسرے امور مہمہ سے فرصت ملتی تھی تو آپ مسجد نبوی میں، مسجد دمشق میں،

[1] الصریح

یا بعض دوسرے مقامات پر درس دیا کرتے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ کا درس بڑا فاضلانہ ہوتا تھا۔

ایک دفعہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کی خدمت میں قاصد بھیجا، اس نے دریافت کیا کہ حسین رضی اللہ عنہ کہاں ہوں گے اور ان کی مجلس کی کیا علامت ہوگی......؟ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تم مسجد نبوی میں چلے جانا، وہاں ایک ایسی خاموش جماعت ہوگی جس کے سکوت کی وجہ سے پرندے ان کے سروں پر بیٹھے ہوں گے، وہی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی مجلس ہوگی، اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہ آدھی پنڈلی تک لنگی باندھے ہوئے ہوں گے۔''[1]

مطلب یہ تھا کہ حسین رضی اللہ عنہ اپنی مجلس میں علم وعرفان کے ایسے گوہر لٹاتے ہیں کہ کسی کو بولنے کی جرأت ہی نہیں ہوتی اور جس طرح پرندے کسی خاموش فضا کو پسند کرتے

---

① مرد کو شلوار، پاجامہ، پتلون، تہمد وغیرہ ٹخنے سے اوپر رکھنے کا حکم ہے۔ تکبر سے ہو یا بغیر تکبر کے دونوں صورتوں میں ٹخنوں سے نیچے رکھنا منع ہے۔ یہ حکم استحبابی نہیں بلکہ وجوب کا درجہ رکھتا ہے۔ اس موضوع پر درجن کے لگ بھگ احادیث صحیحہ موجود ہیں۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ واہل بیت رضی اللہ عنہم کا اسی پر عمل تھا۔ اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو اس سنت ثابتہ پر عمل کی توفیق مرحمت فرمائے۔ لیکن سنت پر عمل وہی کرے گا جسے سنت کا صحیح مقام معلوم ہوگا۔ اور سنت کا صحیح مقام، وہی جانے گا جسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام بلند سے آگاہی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سچی عقیدت ومحبت ہو۔

نوٹ: صحابہ اور اہل بیت رضی اللہ عنہم بلاشبہ دونوں یک جان دو قالب تھے، دونوں ایک ہی چراغ کے پرتو تھے، جس طرح دونوں ایک تھے اسی طرح دونوں کے عقائد ونظریات بھی ایک تھے۔ ان میں ذرا فرق نہ تھا، دونوں قرآن وسنت کے حامل و عامل تھے۔ دونوں توحید وسنت کے والہ وشیداء اور شرک و بدعت سے متنفر و بیزار تھے، آج بھی جو لوگ اسی نظریے کے پیروکار ہیں، حقیقت میں وہی لوگ صحابہ رضی اللہ عنہم و اہل بیت رضی اللہ عنہم کے پیروکار ہیں، ہمیں دونوں کے ساتھ ایک سا رشتۂ عقیدت ومحبت استوار کرنا چاہیے۔ جس طرح کسی ایک گروہ سے محبت، دوسرے سے محبت کے مترادف ہے، اسی طرح کسی ایک گروہ سے نفرت دوسرے سے نفرت کے ہم معنی ہے۔ اہلسنت کے نزدیک دونوں سے عقیدت ومحبت ضروری ہے۔ کسی ایک سے عقیدت ومحبت اور دوسرے سے نفرت وبغض رکھنا ایسا کفر ونفاق (کفر اور اندر کا کھوٹ) ہے جس سے ایمان تباہ اور اعمال برباد ہو جاتے ہیں۔

ہیں، ایسی ہی خاموشی ان کی جماعت میں پائی جاتی ہے۔[1] دینی محافل ومجالس میں یہی کیفیت ہر مؤمن ومسلم کی ہونی چاہیے۔

''تذکرۃ الشہادۃ'' میں مذکور ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک بار کچھ تحفے تحائف حضرت موصوف رضی اللہ عنہ کی خدمت میں بھیجے۔ جب کارندہ واپس آ گیا، تو امیر ممدوح رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''حسین رضی اللہ عنہ تجھے کہاں ملے تھے؟'' اس نے کہا: ''مسجد میں۔'' پھر دریافت کیا: ''وہ کیا کر رہے تھے......؟'' اس نے جواب دیا: ''وہ لوگوں کو قرآن کریم اور حدیث نبوی کی تشریح بتا رہے تھے۔'' یہ سن کر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے دونوں ہاتھ خوشی سے ہلائے اور فرمایا: ''واللہ! حسین رضی اللہ عنہ کو قرآن وحدیث کا بے پناہ شوق ہے۔'' (دعا ہے اللہ تعالیٰ یہ شوق آپ رضی اللہ عنہ کے ماننے والوں کو بھی عطا فرمائے۔ آمین)

امام ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''حضرت حسین رضی اللہ عنہ جہاں کہیں تشریف لے جاتے تو لوگ جوق در جوق ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور آپ رضی اللہ عنہ کی پاکیزہ مجلس کا اشتیاق ظاہر کرتے۔ کہ اے ابن رسول صلی اللہ علیہ وسلم! ہمیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول برحق کے ارشادات سے مستفید فرمائیے، حضرت حسین رضی اللہ عنہ ان کی درخواست قبول فرماتے اور لوگوں کو کلام اللہ اور کلام نبی صلی اللہ علیہ وسلم سناتے۔''[2]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ ایک اور جگہ لکھتے ہیں: ''جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے مدینہ منورہ سے منتقل ہو کر مکہ معظمہ میں اقامت فرمائی تو لوگوں کا ہجوم ان کے پاس آتا، آپ رضی اللہ عنہ ان کو علوم دینیہ سے مستفیض فرماتے اور لوگ جو کچھ آپ رضی اللہ عنہ سے سنتے اس سے نفع اٹھاتے اور اس کو یاد رکھتے۔''[3]

ایک اور مؤرخ رقمطراز ہے: ''مدینہ میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ جس گھر میں رہتے تھے

---

[1] سیر الصحابة : 231/4 بحوالہ''ابن عساکر''. [2] البداية والنهاية : 2/8. [3] البداية والنهاية : 2/8.

اس کا نام ''دار فاطمہ رضی اللہ عنہا'' تھا، کبھی کبھی آپ رضی اللہ عنہ اس مکان کے صحن یا دیوان خانے میں بھی مجلس منعقد کرتے اور اس میں لوگوں کو قرآن کریم اور حدیث شریف پڑھاتے تھے۔''

ایک اور سیرت نگار رقمطراز ہے: ''حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے والد ماجد کی زندگی میں ہی درس دینا شروع کر دیا تھا اور ان کی عدم موجودگی میں آپ رضی اللہ عنہ خطبہ بھی دیا کرتے تھے۔''

زہد وعبادت

سیدنا حسین ابن علی رضی اللہ عنہ اس خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے تھے جن کی پنڈلیاں نماز میں سوج جاتی تھیں، جن کے پاؤں میں اللہ کی بندگی سے ورم ہو جاتے تھے اور جو ساری ساری رات دربار الٰہی میں کھڑے کھڑے گزار دیتے تھے، پس یہ لازمی تھا کہ حسین رضی اللہ عنہ بھی عبادت وریاضت میں اپنے نانا محترم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتے اور ذکر الٰہی میں مصروف رہ کر راتوں کو حیات تازہ بخشتے۔ آپ رضی اللہ عنہ فی الواقع عابد اور شب زندہ دار تھے۔ عبادت گزاری کا بے حد شوق رکھتے تھے، نماز فجر، نماز عشاء اور نماز تہجد میں بہت آہ وزاری کرتے۔ اللہ تعالیٰ کے خوف سے کانپتے اور تضرع وعاجزی سے بار بار دعائیں مانگتے تھے۔

آپ رضی اللہ عنہ کی عادت مبارکہ تھی کہ جب کوئی مصیبت یا مشکل پیش آتی تو فوراً نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے، بکثرت نوافل پڑھتے اور اچانک آنے والے مصائب سے محفوظ رہنے کے لیے خداوند قدوس کی بارگاہ میں دعا اور درخواست کرتے۔ ایک دفعہ آپ رضی اللہ عنہ کسی سخت مصیبت میں محصور ہو گئے تو اسی وقت نماز میں مصروف ہو گئے۔ خشوع وخضوع سے نوافل ادا کیے اور بارگاہ الٰہی میں روتے اور دعا مانگتے رہے، جس سے رحیم وکریم مولا نے آپ رضی اللہ عنہ کی مصیبت دور کر دی، اسی طرح کسی اور مشکل کے

وقت آپ رضی اللہ عنہ نے خاصی رات نوافل وادعیہ میں گزار دی اور اللہ مشکل کشا نے اس مشکل کو حل فرما دیا۔

بعض اوقات آپ رضی اللہ عنہ نماز عشاء کے بعد بہت کم سوتے تھے، پھر پچھلی رات اٹھ کر نفل وتہجد میں رات کا بقیہ حصہ گزار دیتے اور فجر پڑھ کر تلاوت قرآن کرتے، پھر تھوڑی دیر کے لیے سو جاتے۔[1]

غالی گروہ نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی عبادت کے باب میں بھی غلو سے کام لیا ہے۔ یہ گروہ کہتا ہے کہ امام موصوف رضی اللہ عنہ روزانہ ایک ہزار رکعتیں پڑھتے تھے اور پوری پوری رات عبادت میں گزار دیتے تھے، اب ذرا رہوار عقل کو چابک لگایئے اور حساب کیجیے کہ اگر ایک رکعت کے لیے کم از کم ایک منٹ بھی خرچ کیا جائے تو ایک ہزار منٹ کے پونے سترہ گھنٹے ہوئے اور اگر یہ رکعتیں ٹھہر ٹھہر کر مزے لے لے کر خشوع وخضوع سے پڑھی جائیں تو پھر اس وقت کو کم از کم دوگنا کر لیجیے اور اس حساب سے ایک ہزار رکعتیں پڑھنے کے لیے 34 گھنٹے درکار ہیں۔ لیکن دن رات میں 24 گھنٹے ہیں، اب ان میں دس گھنٹے کہاں سے شامل کیے جائیں گے؟ سچ کہا ہے داناؤں نے ''کہ نقل را عقل باید'' یعنی کوئی قصہ نقل کرنے اور کوئی بول بولنے کے لیے بھی عقل کی ضرورت ہوتی ہے، پھر بعید از قیاس روایتیں تو اغیار کے لیے مزید تضحیک وتمسخر کا سامان مہیا کرتی ہیں اور اس قسم کی باطل روایات سے دشمنوں کو حرف گیری کا موقع مل جاتا ہے بلکہ سچ پر سے بھی اعتماد اٹھ جاتا ہے۔

اس سلسلے میں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ حضور سرور کائنات علیہ التحیۃ والسلام جیسے عظیم ترین عابد پہلے کبھی پیدا ہوئے ہیں اور نہ آئندہ کبھی ہوں گے۔ آپ ﷺ بھی ساری رات عبادت الٰہی میں نہیں گزارتے تھے۔ آپ ﷺ نماز پڑھتے بھی تھے اور سوتے بھی تھے۔ پھر نماز بھی ایسی لطف اٹھا اٹھا کر کیف وسرور میں ڈوب کر مزے لے لے کر اور

---

[1] سیر الصحابۃ: 230/4.

بہت ہی سجے سجے پڑھتے تھے کہ دیکھنے والے حیران رہ جاتے تھے۔ اگر آپ ﷺ کی عبادت کی جھلک دیکھنی ہو تو ہماری کتاب ''رہبر کامل ﷺ'' کا مطالعہ فرمایئے۔[1] حضور انور ﷺ تو ایک ایک رکعت میں کافی وقت لگا دیتے تھے اور کئی لمبی لمبی سورتیں پڑھ دیتے تھے اور اس ارشاد باری تعالیٰ کے مطابق: ﴿ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيلًا ﴾ ''اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھیے''[2] بہت ہی ٹھہر ٹھہر کر تلاوت کرتے تھے اور اس کے

---

① حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ''میں نہیں جانتی کہ نبی ﷺ نے کبھی ایک رات میں پورا قرآن پڑھا ہو یا پوری رات صبح تک عبادت کی ہو۔'' (دیکھیے: صحيح مسلم،صلاة المسافرين، باب جامع صلاة الليل،حديث: 746) اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے کبھی ساری رات عبادت نہیں کی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''اگر تم رسول اللہ ﷺ کو رات کی نماز پڑھتے دیکھنا چاہو تو دیکھ سکتے ہو۔ اور اگر نیند کرتے دیکھنا چاہو تو بھی دیکھ سکتے ہو۔'' (صحيح البخاري،التهجد، باب قيام النبي ﷺ بالليل من نومه، حديث: 1141) اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ رات کو سوتے بھی تھے اور جاگ کر عبادت بھی کرتے تھے، جیسا کہ آپ ﷺ نے ان تین آدمیوں سے فرمایا تھا، جنھوں نے اپنی عبادت کو کم خیال کیا تھا، آپ ﷺ نے ان کے اطمینان کے لئے فرمایا: «أُصَلِّيْ وَأَرْقُدُ» یعنی میں (رات کو) عبادت بھی کرتا ہوں اور سوتا بھی ہوں۔'' (دیکھیے: صحيح البخاري، النكاح، باب الترغيب في النكاح، حديث: 5063، وصحيح مسلم، النكاح: باب، استحباب النكاح لمن تاقت نفسه، حديث: 1401. علاوہ ازیں عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کو بھی آپ نے ساری رات قیام سے، داؤد علیہ السلام کی مثال دے کر منع فرمایا تھا۔(صحيح البخاري، الصوم، باب حق الجسم في الصوم، حديث: 1131و1975، وصحيح مسلم، الصوم، باب النهي عن صوم الدهر، حديث: 1159) جب سنت رسول ﷺ عبادت میں بھی اعتدال ہی کی ٹھہری، تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ جو آپ ﷺ کی سنت کے انتہائی پابند تھے، عبادت جیسے اہم امر میں سنت نبوی سے کیونکر آگے جا سکتے تھے؟ سنت سے عمل زیادہ دکھانے سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی تعریف نہیں بلکہ تنقیص ہوتی ہے۔ ایسی مبالغہ آرائیوں سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اللہ ہمیں قرآن وحدیث سے مسائل سیکھنے کا جذبہ وشوق اور اس پر وسیع نظر عطا فرمائے اور ہر مسئلے کو قرآن وسنت کی روشنی میں سمجھنے کی ہمت دے۔ آمین۔ ② سورة المزمل آیت: 4.

ساتھ ساتھ کثیر العبادت ہونے کے باوجود آنحضرت دین ودنیا کے دوسرے تمام کام بھی سرانجام دیتے تھے اور روزمرہ کے پروگراموں میں بھی وقت کے نہایت پابند تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر ایک نماز وقت پر ادا کرتے، وقت پر اوراد و وظائف میں مصروف ہوتے، وقت پر مجلسیں لگاتے، وقت پر درس دیتے، وقت پر امور دینیہ میں غور فرماتے، وقت پر دنیوی فرائض پر توجہ دیتے، وقت پر جہادی قافلے روانہ فرماتے۔ اب کوئی یہ کہہ دے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت نوافل ہی ادا کرتے رہتے تھے اور دوسرے کاموں سے کوئی واسطہ نہ رکھتے تھے تو یہ بات کیونکر مانی جا سکتی ہے؟ اور اس میں کون سی تعریف پائی جاتی ہے......؟ کسی بزرگ کی مبالغہ آمیز اور جھوٹی تعریف کرنے اور آسمان وزمین کے قلابے ملانے سے اس کی اصل پوزیشن بھی متاثر ہو جاتی ہے۔ اس سے آدمی کا گراف بلند نہیں ہوتا بلکہ گر جاتا ہے اور صحیح بات سے بھی اعتقاد اٹھ جاتا ہے۔ مگر افسوس، ہمارے بہت سے دوست ان حقیقت طرازیوں کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے اور بے سند قصوں اور مبالغہ آمیز باتوں کو پسند کرتے ہیں۔

حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مطہرہ کے مطابق حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی اپنے وقت پر مصروف عبادت ہوتے تھے، بے شک آپ بڑے عابد و زاہد تھے مگر یہ تو عام عقل سے بھی بعید ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ ہر وقت نفل نماز میں ہی منہمک رہتے تھے اور دوسرے امور پر دھیان نہ دیتے تھے، پھر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی زندگی تو بہت ہی مصروف زندگی تھی۔ متعدد مہمات اور بے شمار دینی، ملکی، قومی اور سیاسی، تنازعات میں آپ رضی اللہ عنہ کو حصہ لینا اور شریک ہونا پڑتا تھا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت سے لے کر اپنی شہادت تک آپ رضی اللہ عنہ انتہائی مصروف رہے۔ ملک میں خانہ جنگیوں نے سر اٹھا رکھا تھا۔ گردونواح میں اعدائے اسلام اور شرپسندوں نے دین کو گزند پہنچانے اور اس کا حلیہ بگاڑنے کے لیے سازشیں کر رکھی تھیں۔ ان سب مجادلات میں آپ رضی اللہ عنہ کا شرکت کرنا

از بس ضروری تھا، ان مصروفیات کی موجودگی میں یہ کیسے ممکن تھا کہ آپ رضی اللہ عنہ ہر روز ایک ایک ہزار رکعتیں ادا کرتے؟ حالانکہ اتنی رکعتیں تو کوئی فارغ شخص بھی نہیں ادا کرسکتا۔ ہمیں اس سے انکار نہیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ اپنے والد گرامی اور اپنے بھائی جان حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی طرح بڑے عبادت گزار اور شب زندہ دار تھے جیسا کہ پیچھے بتا چکے ہیں، مگر یہ بھی تو صحیح نہیں جو غالی قسم کے لوگ اپنے پاس سے گھڑ گھڑ کر بتاتے ہیں۔

ہاں! حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی وسعت قلبی اور پاک دلی دیکھیے اور یہ آپ رضی اللہ عنہ کی بہت بڑی فضیلت ہے کہ آپ اپنے شدید ترین مخالفوں کے پیچھے بھی نماز پڑھ لیتے تھے۔ مروان بن حکم جو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے حاکم مقرر تھا، جب کبھی نماز پڑھاتا تو باوجود یہ کہ وہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے اختلاف کیا کرتا تھا۔[1] آپ رضی اللہ عنہ اس کی اقتداء میں نماز ادا کرلیا کرتے تھے اور نماز کو دہراتے بھی نہیں تھے جیسا کہ آج کل بعض لوگ کر لیتے ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ کا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھنا بھی ثابت ہے، اس لیے کہ آپ خوب سمجھتے تھے کہ ذاتی اختلاف یا رنجش اور چیز ہے۔ ذاتی رنجش کی بنا پر مخالف کی اقتداء ترک نہیں کی جاسکتی۔ دین اسلام میں تو ایسی نفرتوں کی گنجائش ہی نہیں ہے کیونکہ بنیادی طور پر سب ہم عقیدہ اور ہم مسلک ہیں۔ اگر نہیں ہیں تو ہونا چاہیے...... سبحان اللہ! کیسی بے مثال فراخ دلی ہے۔ کیا حسینی اور کربلائی وغیرہ کہلانے والے دوست اِدھر بھی کچھ توجہ دیں گے؟ (اللہ دلوں میں نرمی پیدا کرے۔ آمین)

شیعہ سنی کی ایک دوسرے کی اقتداء تو رہنے دیجیے اب حال یہ ہے کہ خود سنی فرقے ایک دوسرے کی اقتداء میں نماز پڑھنے سے گریز کرتے ہیں۔ اور نوبت بہ ایں جا رسید کہ

---

[1] مروان بن حکم کے بارے میں بھی تاریخ میں متضاد اقوال ملتے ہیں۔ جن کی روشنی میں حتمی رائے قائم کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

مقلد اپنے جیسے مقلد کے پیچھے نماز ادا کرنے سے ہچکچاتے ہیں۔ حالانکہ تقلید کا بڑا فلسفہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی ''برکت'' سے تنازعات ختم ہو جاتے اور اللہ کی خوشنودی نصیب ہو جاتی ہے۔ مگر تقلید بھی انھیں یکجا نہ کر سکی اللہ کرے سب مسلمان حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی طرح وسیع الظرف اور روادار بن جائیں۔ آمین۔ کیا ہم آپ رضی اللہ عنہ کے نام لیواؤں سے یہ توقع رکھ سکتے ہیں؟

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے بہت سے حج کیے اور وہ بھی گاہے سوار ہو کر اور گاہے پیدل چل کر۔ لوگ آپ کے ساتھ ہوتے اور آپ کی سواری کا اونٹ کھینچتے ہوئے لے جاتے، آپ عموماً مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ پا پیادہ حج کے لیے جاتے تھے، کسی نے پوچھا: ''حضرت! آپ سوار ہو کر کیوں تشریف نہیں لے جاتے۔'' آپ نے صرف اتنا جواب دیا کہ پاؤں سے چل کر حج کرنے میں زیادہ لطف آتا اور زیادہ ثواب ملتا ہے کیونکہ اس میں زیادہ مشقت برداشت کرنا پڑتی ہے۔ اور سنت سے اس کا ثبوت بھی ہے۔[1]

یوں بھی آپ رضی اللہ عنہ مکہ شریف جاتے، حرم پاک کا طواف کرتے، حجر اسود کا

---

[1] طبراني في الكبير: 115/3، مختصراً بسند منقطع، الاستيعاب: 382/1.

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بوڑھے شخص کو اپنے بیٹوں کے سہارے چلتے دیکھ کر پوچھا کہ اسے کیا ہوا ہے؟ تو لوگوں نے عرض کیا کہ اس نے پیدل کعبہ کو جانے کی نذر مانی ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ اس بات سے بے پروا ہے کہ یہ اپنے آپ کو تکلیف دے۔ اور اسے سوار ہونے کا حکم دیا۔ اسی طرح عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی بہن نے بھی پیدل حج کی نذر مانی تھی تو پوچھنے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''وہ پیدل بھی چلے اور سوار بھی ہو۔'' دونوں روایتوں کے لیے دیکھیے: صحيح البخاري، جزاء الصيد، باب من نذر المشي إلى الكعبة، حديث: 1866،1865 و صحيح مسلم، النذر، باب من نذر أن يمشي إلى الكعبة، حديث: 1642/ 164. ہاں، اگر پیدل چلنے کی طاقت نہیں تو پیدل چلنا اور اپنے آپ کو خواہ مخواہ ہلاکت میں ڈالنا بھی درست نہیں۔ غرض سنت کی کسی صورت مخالفت نہیں کرنی چاہیے۔

بوسہ لیتے اور کعبہ شریف میں نماز پڑھتے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے کئی بار عمرہ بھی کیا ہے، غرض آپ رضی اللہ عنہ زہد وعبادت میں بڑا اونچا مقام رکھتے تھے۔ اللہ کرے آپ رضی اللہ عنہ کے عقید تمند اگر زیادہ عبادت نہیں تو کم از کم پانچوں نمازوں ہی کے عادی بن جائیں۔ آمین!

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اور روایت حدیث

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بیان کی ہیں مگر آپ رضی اللہ عنہ قلیل الروایت ہیں، یعنی آپ زیادہ احادیث روایت نہیں کر سکے۔ اور اس سے آپ رضی اللہ عنہ کی عظمت وفضیلت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ کیونکہ اور بھی بڑے بڑے صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں جن سے زیادہ احادیث مروی نہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ کے زیادہ احادیث روایت نہ کرنے کی دو وجوہات معلوم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ آپ رضی اللہ عنہ ابھی کمسن ہی تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ظلِ عاطفت آپ رضی اللہ عنہ کے سر سے اٹھ گیا۔ دوسری یہ کہ کثیر مصروفیات کے باعث آپ رضی اللہ عنہ کو روایت حدیث کا موقع نہ ملا۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے والد بزرگوار سیدنا علی رضی اللہ عنہ، اپنی والدہ ماجدہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا، اور اپنے ماموں ہند بن ابو ہالہ رضی اللہ عنہ (جو سیدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے پہلے شوہر سے تھے) اور سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے حدیثیں روایت کی ہیں۔[1]

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ سے حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما، زین العابدین رحمہ اللہ، فاطمہ صغریٰ بنت حضرت حسین رضی اللہ عنہ، سکینہ بنت حسین، باقر، عکرمہ، شعبی، کرز تیمی اور شیبان دولی رحمہم اللہ جیسے اصحاب نے سماع حدیث بھی کیا اور روایتیں بھی کی ہیں۔[2]

عالی مقام حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے بعض حدیثیں بلا انقطاع و بلا سلسلہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی روایت فرمائیں۔

---

① الاصابۃ:332/1. ② الاصابۃ:332/1

یہاں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ صرف دو حدیثیں بطور نمونہ درج کی جاتی ہیں۔ پہلی حدیث توحید الٰہی کے بارے میں ہے، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے فرزند ارجمند سیدنا علی زین العابدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ایک مرتبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضے کی زیارت کے لیے حاضر ہوا تو کیا دیکھتا ہوں، ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے پاس کھڑا ہو کر کوئی دعا مانگ رہا ہے میں نے اُسے منع کیا اور کہا: میں تجھے ایک ایسی حدیث سناتا ہوں جس کو میں نے اپنے والد معظم حسین رضی اللہ عنہ سے سنا ہے اور انھوں نے اپنے والد بزرگ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے اس کو روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے لوگو! تم میری قبر کو وثن (بت) اور اپنے گھروں کو قبرستان نہ بنا لینا اور مجھ پر درود پڑھتے رہنا، تم جہاں سے بھی مجھ پر درود بھیجو گے، مجھے پہنچ جائے گا۔''

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے دور حاضر کے معتقدین سن لیں کہ مذکورہ حدیث کے راوی حسین بن علی رضی اللہ عنہما ہیں، حضرت زین العابدین رحمہ اللہ نے اس زائر کی کوئی ایسی خلاف شرع حرکت دیکھی ہوگی اور وہ کوئی ایسی دعا روضہ اطہر پر مانگ رہا ہوگا جس کی اسلام نے اجازت نہیں دی، اس لیے اس کو روکنا پڑا۔ اور اس کے سامنے یہ حدیث بیان کرنے کی ضرورت پیش آئی، اس سے امام اور اہل بیت رضی اللہ عنہم اور ''پنجتن پاک رضی اللہ عنہم'' کے جعلی ارادت مندوں کو سبق لینا چاہیے جو کہ کربلائے معلّٰی جا کر امام ممدوح رضی اللہ عنہ کے روضے پر سجدے کرتے اور مرادیں مانگتے ہیں اور اگر وہاں نہ جا سکیں تو وہاں کی مٹی جو ٹکڑوں میں ملتی ہے لا کر بوقت سجدہ اس پر پیشانی ٹکاتے ہیں۔ لیکن یاد رکھیے ایسے جملہ امور خود ساختہ ہونے کے علاوہ شرک و بدعت کے ذیل میں آتے ہیں ان سے بچنا چاہیے۔

دوسری حدیث یہ ہے کہ سیدنا عکرمہ کہتے ہیں کہ ایک بار میں عرفات میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ ٹھہرا تو اس وقت میں نے رمی جمرہ تک ان کو «لبيك اللّٰهم لبيك» کہتے ہوئے سنا۔ میں نے پوچھا: '' اے سبط رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ بہت زیادہ

لبیک کیوں کہتے ہیں؟'' حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''میں نے اپنے والد ماجد علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ وہ اسی طرح کرتے تھے اور انھوں نے مجھے بتایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمی جمرہ تک لبیک کہتے چلے جاتے تھے، پس میں بھی اپنے نانا جان صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں اس پر عمل کر رہا ہوں۔''[1]

اللہ اکبر! اس روایت سے کتنا ثبوت ملتا ہے ان بزرگوں کی اطاعت کا سنت اور حب نبوی کا...... ان کا ہر قدم پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم پر پڑتا تھا اور ان کا کوئی عمل اپنے ہادی و مرسل صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار کے خلاف نہ ہوتا تھا۔

کاش! حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی محبت کے دعویداران کے اعمال حسنہ کو دیکھیں اور ان کی پوری پوری پیروی کریں۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں ابھی بچہ ہی تھا مگر مجھے اچھی طرح یاد ہے، میرے نانا جان صلی اللہ علیہ وسلم اہل مجلس سے فرمایا کرتے تھے:

''لوگو! جو کچھ مجھ سے سنتے ہو اس کو خود بھی یاد رکھو اور دوسروں تک بھی پہنچاؤ۔''

پھر میں نے اپنے والد گرامی سے سنا، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں تاکید فرمائی ہے کہ کوئی حدیث ضائع نہ ہونے پائے، اس وقت میرے دل میں امنگ پیدا ہوئی کہ میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں یاد رکھوں۔

لیکن آج سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو ماننے والے کافی لوگ ایسے ہیں کہ حدیثوں پر چلنا تو رہا ایک طرف، ان سے انکار و اغماض کر کے گناہ گار بن رہے ہیں۔ انا للہ......! اور مزید تعجب خیز بات یہ ہے کہ انھوں نے ارشاداتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ ائمہ کرام رحمہم اللہ کے اقوال کو اپنا رکھا ہے اور انھیں احادیث کا درجہ دے رکھا ہے، حالانکہ امتی اپنی عظمت و جلالت کے باوجود آخر امتی ہی ہوتا ہے، اس کی بات اور فعل میں وہ وزن اور ثقاہت

[1] کتاب التوحید: 198، 200 بحوالہ ''المختارۃ'' ورواہ ابویعلیٰ فی مسندہ: 1/361-362-469.

نہیں ہوتی جو حضرت رسول کریم ﷺ کے ارشاد گرامی میں ہوتی ہے۔ حق بات یہی ہے جسے ڈنکے کی چوٹ کہا جاسکتا ہے کہ جناب پیغمبر ﷺ کا ہم رتبہ اور ہم پلہ کوئی ہوا ہے نہ ہوسکتا ہے۔

مآثر

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے بعض مواقع پر رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور دیگر بزرگان دین کے حالات و واقعات پر بھی روشنی ڈالی ہے جس سے ان حضرات کے عادات و اطوار، فضائل و خصائل، مکارم و محاسن معلوم کرنے میں بہت مدد ملتی ہے، آپ رضی اللہ عنہ جناب نبی کریم ﷺ کے متعلق فرماتے ہیں:

''میں نے اپنے والد بزرگوار سے ایک دفعہ پوچھا کہ جناب رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب کے ساتھ کس طرح رہتے اور ان سے کیا سلوک کرتے تھے؟ انھوں نے فرمایا: ''رسول اللہ ﷺ کا برتاؤ اپنے اصحاب اور عام لوگوں کے ساتھ بہت اچھا تھا، وہ سب سے کشادہ پیشانی اور نرم مزاجی سے پیش آتے تھے، کبھی سختی اور سنگ دلی نہ دکھاتے تھے، چلاّ کر کرخت آواز سے گفتگو نہ فرماتے تھے، کوئی فحش بات زبان مبارک سے کبھی نہیں سنی گئی اور نہ کسی کی عیب جوئی یا غیبت کرتے دیکھا گیا، بخل اور تنگ دلی سے دور رہتے بلکہ نفرت کرتے تھے۔ بہت بے نیاز تھے۔ جس چیز کی طلب نہ ہوتی اس کی خواہش کبھی نہ کرتے۔ مگر دوسروں کو مایوس اور نا امید رکھنا برا سمجھتے۔ لڑائی جھگڑے اور نقصان دہ باتوں سے الگ رہتے۔ کسی کا پردہ نہ کھولتے۔ لوگوں کی پوشیدہ باتوں کی ٹوہ لگانے اور ان کے مخفی حالات کو تلاش کرنے کو عیب تصور کرتے اور ہمیشہ وہی بات کہتے جو اجر و ثواب کا موجب ہوتی۔ حضور ﷺ جس وقت گفتگو فرماتے تو جملہ اصحاب و حاضرین سر جھکائے رکھتے اور لوگ ایسی خاموشی اختیار کرتے جیسے ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں۔ جب آپ ﷺ گفتگو مکمل فرمالیتے تو لوگ عرض و

معروض کرنے لگتے، لیکن سب لوگ ایک ہی بار شور مچا کر نہ بول پڑتے۔ بلکہ ان کا طریقہ یہ تھا کہ ایک شخص اپنی بات ختم کر لیتا تو دوسرا شروع کر دیتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب و احترام کو ہر وقت ملحوظ رکھا جاتا۔ جس بات پر سب آدمی متعجب ہوتے، مسکراتے یا ہنسنے لگتے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس بات پر تعجب یا خوشی کا اظہار فرماتے، اگر کوئی اجنبی شخص کسی بات پر غلطی کر جاتا تو حاضرین آپس میں اشارے کرتے اور ایک دوسرے کو خفیہ طور پر ٹٹولتے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم چشم پوشی فرماتے اور لوگوں کو کسی کی غلطی پر ناجائز اور شرمسار کرنے والی حرکات سے منع کرتے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نصیحت کرتے کہ کسی کو سوال کرتے دیکھو تو اس کی ضرورت پوری کرو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی شخص کی بات نہیں کاٹتے تھے۔ ہاں کسی کی بات غلط اور ناجائز ہوتی تو اس کو نرمی سے ٹوکتے اور روکتے۔ اگر کسی مجلس میں ناپسند باتیں سنتے تو وہاں سے چلے جاتے۔''[1]

حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے مندرجہ بالا ارشاد سے بہت سی معلومات حاصل ہوتی ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک سیرت کے متعدد پہلو نمایاں ہوتے ہیں، نیز یہ بھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم کس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ادب و احترام سے بیٹھتے، کس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و تکریم کرتے اور کس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو تعلیم و تربیت دیتے تھے۔ یہی وہ مآثر ہیں جن سے تاریخ اسلام زندہ، اسلاف کا نام پائندہ اور بزرگوں کا کام تابندہ ہے۔

اب ذرا دیکھئے! حضرت حسین رضی اللہ عنہ کبار صحابہ رضی اللہ عنہم کی نسبت کیا ارشاد فرماتے ہیں؟ حجاز کا سیرت نگار ابن سلام لکھتا ہے:

''کسی عراقی نے حسین بن علی رضی اللہ عنہما سے خلفائے اربعہ رضی اللہ عنہم کے متعلق سوال کیا تو حضرت موصوف رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میری رائے میں اگر یہ چاروں اصحاب نہ ہوتے تو

---

[1] شمائل ترمذی، باب ماجاء فی خلق رسول اللہ ﷺ، حدیث: 9.

تجھے اسلام ایسی ترقی یافتہ صورت میں جلوہ گر نظر نہ آتا جس طرح نظر آ رہا ہے۔ اور حق یہی ہے کہ ابو بکر صدیق، عمر فاروق، عثمان غنی، اور علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہم کی مساعی مشکور ہوئیں۔ ان بزرگوں نے کمال جدو جہد سے دین قیم کو زندگی بخشی اور اپنی حیات عزیز کو تبلیغ و جہاد کے لیے وقف کیے رکھا۔ وہ سب ایک سے ایک بہتر تھے، کسی کا درجہ گھٹانا اور کسی کا مرتبہ بڑھانا میرے نزدیک دین کو ضعف پہنچانے کے مترادف ہے۔''

حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے عاشقانہ اور والہانہ محبت رکھنے کا دعویٰ کرنے والے احباب آپ رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد کو پڑھیں اور سوچیں کہ آپ رضی اللہ عنہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان میں کیا فرما رہے ہیں اور اس کے برعکس وہ اصحابِ ثلاثہ (یعنی حضرت ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم) کی کس طرح تحقیر کر رہے ہیں۔ یعنی حضرت حسین رضی اللہ عنہ جن کی توقیر فرماتے ہیں ان کے نام نہاد غلام ان کی تحقیر کرتے ہیں اور دم بھرتے ہیں حسین رضی اللہ عنہ کی محبت کا...... انا للہ!

تفقّہ فی الدّین

لغات عرب و اصطلاح اسلام میں تفقہ کے معنی اپنی رائے، قیاس اور اجتہاد سے کوئی مسئلہ یا کوئی بات گھڑ لینا نہیں ہیں بلکہ اس کے معنی ہیں دین میں سوجھ بوجھ رکھنا اور مسائل دینیہ شرعیہ کو قرآن کریم اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں حل کرنا یا سمجھنا۔ اور فقہ اس چیز کا نام ہے جو اللہ کی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے مطابقت و مماثلت رکھتی ہو۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ یہی تفقہ اور یہی فقہ رکھتے تھے۔ جب کوئی مشکل اور پیچیدہ مسئلہ آپ رضی اللہ عنہ کے سامنے آ جاتا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرح آپ رضی اللہ عنہ اس کو کلام الٰہی کی رہنمائی میں حل کرتے یا حدیث و سنت کی مدد لیتے۔

ہاں! ازبس کہ آپ رضی اللہ عنہ اعلیٰ درجے کے صاحب فہم و عقل تھے، ذکاوت و ذہانت بلا کی رکھتے تھے، اس لیے کسی عقدے اور کسی مسئلے کی تہ تک پہنچنے اور شریعت کے بحرِ زخار

کی غواصی کرنے میں آپ رضی اللہ عنہ کو زیادہ دیر نہ لگتی تھی، فوراً دماغ کی صلاحیتیں الجھی ہوئی گتھی کو سلجھا دیتی تھیں۔

''کتاب الارشاد'' میں الشیخ مفید جیسا شیعہ مؤرخ اور سوانح نگار لکھتا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور آپ کی اولاد میں علوم دین، قرآن، حدیث، آثار، سیرت اور آداب وغیرہ اپنے آباؤ اجداد سے سلسلہ بہ سلسلہ پہنچے۔ ان میں امام جعفر رحمہ اللہ وہ بزرگ ہیں جن سے تابعین اور نامور فقہاء رحمہم اللہ نے استفادہ کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ حضرات سادات نے کوئی نئی فقہ تیار نہیں کی، تمام اہل بیت رضی اللہ عنہم کتاب اللہ اور سنت نبوی کے پابند تھے اور ان دونوں ہی کو مشعل راہ سمجھتے تھے، پھر ان کی اولاد نے بھی عالی جناب حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کے مسلک کو اختیار کیا، کیونکہ یہ دونوں بزرگ صحابہ و اہل بیت رضی اللہ عنہم کی طرح قرآن و حدیث سے پورا پورا تمسک رکھتے تھے۔''

فریدی لکھتے ہیں: ''حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے تفقہ کا یہ حال ہے کہ جونہی ان کے سامنے کوئی مسئلہ پیش کیا جاتا، آپ رضی اللہ عنہ اس کو قرآن عظیم سے معلوم کرتے۔ اگر نہ ملتا تو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں دیکھتے۔ اگر پھر بھی کامیابی نہ ہوتی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے آثار، اقوال اور قضایا سے تلاش فرماتے۔''

ابو رشید نے لکھا ہے: ''حضرت حسین رضی اللہ عنہ امور دینیہ میں اپنی رائے کے اظہار اور قیاس و اجتہاد کے استعمال سے بہت اجتناب کرتے تھے۔''

یہی سیرت نگار لکھتا ہے: ''حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی زندگی میں کوئی نظیر ایسی نہیں ملتی کہ انھوں نے کوئی فیصلہ یا کوئی فتویٰ کتاب و سنت کے خلاف دیا ہو۔''

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ چونکہ فقیہ تھے، اس لیے کبھی فتویٰ بھی دیا کرتے تھے مگر فتاویٰ کا کوئی مجموعہ نہ تو انھوں نے تیار کیا نہ کوئی موجود ہے۔ اگر ہے تو جعلی اور من گھڑت ہے جس میں بے سر و پا مسائل، خلاف شرع احکام و امور درج ہیں، اسی طرح فقہ حسینی، فقہ

زیدی، فقہ اسماعیلی، فقہ امامیہ، فقہ حیدری، فقہ عابدی، فقہ جعفری، فقہ باقری، فقہ حسنی، فقہ قاسمی، فقہ کربلائی جیسی جو فقہی کتابیں بازار میں ملتی ہیں وہ سب یار لوگوں کی تصنیف کردہ اور فقہ محمدیہ کے مخالف ہیں، جبکہ بزرگانِ دین شریعت محمدیہ کے خلاف نہیں فرما سکتے۔ اگر بالفرض کسی بزرگ کا کوئی قول قرآن وسنت سے متصادم ہو تو اس قول کو قرآن وسنت کے مطابق کیا جائے گا۔ یہی ان بزرگوں کا صحیح ادب واحترام ہے اور یہی درست اور احوط (زیادہ محتاط) راستہ ہے۔ اور جو شخص اس کے الٹ راستے پر گامزن ہوا۔ فَقَدْ ضَلَّ وَغَوىٰ. ''تحقیق وہ گمراہ ہوا اور بھٹک گیا۔''

علم وعرفان

حضرت حسین رضی اللہ عنہ علوم الٰہیہ ونبویہ میں جو بلند مرتبہ رکھتے تھے اس کی تفصیل بعض مواقع پر دی جا چکی ہے، یہاں صرف یہ لکھ دینا کافی ہے کہ جس ہستی نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تربیت حاصل کی ہو، جس کو ابوبکر صدیق، عمر فاروق، عثمان ذوالنورین اور علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہم نے تعلیم دی ہو اور جس نے ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جیسی فاضلہ سے استفادہ کیا ہو، وہ ہستی علم دینی ودنیوی میں کیونکر تشنہ رہ سکتی تھی......؟ آپ یقیناً علم وعرفان کے گہوارہ تھے۔ بعض لوگ علم وعرفان پر ناز کرتے ہیں مگر علم وعرفان کو آپ رضی اللہ عنہ پر ناز تھا۔

لیکن حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی معرفت علم میں جو مبالغہ آمیزیاں اور باطل طرازیاں کی جاتی ہیں، وہ سخت افسوس ناک اور مُضعفِ دین وایمان (یعنی دین وایمان کو کمزور اور کھوکھلا کر دینے والی) ہیں، مثلاً ایک چیز ''مصحف فاطمہ علیہا السلام'' کا نام لیا جاتا ہے جس کے متعلق یہ ڈھکوسلا مشہور کیا جاتا ہے کہ اس میں ایک ہزار باب ہیں اور ہر باب میں ایک ہزار فصول ہیں، اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے مل کر تحریر کیا تھا، کیونکہ

دونوں کا رسم الخط اس میں موجود ہے، یہ چیز وراثتاً سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو ملی جس سے ان پر چودہ طبق روشن ہوگئے۔ پھر دوسری چیز "جفر جامعہ" کے نام سے مشہور کی گئی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس کی بدولت حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو جفر و نجوم میں دستگاہِ کامل حاصل ہوگئی تھی۔ علاوہ بریں "نور لامع" کتاب کو علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے منسوب کر کے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے سپرد کیا گیا ہے، جس کے بارے میں مشہور کیا گیا کہ اس میں ایک ہزار سات سو ابواب متعلقہ علوم سیارگان و افلاک وغیب دانی وغیرہ ثبت ہیں......۔ قارئین! یہ سب کذب بیانی اور دروغ بافی ہے۔ اسلام نے تو ہر مسلمان کو نجوم و جفر اور علم غیبیہ کو اختیار کرنے سے منع کیا ہے۔ اور سختی سے کہا ہے کہ عالم الغیب صرف ذات الٰہی ہے، پھر اسلام کے جلیل القدر فرزند ایسے باطل علوم کو کیونکر اختیار کر کے ان پر ایمان رکھ سکتے تھے؟ خوب سمجھ لیجیے یہ تمام باتیں لوگوں کی توجہ قرآن و حدیث سے ہٹانے اور اسلام کو نقصان پہنچانے کے لیے تراشی گئی ہیں۔

حلم و رفق

رسول اللہ ﷺ خود بھی نہایت حلیم و نرم خو تھے اور دوسروں کو بھی حلم اور نرم خُوئی کی تعلیم دیتے تھے۔ آپ ﷺ اکثر فرمایا کرتے کہ لوگو! نرمی اختیار کرو، اللہ تعالیٰ حلیم و کریم ہے اور نرم دل لوگوں کو دوست رکھتا ہے۔ اسی تعلیم کا اثر ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے آپ کو بہت حلیم بنالیا، قلب اطہر میں گداز پیدا کیا اور اپنے گرامی قدر نانا جان ﷺ کی اس بات میں بھی پوری پوری اطاعت واتباع اختیار کر لی۔ اگر آپ رضی اللہ عنہ سے کوئی سختی کرتا، بد اخلاقی سے پیش آتا تو آپ رضی اللہ عنہ خاموش رہتے اور رنجیدہ نہ ہوتے۔ کسی نے آپ رضی اللہ عنہ سے پوچھا: "حضور! بعض لوگ آپ کے سامنے گستاخی کرتے اور ترش روئی سے پیش آتے ہیں، مگر آپ ان سے کوئی مؤاخذہ نہیں کرتے؟"

فرمایا: ''میرے نانا جان صلی اللہ علیہ وسلم نے درشتی کی اجازت نہیں دی ہے۔ اور یہی سبق دیا ہے کہ لوگ سختی برتیں تو تم نرمی برتو، وہ پتھر بنیں تو تم موم بن جاؤ۔''

ایک دفعہ آپ رضی اللہ عنہ کہیں باہر جا رہے تھے، صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت آپ رضی اللہ عنہ کی رفاقت میں تھی کہ ادھر سے ایک اَعرابی آ گیا۔ اس نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ کر کے پوچھا: ''یہ کون ہیں؟'' لوگوں نے کہا: ''یہ حسین بن علی رضی اللہ عنہما ہیں۔'' اب وہ اَعرابی حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہوا اور کہنے لگا: ''تم ہی ہو ابو طالب کے پوتے؟ تمھارا باپ تو بڑا خونریز اور فتنہ انگیز تھا۔'' (نعوذ باللہ) حضرت حسین رضی اللہ عنہ مسکرا دیے، مگر آپ رضی اللہ عنہ کے ہمراہیوں کو یہ بات سخت ناگوار گزری، انھوں نے چاہا کہ اس اعرابی کو گستاخی کا مزہ چکھائیں اور عبرتناک سزا دیں، مگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے منع کیا اور اَعرابی سے فرمایا: ''اے وجیہہ عرب! کیا بات ہے کہ میں تجھے غضبناک دیکھتا ہوں۔ اگر تجھے بھوک لگی ہے تو چل میں تجھے کھانا کھلاؤں، پیاسا ہے تو شربت سے تیری پیاس بجھاؤں، سفر سے تھک گیا ہے تو تجھے مالش اور مٹھی چاپی کراؤں، مقروض ہے تو تیرا قرضہ ادا کروں، گھر سے لڑ کر آیا ہے تو تیری صلح کرا دوں، کوئی اور حاجت ہے تو اس کو پورا کروں، بتا تجھے کس چیز کی طلب ہے......؟'' فرزند رسول اللہ رضی اللہ عنہ کا یہ حلم اور حوصلہ دیکھا تو اعرابی شرمسار ہوا اور معافی مانگنے لگا، پھر آپ نے ساتھیوں سے فرمایا:

«إِنَّا جِبَالُ الْحِلْمِ بِحَمْدِ اللّٰهِ......»

''الحمد للہ ہم نرمی کے پہاڑ ہیں، پگھلتے ہیں، مگر صبر و حوصلہ نہیں چھوڑتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہی تعلیم دی ہے۔''[1]

سبحان اللہ! کیا شان رفق ہے کہ مخالف آپ رضی اللہ عنہ کے والد گرامی سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کی ہتک کر رہا ہے مگر آپ رضی اللہ عنہ اس کی ضرورتیں پوری کرنے پر تیار ہو رہے ہیں۔ اسی

[1] ''حسین رضی اللہ عنہ سب کا'' صفحہ: 108، تھوڑے اختلاف کے ساتھ، شہید ابن شہید رضی اللہ عنہما: 47/1.

طرح ایک مرتبہ کسی شخص نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے سامنے آتے ہی آپ کو، آپ رضی اللہ عنہ کے برادر اکبر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو اور آپ رضی اللہ عنہ کے والد ماجد سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو نازیبا الفاظ میں یاد کرنے لگا۔ آپ رضی اللہ عنہ یہ سن کر ہنسے اور فرمانے لگے: ''بھائی! تیری حالت پتلی نظر آتی ہے، یہ لے اس وقت میرے پاس چالیس درہم ہیں، ان سے اپنی ضرورت پوری کر، مگر یہ بات نہ بھول کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدگوئی اور گالی گلوچ سے سخت منع کیا ہے۔'' وہ گستاخ آپ رضی اللہ عنہ کا حلم ورفق دیکھ کر معذرت خواہ ہوا اور آئندہ سبّ وشتم سے باز رہنے کا عہد کیا۔[1]

ان واقعات سے ان لوگوں کو سبق لینا چاہیے جو اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور بزرگان دین پر تبرا بازی کرتے اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی تعلیمات کے خلاف چلتے ہیں، اہل بیت ہوں یا اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم، سب کو احترام کی نگاہ سے دیکھنا چاہیے، کسی سے بغض روا رکھنا ایمان کے خلاف ہے۔ اللہ ہمیں جملہ صحابہ اور اہل بیت رضی اللہ عنہم کی محبت عطا کرے۔ (آمین)

عفو وکرم

آپ رضی اللہ عنہ اس پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے ہیں جو بڑے سے بڑے مجرموں کو معاف فرما دیتے تھے، اُس اسد اللہ کے بیٹے ہیں جس نے اپنے قاتل کو ٹھنڈا شربت پلایا تھا، اور آپ اس عبقری (یعنی حضرت حسن رضی اللہ عنہ) کے برادر اصغر ہیں جس نے خبر ہوجانے کے باوجود زہر دینے والے کا پتہ نہ بتایا تھا تاکہ اس کو قتل نہ کر دیا جائے۔

---

[1] وفیات الأعیان: 2/67-68. مگر اس میں یہ واقعہ حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے متعلق مذکور ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی اور جگہ یہ واقعہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بھی پیش آیا ہو۔ کئی واقعات ملتے جلتے بھی ہوتے ہیں۔ واللہ اعلم.

آپ رضی اللہ عنہ کو اپنے نانا جان صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد یاد تھا کہ کسی کے قصور کو معاف کر دیا جائے تو اللہ غفور ورحیم اس کی عزت بڑھا دیتے ہیں اور اسی لیے آپ بھی مجرموں کو معاف کر دیا کرتے تھے، کسی نے سچ کہا ہے ۔

بدی را بدی سہل باشد جزا
اگر مردی ''احسن الیٰ من اساء''

''برائی کا جواب برائی سے دینا آسان ہوتا ہے اگر تم جوانمرد ہو تو اس شخص سے حسن سلوک سے پیش آؤ جو تم سے برا سلوک کرتا ہے۔''

ایک دفعہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی خادمہ سے کچھ رقم گم ہوگئی جب آپ رضی اللہ عنہ نے وہ رقم طلب فرمائی تو خادمہ کانپنے اور خوف کھانے لگی۔ آپ رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''کیا بات ہے کیوں ڈرتی ہے؟'' اس نے کہا: ''رقم فلاں جگہ رکھی تھی مگر بہت کوشش کے باوجود ملتی نہیں ہے۔'' پوچھا: ''معلوم ہے کتنی رقم تھی؟'' خادمہ نے عرض کیا: ''دوسو دس درہم۔'' فرمایا: ''غم نہ کر! جو اللہ تعالیٰ کو منظور تھا ہوگیا۔'' تھوڑی دیر کے بعد آپ باہر تشریف لے گئے تو کسی نے آپ کی خدمت میں آکر چار سو درہم پیش کیے۔ آپ رضی اللہ عنہ اسی وقت گھر آئے، خادمہ سے فرمایا: ''دیکھ! اللہ نے گمشدہ رقم کے بدلے دوگنا رقم بھیج دی ہے۔'' یہ کہہ کر آپ نے جس قدر رقم گم ہوئی تھی اسی قدر یعنی، دوسو دس درہم خادمہ کو عطا کر دیے۔ اور فرمایا: ''یہ ایک سو نوے درہم بھی لے لے، رقم ضائع ہونے سے تجھے جو خوف اور غم پہنچا ہے، یہ اس کا معاوضہ ہے۔''

ایک روز سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے دوستوں کو کھانے پر بلایا، جب دسترخوان بچھایا گیا تو ایک خادم جو گرم شوربے کا پیالہ بھر کر لایا، آپ رضی اللہ عنہ کی وجاہت اور مجلس کے دبدبے کو دیکھ کر لرز گیا۔ اس کا پاؤں لڑکھڑایا اور کھٹ سے زمین پر آ گرا۔ پیالہ چھوٹ کر حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر پڑا، آپ رضی اللہ عنہ کے کپڑے شوربے سے لتھڑ گئے، آپ نے ذرا

غصیلی نظر سے خادم کی طرف دیکھا تو وہ خوف سے لرزنے لگا مگر فوراً ہی رحم کا خواستگار ہوا اور ساتھ ہی قرآن کی یہ آیت پڑھ دی: ﴿ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ ﴾ ''مومن غصہ پی جاتے ہیں۔'' آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''فکر نہ کرو میرا غصہ ٹھنڈا ہوگیا۔'' خادم بولا: ﴿ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ﴾ ''اور لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں۔'' سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے کہا: «عَفَوْتُ عَنْكَ» ''میں نے تیری خطا بخش دی۔'' وہ کہنے لگا: ﴿ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ ''اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''[1] آپ نے فرمایا: ''جاؤ میں نے تمھیں آزاد کیا اور تمھارا تمام خرچ بھی اپنے ذمے لے لیا۔''[2]

اللہ اللہ! ذرا آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا خلق اور عفو وکرم ملاحظہ کیجیے کہ غلام سے جرم سرزد ہوتا ہے تو اس کو سزا دینے کے بجائے نہ صرف معافی دے دیتے ہیں بلکہ آزادی بھی بخش دیتے ہیں اور اس کے مصارف کے کفیل بھی بنتے ہیں۔ سبحان اللہ، آج بھی آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہے، سادات کا وجود نظر آتا ہے۔ مگر کیا وہ اپنے بزرگوں کا طریق اختیار کرتے اور ان کی پیروی کرتے ہیں......؟ نہیں اور ہرگز نہیں! دعا ہے کہ اللہ ہمیں ایسا ہی خلق عطا فرمائے۔ آمین!

جود وسخا

حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی اپنے نانا جان صلی اللہ علیہ وسلم، اپنے والد رضی اللہ عنہ، اپنی والدہ رضی اللہ عنہا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرح بہت مخیّر، جواد اور سخی تھے اور ﴿ اَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ﴾ ''دوسروں سے احسان کر جس طرح اللہ تعالیٰ نے تجھ پر احسان کیا ہے۔''[3] کے حسب فرمان ہر ایک کے ساتھ احسان ومروت سے پیش آتے تھے۔ سعدی رحمہ اللہ

---

① سورۃ آل عمران آیت: 134. ② حسین (رضی اللہ عنہ) سب کا، صفحہ: 102,101، سوانح عمری حضرت حسین رضی اللہ عنہ، صفحہ: 20. ③ القصص، 28:77.

نے کیا خوب فرمایا ہے:

جوان مرد و خوش خُلق و بخشندہ باش
چوں حق بر تو پاشد تو بر خَلق پاش

محتاجوں کے لیے آپ رضی اللہ عنہ کا دستِ کرم بہت کھلا رہتا تھا، کسی سوالی کو خالی لوٹانا برا سمجھتے تھے، ضرورت مندوں کو ان کی حاجت سے زیادہ دیتے تھے، بھوکوں کو روٹی، بے لباسوں کو کپڑا، ناداروں کو روپیہ دینے میں انھیں خاص لطف آتا تھا، کوئی قرض دار ہوتا تو آپ اس کا قرض ادا کر دیتے۔ یتیموں اور مسکینوں کی پرورش فرماتے، ضعیفوں اور بیواؤں کی مدد کرتے اور جس وقت آپ کو کوئی رقم وغیرہ ملتی تو وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کر کے قرار پاتے۔

ایک دفعہ کسی سفر میں ایک غریب عورت نے آپ کو کھانا کھلایا اور آپ کی خاطر بکری کا گوشت بھون کر آپ کی خدمت میں پیش کیا، پھر جب وہ مدت کے بعد کسی کام سے مدینہ منورہ آئی تو حسین رضی اللہ عنہ نے اسے ایک ہزار درہم اور ایک ہزار بکریاں مرحمت فرمائیں۔[1]

ایک بار سیدنا اسامہ رضی اللہ عنہ بیمار پڑ گئے، حضرت حسین رضی اللہ عنہ ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے، تو وہ "ہائے غم ہائے غم" پکار رہے تھے، حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے پوچھا: "کس بات کا غم ہے......؟" اسامہ رضی اللہ عنہ بولے: "ساٹھ ہزار درہم کا مقروض ہوں اور اس کی ادائیگی کا اس وقت کوئی ذریعہ نہیں۔" حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "فکر نہ کرو، یہ قرض میں ادا کر دوں گا۔" اسامہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: "بس یہی وہ قرض تھا جس سے خائف ہوں اور ڈرتا ہوں کہ مقروض حالت میں نہ مر جاؤں۔" چنانچہ آپ نے جس طرح ہو سکا ان کی زندگی ہی میں ان کا قرض چکا دیا۔[2]

---

[1] حسین (رضی اللہ عنہ) سب کا، صفحہ: 105,104 بحوالہ صواعق محرقہ. [2] "حسین (رضی اللہ عنہ) سب کا"

واقعی قرض کا مسئلہ بڑا اہم ہے مگر عام لوگ اسے معمولی جانتے ہیں۔ ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مقروض کی نماز جنازہ پڑھانے سے انکار کر دیا تھا۔ ایسا قرض لینے سے نہ لینا بہتر ہے جس سے حالت قرض میں موت آجائے اور آدمی پچھلوں پر خواہ مخواہ بھاری بوجھ ڈال کر رختِ سفر باندھ لے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پچھلوں کو صاحبِ کشائش چھوڑ کر جانے کا حکم دیا ہے نہ کہ اس کے برعکس زیر بار کر کے سفر آخرت پر روانہ ہونے کا۔ مگر افسوس، اس حکم کی نافرمانی کر کے بہت سے مرنے والے پچھلوں کی بلائیں لیتے ہیں۔

ایک مرتبہ کوئی غریب شاعر مدینہ کی گلیوں میں گھومتا پھرتا اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا پتہ پوچھتا ہوا آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ اس وقت نماز میں مصروف تھے، وہ آپ کی مدح میں شعر پڑھتا رہا۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو اپنے غلام قنبر سے پوچھا: ''میں نے جو رقم تمھیں خرچ کے لیے دی تھی، اس میں سے کچھ باقی ہے؟'' غلام نے عرض کیا: ''حضور، دو سو درہم موجود ہیں۔'' فرمایا: ''وہ رقم لا کر سائل کو دے دو کہ یہ اہل بیت سے زیادہ مستحق ہے۔'' پھر سائل سے معذرت کرتے ہوئے کہا: ''افسوس ہے کہ اس وقت یہی کچھ موجود ہے ورنہ زیادہ دے دیتا۔''[1]

اسی طرح ایک دیہاتی اونٹنی پر سوار مسجد نبوی میں پہنچا، سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے ملا اور ان سے کہا: ''میں نے خون بہا ادا کرنا ہے، کچھ دیجیے۔'' انھوں نے سو درہم دیے۔ اس نے کہا: ''میں نے دس ہزار درہم ادا کرنے ہیں اس سے کیا بنتا ہے؟'' مگر وہ خاموش رہے، پھر وہ عتبہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے پاس گیا، انھوں نے دو سو درہم دیے، پھر اس نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا رخ کیا اور عرض کی کہ میں نے اپنے چچیرے بھائی کو قتل کر دیا ہے اور دس ہزار درہم دیت ادا کرنی ہے، میری مشکل دور کیجیے، حضرت

<< صفحہ: 104 بحوالہ مسند امام رضا، صفحہ: 35. [1] ابن عساکر: 130/7.

نے اس کو دس ہزار درہم دیت کے لیے اور دس ہزار درہم اس کے دوسرے مصارف کے لیے عطا فرمائے۔

ایک مرتبہ ایک لونڈی آپ کی خدمت میں چنبیلی کے پھولوں کا گلدستہ لائی، آپ نے خوش ہو کر اس کو آزادی بخش دی۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''میں نے پوچھا: آپ نے اتنی سی بات پر کنیز کو آزاد کر دیا؟'' فرمایا: ''قرآن و سنت کی یہی تعلیم ہے۔''[1]

آپ رضی اللہ عنہ کی سخاوت کے بے شمار واقعات کتابوں میں مذکور ہیں، یہاں صرف بطور نمونہ دو چار درج کیے گئے ہیں، جن کے بیان کرنے کا مقصد آپ رضی اللہ عنہ کی جود و سخا کو بیان کرنے کے علاوہ یہ بتانا بھی ہے کہ وہ دوست جو بہت کچھ ہونے کے باوجود بھی دوسروں کے کام نہیں آتے، انھیں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی جود و سخا پیش نظر رکھنی اور ان کی مبارک روش پر چلنے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ اللہ کی رضا نصیب ہو۔ جو دوسروں کے کام آتے ہیں اللہ ان کے کام آتا ہے۔ پھر مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔

اسراف سے نفرت

قرآن و حدیث میں جگہ جگہ اسراف اور فضول خرچی سے روکا گیا ہے اور ہمیشہ اعتدال اور میانہ روی کی تلقین کی گئی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: «مَا عَالَ مَنِ اقْتَصَدَ» ''جس کسی نے خرچ کے بارے میں میانہ روی اختیار کی وہ کبھی غربت و افلاس سے دوچار نہ ہوگا۔''[2] جہاں تک ہم نے مطالعہ کیا ہے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا اس معاملے میں بھی سنت پر پورا پورا عمل تھا۔

آپ رضی اللہ عنہ فضول خرچی کو بہت برا سمجھتے تھے، لوگوں کو اسراف و تبذیر سے روکتے رہتے تھے۔

---

[1] ''حسین (رضی اللہ عنہ) سب کا''، صفحہ: 101. [2]

ایک دفعہ ایک شخص نے کسی دکان سے بہت سا مال خریدا اور اس میں کئی چیزیں ایسی تھیں جو غیر ضروری تھیں۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے دیکھا تو فرمایا: ''اے شخص! کیا تو مسلمان ہے؟'' اس نے کہا: ''ہاں! اللہ کے فضل سے مسلمان ہوں۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا کلمہ گو ہوں۔'' آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''پھر تم شریعت کے خلاف عمل کر رہے ہو، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا ۝ إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوٓا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ﴾

''مال وزر کو بے جا خرچ نہ کرو، کیونکہ فضول خرچ لوگ شیطانوں کے بھائی ہیں۔''[1]

اس شخص پر آپ کی نصیحت کا بہت اثر ہوا اور اس نے غیر ضروری اشیاء واپس کر دیں۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ تجارت بھی کرتے تھے، جائیداد کی کچھ آمدنی بھی تھی، بیت المال سے بھی معقول وظیفہ ملتا تھا اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بھی خطیر رقم بھیجتے رہتے تھے، پھر دوسرے لوگ بھی آل رسول ﷺ سمجھ کر اچھی خدمت کرتے تھے مگر حسین رضی اللہ عنہ اول تو سب کچھ فی سبیل اللہ خرچ کر دیتے تھے اور جو کچھ باقی بچتا، اس کو بے ضرورت اور اندھا دھند مصرف میں نہ لاتے تھے۔ بلکہ بڑی احتیاط سے خرچ کرتے تھے۔ جب کسی کو عطا فرماتے تو نصیحت کرتے کہ میاں! مُسرف (یعنی فضول خرچ) نہ بننا، روپے کو یونہی نہ اڑا دینا۔ اسی طرح عوام کو سمجھاتے رہتے کہ لوگو! آمدنی سے زیادہ خرچ نہ کرو کیونکہ قیامت کے دن تمھارے مال کے متعلق تم سے پوچھا جائے گا کہ کہاں سے کمایا اور کہاں کہاں خرچ کیا۔ جیسا کہ یہ سارا مضمون حدیث صحیح میں وارد ہے۔

آج کل مسلمانوں کا جینا بھی مشکل ہے اور مرنا بھی مشکل۔ مذہبی اور خاندانی رسومات کہ جنھیں شمار کرنا آسان نہیں، سب پر پانی کی طرح روپیہ بہایا جاتا ہے۔ مگر ہماری یہ روش اسوۂ نبوی اور سیرت حسینی کے سراسر خلاف ہے جسے بدلنا ضروری ہے۔

---

[1] بنی إسرآئیل 17: 27,26.

خدمت وتواضع

سچ ہے۔

ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد
آنکہ خود را دید او محروم شد

”جو خدمت کرتا ہے وہ مخدوم ومحترم ہوجاتا ہے اور جو کوئی اپنے آپ کو دیکھتا رہتا ہے وہ مقام رفیع سے محروم رہ جاتا ہے۔“

مطلب یہ کہ قوم کی خدمت ہی سے سرداری ملتی ہے اور بمطابق حدیث: «سَيِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُهُمْ» قوم کی سیادت اسی خوش نصیب کو حاصل ہوتی ہے جو سچے دل سے قوم کا خادم بن جاتا ہے۔“ [1]

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بھی خدمت خلق سے ہی زائد اور اضافی مرتبے ملے اور ہردلعزیزی حاصل ہوئی۔ آپ رضی اللہ عنہ بہت متواضع تھے۔ خاطر مدارات میں کوئی کمی نہ اٹھا رکھتے تھے...... ایک دفعہ دس بارہ مہمان اچانک آدھمکے۔ اس وقت گھر میں زیادہ راشن موجود نہ تھا۔ جوں توں کر کے گزارہ کیا۔ مہمانوں کی ہر ممکن تواضع فرمائی اوران کا تو خوب پیٹ بھرا، مگر خود بمع اہل وعیال بھوکے سو رہے اور فرمانے لگے: ”کسی کے لیے بھوک برداشت کرنا بھی لذت سے خالی نہیں۔“

آپ رضی اللہ عنہ کی عادت مبارکہ تھی کہ جہاں کہیں دعوت پر جاتے اور کھانا کھاتے تو آپ اس دعوت پر کھانا کھانے والے تمام آدمیوں کو اپنے ہاں مدعو کرتے اور انھیں کھانا کھلاتے۔ ایک بار کسی دعوت میں شریک تھے جب کھانا کھا چکے تو صاحب خانہ سے فرمایا: ”فلاں روز ان آدمیوں کو لے کر ہمارے گھر آؤ اور ہمیں مہمان نوازی کا موقع

---

① مشكوٰة المصابيح، كتاب الجهاد، باب آداب السفر، حديث:3926.

دو۔‘‘ اس نے عرض کیا: ’’جناب! کیوں تکلیف فرماتے ہیں؟‘‘ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ’’بس بس! زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ اللہ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ ’’دعوت کا ٹھکرانا محبت کو ٹھکرانے کے برابر ہے۔‘‘

ایک دفعہ کچھ آدمی عراق سے آئے اور آپ کا پتہ پوچھ کر دروازے پر دستک دی تو آپ رضی اللہ عنہ باہر تشریف لائے، ہر ایک سے مصافحہ و معانقہ کیا۔ پھر ایک صاف مکان میں ان کو ٹھہرایا۔ فوراً دو بکریاں ذبح کرائیں اور کھانا تیار کرایا، جب کھانا تیار ہو گیا تو باوجودیکہ خدام حاضر تھے اور عوام بھی خادموں کی طرح آپ کے اشارۂ ابرو پر چلتے تھے آپ رضی اللہ عنہ بہ نفس نفیس مہمانوں کے ہاتھوں کو دھلانے لگے، مہمانوں نے آپ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ خادم الگ برتن گھسیٹنے لگے مگر آپ نے مسکراتے ہوئے فرمایا: ’’مجھے ثواب کیوں نہیں لینے دیتے؟‘‘ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ’’جو شخص متواضع ہے اللہ پاک اس کو عظمت اور رفعت بخشتا ہے اور جو تکبر کا مظاہرہ کرتا ہے وہ ذلیل و رسوا ہوتا ہے۔‘‘[1]

ایک دفعہ آپ رضی اللہ عنہ کہیں تشریف لے جا رہے تھے کہ کسی نے آواز دی، بھائی! ذرا بوجھ اٹھوا دو۔ آپ رضی اللہ عنہ قریب گئے تو وہ شخص کہنے لگا: ’’اوہو! آپ تو فرزند علی رضی اللہ عنہ ہیں، معاف کیجیے میں نے کوئی اور آدمی سمجھ کر آواز دی ہے۔‘‘ آپ رضی اللہ عنہ نے مسکرا کر فرمایا: ’’کوئی حرج نہیں تھوڑی دیر کے لیے مجھے بھی آدمی سمجھ لو۔‘‘ اس بات پر دونوں ہنس پڑے اور آپ رضی اللہ عنہ نے بوجھ اٹھانے میں اس کو سہارا دیا۔ ارشادِ نبوی ہے:

«خَيْرُ النَّاسِ مَنْ يَنْفَعُ النَّاسَ»

’’تم میں بہتر وہ آدمی ہے جو لوگوں کو فائدہ پہنچائے۔‘‘[2]

اس حدیث مبارکہ پر آپ کا پورا پورا عمل تھا۔

ایک بار کوئی بوڑھا آدمی بوجھ تلے دبا ہوا بمشکل چل رہا تھا، آپ

---

[1] ’’شعب الایمان بیهقی‘‘ حدیث: 8140. [2] صحیح مسلم.

دوڑ کر اس کے پاس پہنچے، اس کا بوجھ اپنے سر پر اٹھا لیا اور فرمایا: ''بڑے میاں! مجھے لے چلو جہاں جانا ہے۔'' مقام مقصود پر پہنچ کر بوڑھے نے آپ کی طرف دیکھا، تو پہچان کر معذرت طلب کی۔ آپ نے فرمایا: ''کوئی مضائقہ نہیں، بڑوں کی خدمت کرنا میرا اوّلین فرض ہے۔''

اب اس متواضع اور خادم الناس شہزادے کے ہم جیسے نام کے شیدائیوں کو دیکھنا ہے کہ کیا وہ بھی آپ رضی اللہ عنہ کے نقش قدم پر چلتے ہیں؟ اور عوام کی خدمت کر کے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی مقدس تعلیمات اور خوبصورت اداؤں کو اپناتے ہیں یا......؟ اگر جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو پھر سمجھ لیجیے حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے ہماری محبت صرف زبانی ہے، قلبی اور عملی نہیں۔ قلبی محبت یہ ہوتی ہے کہ آپ کے ایک ایک عمل کی پیروی کی جائے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ ہم بھی سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ اپنا کر دنیوی واخروی فلاح پائیں۔ (آمین)

صبر وقناعت

مصیبت کے وقت صبر کرنا اور مشکلات میں اللہ تعالیٰ کی یاد میں وقت گزارنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا خاصہ تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ مصائب میں مبتلا ہو کر گھبراتے، نہ مضطرب ہوتے۔ بلکہ بارگاہ الٰہی میں سربسجود ہو کر خشوع وخضوع اور گریہ وزاری وانکساری سے دعائیں مانگتے تھے اور لوگوں پر ظاہر نہ ہونے دیتے تھے کہ آپ رضی اللہ عنہ کس غم یا فکر میں مبتلا ہیں اور کس مصیبت نے آپ رضی اللہ عنہ کو گھیرا ہوا ہے؟

ایک بار آپ رضی اللہ عنہ کسی مشکل میں پڑ گئے کسی کو کچھ معلوم نہ تھا کہ آپ رضی اللہ عنہ پر کیا ابتلاء آئی ہے۔ جب وہ مشکل حل ہوگئی تو لوگوں کو اس کا علم ہوا، عرض کیا: ''حضرت! آپ نے ہمیں آگاہ کیوں نہ فرمایا؟ جہاں تک بس چلتا ہم آپ کی مدد کرتے۔ صابر و

شاکر امام رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''بھائیو! میری اس مصیبت اور مشکل کو بجز ذات الٰہی کے کوئی ٹال نہیں سکتا تھا، پھر میں دوسروں سے شکایت کر کے اس کا ناشکر گزار کیوں بنوں اور بے صبری سے کیوں کام لوں؟ اور اسی کے دربار میں کیوں نہ جھکوں جو مشکلات کو حل کرنے والا اور مصائب وآلام سے نجات دینے والا ہے۔''

اللہ اللہ! یہ ہے وہ صبر وقناعت جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے سیکھی۔

کہتے ہیں کہ جب حضرت موصوف پر کوئی مصیبت آن پڑتی تو آپ رضی اللہ عنہ فوراً نماز پڑھنے لگتے اور جب مصیبت دور ہو جاتی، پھر بھی نماز ادا فرماتے۔ کسی نے پوچھا: ''حضور! کیا نماز پڑھنے سے مصیبت دور ہو جاتی ہے؟'' فرمایا: ''ہاں! کیا تو نے قرآن میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نہیں پڑھا ہے؟

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴾

''اے ایمان والو! صبر اور نماز کے ذریعے مدد چاہو، بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''[1]

قناعت کا یہ حال تھا کہ جو کچھ ملتا اسی پر گزر بسر کر لیتے اور اس سے زیادہ کی خواہش نہ رکھتے، بعض اوقات روکھی روٹی چبا لیتے، بعض دفعہ خشک چپاتی پر قانع رہتے۔ ایسی حالتوں میں اکثر یہ آیت پڑھا کرتے:

﴿ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ﴾

''تم مجھے یاد رکھو میں تمھیں یاد رکھوں گا اور میرا شکریہ ادا کرو اور میری ناشکری نہ کرو۔''[2]

یہ نہیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ تنگدست اور نعوذ باللہ غریب و بدحال تھے، آپ رضی اللہ عنہ کو

---

[1] البقرۃ، 2: 153. [2] البقرۃ، 2: 158.

اللہ کی رحمت سے بہت کچھ ملتا تھا اور وافر ملتا تھا۔ لیکن آپ رضی اللہ عنہ سارا مال اللہ کی راہ میں لُٹا دیتے تھے۔ اور خود قوت لایموت کے مطابق کھاتے اور تھوڑے اثاثہ پر قناعت فرماتے تھے۔ ورنہ بعض دفعہ لاکھوں درہم آپ رضی اللہ عنہ کے پاس آئے۔ جس طرح آئے اسی طرح فی سبیل اللہ خرچ کر دیے۔ حاجت مندوں کے گھر بھر دیے۔ ناداروں کو بے نیاز کر دیا لیکن خود بھوکے رہے۔ یہ تھی آپ رضی اللہ عنہ کی شانِ استغناء۔ اللہ اکبر! اور یہ سب کچھ آپ رضی اللہ عنہ کو اپنے گرامی منزلت والدین اور اس سے بڑھ کر حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت سے نصیب ہوا۔ کیا آپ کو ماننے والے دوست آپ رضی اللہ عنہ کی سیرت مقدسہ کے اس پہلو سے کچھ سبق لیں گے؟

آداب واخلاق

ازبسکہ حسین رضی اللہ عنہ ﴿وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾[1] کا باعظمت خطاب پانے والے عظیم نبی کے عظیم نواسے تھے، اس لیے خُلق میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت فرماتے تھے۔ اور نہ صرف خود بہترین اخلاق کے مالک تھے، بلکہ دوسروں کو بھی اعلیٰ اخلاق اختیار کرنے کا درس دیتے تھے۔

ایک دفعہ کسی دیہاتی نے آپ رضی اللہ عنہ سے پوچھا: ''جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ محبوب کس کو رکھتے تھے؟'' فرمایا: ''جو سب سے زیادہ با اخلاق ہوتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی:

«أَحْسَنُكُمْ أَحْسَنُكُمْ أَخْلَاقًا»

''تم میں سب سے بہتر وہ ہے جس کے اخلاق سب سے بہتر ہیں۔''

کوئی شخص بدتہذیبی سے پیش آتا یا اکھڑ لہجے میں بات کرتا تو آپ رضی اللہ عنہ اس سے

[1] القلم 68: 4.

عمدہ اخلاق سے پیش آتے۔ اور حسن سلوک کا اظہار فرماتے۔ اور کسی صورت تہذیب و شرافت کا دامن نہ چھوڑتے۔

ایک بار مجلس میں تشریف فرما تھے اور علم و عرفان کے قیمتی موتی بکھیر رہے تھے، ایک شخص نے سوال کیا: ''قیامت کے روز کون سا عمل سب سے بہتر سمجھا جائے گا؟ آپ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَا مِنْ شَيْءٍ أَثْقَلَ فِي الْمِيزَانِ مِنْ حُسْنِ الْخُلُقِ»

''حشر کے روز میزان میں خوش خلقی سب عملوں سے زیادہ وزن رکھے گی۔''[1]

ایک دفعہ ایک گنوار نے آپ رضی اللہ عنہ کو بدتمیزی سے بلایا اور بے ادبی سے باتیں کرنے لگا۔ لیکن ہر بات کا جواب آپ رضی اللہ عنہ اخلاق وتہذیب اور بڑی نرمی سے دیتے رہے۔ جب وہ جانے کا ارادہ کرنے لگا تو آپ رضی اللہ عنہ نے اس کو کھانا کھلایا اور اس کی ضرورت پوچھی، وہ چلا گیا تو لوگوں نے کہا: ''وہ تو آپ رضی اللہ عنہ سے بدخلقی کے ساتھ پیش آیا مگر آپ بہت احترام اور خُلق ومحبت سے گفتگو فرما رہے تھے؟'' آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وہ گنوار (بدّو) تھا اور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نواسہ اور علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا بیٹا ہوں، اس کا اپنا انداز تھا جس میں وہ بولتا تھا۔ مگر میں نے اپنے انداز ہی سے بات کرنا تھی۔ ہر شخص کی عقل سمجھ اپنی اپنی ہوتی ہے جسے وہ استعمال کرتا ہے۔ میں گنوار کے ساتھ کیوں گنوار بنوں؟''

آپ رضی اللہ عنہ بہت مؤدب اور شائستہ طبع تھے۔ بڑوں کا ادب کرنا فرض سمجھتے تھے اور کسی کی بے ادبی کرنا گناہ خیال کرتے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ کے بھائی حضرت حسن رضی اللہ عنہ آپ سے صرف گیارہ ماہ بڑے تھے لیکن جب آپ رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لاتے تو آپ رضی اللہ عنہ ان سے احترام و تعظیم کے ساتھ پیش آتے۔ آپ رضی اللہ عنہ اپنے گرامی منزلت والدین کی بہت

---

[1] سنن أبي داود، الأدب، باب في حسن الخلق، حديث: 4799، وجامع ترمذي، البر والصلة، باب ما جاء في حسن الخلق، حديث:2003.

تکریم کرتے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا آگے بڑھ کر استقبال کرتے۔ والدہ محترمہ سیدہ فاطمۃ الزھراء رضی اللہ عنہا کی تعظیم میں کوئی فرق روا نہ رکھتے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بہت عزت کرتے اور ان کے مرتبے کو خوب پہچانتے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ میں سے کسی کے پاس جاتے تو مؤدب ہو کر زانو ٹیک کر بیٹھتے۔ احترام ملحوظ رکھتے ہوئے ان کے سامنے بہت آہستگی سے بات کرتے۔ ان کی بات کو ٹوکتے، نہ کاٹتے بلکہ حد درجہ احترام اور شائستگی کا مظاہرہ فرماتے۔

ان واقعات سے ہمیں سبق لینا چاہیے اور وہی اسوۂ حسین رضی اللہ عنہ اختیار کرنا چاہیے جو مستند ہے اور جس پر چلنے سے ہر مسلمان نیکو کار بن کر جنت خرید سکتا ہے۔

شجاعت و بسالت

حسین رضی اللہ عنہ اُس خیبر شکن کے نور نظر تھے جس کی ہیبت سے نامی گرامی پہلوان اور بڑے بڑے بہادر لرز جاتے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ میں قوت و ہمت، دلاوری و شہ زوری کیوں نہ ہوتی۔ آپ بھی «اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِّأَبِیہِ» کے مطابق اپنے والد گرامی رضی اللہ عنہ کے اوصاف و کمالات کا پرتو تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ جس لڑائی میں بھی شریک ہوئے، اس میں اپنی شجاعت و بسالت کے جوہر دکھائے۔ اور لطف یہ ہے کہ جن جنگوں میں آپ رضی اللہ عنہ نے شرکت کی اللہ تعالیٰ نے اسلام اور مجاہدین اسلام کو ان سب میں فتح و نصرت عطا فرمائی۔ تفصیل گزشتہ صفحات میں دی جا چکی ہے۔

لڑائیوں میں آپ رضی اللہ عنہ جس وقت دشمن سے مقابلہ کرتے تو بڑی بے جگری اور پامردی سے لڑتے، خوف اور گھبراہٹ کے آثار کبھی چہرہ مبارک پر پیدا نہ ہوتے۔ خود اطمینان سے لڑتے اور دوسروں کو حوصلہ دیتے جس پر ہاتھ ڈالتے وہ بھاگ نہیں سکتا تھا۔ جس پر وار کرتے اس کا بچنا محال تھا۔ جسے قابو کرتے وہ آپ کی گرفت سے نکل نہ سکتا

تھا۔ شجاع ابن شجاع تھے۔ کائناتِ عالم کے اس سپہ سالار اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے تھے جس نے فنون جنگ میں اللہ تعالیٰ سے رہنمائی لی تھی۔ مختصر یہ کہ آپ کو اسد اللٰہی قوتوں سے حصہ ملا تھا۔ اگر آپ رضی اللہ عنہ شجاعت میں بے مثل نہ ہوتے تو اور کون ہوتا؟ معرکہ کربلا میں آپ نے جو حیرت انگیز بہادری دکھائی ہے وہ تاریخ میں قیامت تک ثبت رہے گی۔ اور اس کا تذکرہ اگلے صفحات پر آ رہا ہے۔

جرأت وحوصلہ

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نہایت جری' بے مثل زعیم اور بے نظیر حوصلہ مند تھے، راسخ العزم تھے۔ بڑے نڈر تھے۔ دل میں اللہ کے سوا کسی کا خوف نہ رکھتے تھے۔ کوئی ارادہ کرتے تو اس پر پہاڑ کی طرح قائم رہتے۔ ہر بات جرأت مندی سے کہتے۔ جس کام کو شروع کرتے تو اس کو انجام تک پہنچا کر دم لیتے۔ دشمن سے کلام کرتے تو جرأت و بے باکی سے کام لیتے۔ مخالف سے بولتے تو بے خوفی کا مظاہرہ کرتے، کسی بات میں رائے دیتے تو بہت صائب اور پختہ۔ ملوک و حکام، وزراء وسفراء، گروہ و وفود جو لوگ غیر ممالک سے آتے ان سے ایسی کمال گفتگو فرماتے کہ وہ دنگ رہ جاتے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ جیسے مدبّر وسیاست دان کے سامنے احترام رکھتے ہوئے کھل کر اپنا مافی الضمیر بیان کرتے۔ دل میں کوئی بات چھپا کر نہ رکھتے۔ پھر عبید اللہ بن زیاد، شمر اور ابن سعد جیسے لوگوں کے سامنے آپ نے جس جرأت و دلیری اور استقلال وحوصلے سے مافی الضمیر کا اظہار کیا اس کی مثال نہیں ملتی۔ آپ رضی اللہ عنہ کی پائیدار اور دوٹوک گفتگو سن کر دشمن لرز جاتے اور ان کے ارادے بدل جاتے تھے مگر آپ رضی اللہ عنہ کی استقامت اور پختگی میں فرق نہ آتا تھا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں بھی یہ ذہانت وذکاوت، خلق ومروت اور جرأت وحوصلہ عطا فرمائے۔ آمین!

تبلیغ حق وصداقت

حضرت حسین رضی اللہ عنہ تبلیغی فرائض بھی بہت احسن طریقے سے ادا کرتے تھے۔ جہاں شر پسندوں یا فتنہ پردازوں کی کوئی جماعت دیکھتے تو انھیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام بے دھڑک سناتے اور دین حنیف کو صحیح طور پر اختیار کرنے کی دعوت دیتے۔ راہ چلتے کوئی زندیق وبدعتی مل جاتا تو اس کے ساتھ بہت نرم اور نتیجہ خیز گفتگو کرتے اور پھر ایسے مدلل طریقے سے تبلیغ کرتے کہ وہ لاجواب ہو کر چلا جاتا یا پھر اسلام کا خادم بن جاتا۔

ایک دفعہ آپ پا پیادہ حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے جارہے تھے کہ ایسے ہی افراد کا ایک گروہ راستے میں مل گیا۔ ان لوگوں نے آپ کو پیدل چلتے دیکھا تو کہنے لگے: ''اے ابن علی رضی اللہ عنہ! تمھارے قرآن میں تو لکھا ہے کہ ﴿ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ﴾ ''اللہ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔''[1] اور تم اسپ وشتر کی موجودگی میں پا پیادہ جارہے ہو؟ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''الحمدللہ، میں تندرست وتوانا ہوں، دین کا ایک فرض ادا کرنے جارہا ہوں، اللہ کے لیے خود کو تکلیف میں ڈالنا بہت بڑے ثواب کا موجب ہے۔ تم ہی بتاؤ! تم جو غیر اللہ کے سہارے بناتے اور ان کے بارے میں طرح طرح کے موہوم، ریت کے گھروندے اور کچے عقائد رکھتے ہو، ان کے آگے جھکتے اور ان پر بڑا تکیہ کرتے ہو۔ اور ان کے نام پر نذریں دیتے ہو، یہ سب کام تکلیف میں داخل ہیں یا نہیں؟ تم بھی تکلیف کرتے ہو۔ اور ہم بھی تکلیف کرتے ہیں، مگر ہماری تکلیف باعث ثواب ہے اور تمھاری تکلیف باعث عذاب ہے۔'' یہ کہہ کر آپ رضی اللہ عنہ نے انھیں اسلام کے ایسے احکام ومسائل سنائے کہ ان میں سے اکثر توحیدِ خالص اور عظمت

---

[1] البقرۃ 2: 286.

اسلام کے قائل ہو گئے۔ اور جو محروم رہ گئے وہ بھی صداقت اسلام کے معترف ہو گئے۔

ایک مرتبہ ایک تاجر جو اسلام کے بعض احکام پر نکتہ چینی کرتا اور مسلمانوں سے ٹھٹھول کرتا تھا۔ وہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے ملا تو کہنے لگا: ''آپ کے لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام ایک مکمل آئین الٰہی ہے اور اس میں دین و دنیا کے تمام اصول وقوانین موجود ہیں، بھلا بتاؤ تو! کیا ناپ تول کا اصول بھی قرآن میں آیا ہے؟'' حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''کیوں نہیں؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ اَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَ زِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ﴾

''جب کوئی چیز ناپو تو پیمانہ بھر کر دو۔ اور تولنے لگو تو ترازو کی ڈنڈی سیدھی رکھو۔''[1]

یہ آیت سنتے ہی وہ بے دین و بدمزاج آدمی آپ کی عظمت اور اسلام کی فضیلت کا قائل ہو گیا۔ الغرض آپ جب بھی موقع پاتے تبلیغ اسلام میں مصروف ہو جاتے، اللہ تعالیٰ کی توحید پر خاص زور دیتے، ہستی باری تعالیٰ کے دلائل سناتے، قرآنی تعلیمات اور اس کے محاسن سے آگاہ فرماتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت اور اس کی ضرورت واہمیت اور آخرت کی صداقت وحقیقت سے روشناس کراتے۔ غرض آپ کی تبلیغی مساعی سے بہت سے غلط رَو اور گم گشتہ راہ لوگ ہدایت پر آ گئے۔ اللہ ہمیں بھی آپ رضی اللہ عنہ جیسا مقدس اور سچا جذبۂ دعوت وتبلیغ عطا فرمائے۔ اور آپس کے لڑائی جھگڑے اور صحابہ واہل بیت رضی اللہ عنہم پر طعن وتشنیع کرنے سے بچائے۔ جس میں بجائے فائدے کے نقصان ہی نقصان ہے۔ دنیا کا بھی زیاں اور آخرت کا بھی نقصان۔ اور ہم اپنے تئیں سمجھتے ہیں کہ بڑی اچھی تبلیغ کر رہے ہیں۔ اللہ ہمیں صحیح سمجھ عطا فرمائے۔ آمین

تیمارداری

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ تھی کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ملتی کہ فلاں شخص بیمار

---

[1] بني إسرائيل، 17: 35.

ہے تو اس کی عیادت کے لیے ضرور تشریف لے جاتے۔ اس کی تیمارداری فرماتے، دوا دارو لا کر دیتے، اس کی ضرورت کے متعلق پوچھتے اور جہاں تک بس چلتا اس کی حاجت پوری کرتے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے بھی ہر حال میں اپنے نانا جان صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی۔ آپ رضی اللہ عنہ لوگوں کی بیمار پرسی کے لیے جاتے۔ مریض کو تسلی دیتے۔ اس کی شفا کے لیے دعا فرماتے۔ قطع نظر اس سے کہ بیمار مسلمان ہوتا یا غیر مسلم، دوست ہوتا یا دشمن، اپنا ہوتا یا بیگانہ، آپ رضی اللہ عنہ سب کے پاس پہنچتے۔ ایک دفعہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سخت بیمار ہوگئے۔ مرض بڑا مہلک تھا اور ان کے جاں بر ہونے کی کوئی امید نہ تھی۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ روزانہ ان کے پاس جاتے، تشفی دیتے اور خلوص دل سے ان کے لیے دعائیں مانگتے۔ کیونکہ وہ آپ کے گہرے دوست، آپ کے ہم مکتب اور بچپن کے ساتھی تھے۔ آپ کی دعاؤں کا یہ اثر ہوا کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما صحت یاب ہوگئے۔

ایک دفعہ آپ ایک نادار کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ آپ نے دیکھا کہ وہ کرب واضطراب سے تڑپ رہا ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے ٹھنڈا پانی منگوا کر اس پر دم کیا اور اس کو پلایا جس سے اس کی بے چینی جاتی رہی، پھر کچھ رقم اسے عطا کی اور فرمایا: ''اس سے اپنی ضرورت پوری کرو۔''

کاش! امام موصوف کے اس نمونہ عمل کو ہم بھی اپنائیں تاکہ اسلام کے مخالفین سمجھ جائیں اور یقین کرلیں کہ دین اسلام واقعی خلق ومحبت اور احسان ومروت کی تعلیم دیتا ہے۔ اور وہ ہمارا کردار دیکھ کر اسلام کی جانب مائل ہونے لگیں۔ تبلیغ ودعوت کے لیے صالح کردار کا ہونا بہت ضروری ہے۔ دیکھ لیجیے، عالی جناب حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے صالح کردار نے تبلیغ ودعوت کے میدان میں کتنا کام کیا کہ لوگ آپ رضی اللہ عنہ کے اخلاق عالیہ اور صفات جمیلہ کو دیکھ کر آپ کی دعوت کی طرف مائل ہوگئے۔

کیا ہمارے واعظین وذاکرین بھی پرانی لکیر کو پیٹنے کی بجائے ادھر بھی کچھ توجہ دیں

گے اور کیا اس گرانقدر اسوۂ حسینی کو اپنانے کی کوشش کریں گے؟

حیاداری

حضرت حسین رضی اللہ عنہ بہت شرمیلے اور صاحب شرم و حیا تھے۔ چھوٹی ہی عمر میں برہنہ ہونے سے نفرت کرنے لگے۔ کوئی ناشائستہ بات اور غیر مہذبانہ لفظ منہ سے نہ نکالتے۔ کوئی شخص بُری بات کہتا یا گندالفظ بولتا تو سخت نفرت کرتے اور گالی گلوچ کو تو بے حد برا جانتے۔ بلکہ اگر بس چلتا تو ڈانٹ دیتے۔ اور بے حیائی کسی طرح بھی ہو اس سے دور رہنے کی ہدایت فرماتے۔ آنکھیں نیچی رکھتے گویا ﴿يَغُضُّوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ﴾ [1] کی سچی تصویر تھے۔ ایک بار آپ سے ایک شخص نے کوئی بے ہودہ سی بات کی۔ آپ نے فرمایا: ''کیا تو نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا نہیں:

«اَلْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِّنَ الْإِيمَانِ»

''حیا ایمان کی ایک شاخ ہے۔'' [2]

اور حیا بھلائی اور نیکی کی سرمایہ دار ہے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ جس آدمی میں حیا نہیں وہ ایمان سے خالی ہے۔

آپ مستورات کے قریب سے گزرتے تو منہ ایک طرف کر لیتے یا ڈھانپ لیتے۔ اگر بے پردہ عورتوں کو دیکھتے تو انھیں پردے کی تاکید فرماتے۔ چند نوجوان لڑکیاں ننگے منہ باتیں کرتی جا رہی تھیں، آپ رضی اللہ عنہ نے دیکھا تو انھیں ڈانٹ پلائی اور فرمایا: ''مسلم زادیاں بے نقاب ہو کر باہر نہیں نکلتیں۔''

آہ! حضرت حسین رضی اللہ عنہ اگر آج کی مسلمان عورت کو دیکھتے تو حیران رہ جاتے کہ جس

---

[1] النور، 24: 30 [2] صحیح البخاری، الایمان، باب الحیاء من الایمان، حدیث: 24، وصحیح مسلم، الایمان، باب بیان عدد شعب الایمان، حدیث: 36

خاتون کو گھر میں رہنے، خانہ داری کے فرائض انجام دینے، پردہ کرنے، غیروں سے الگ رہنے، نامحرموں کی مجلس سے پرہیز کرنے کا حکم ملا تھا، وہ کس طرح سڑکوں اور بازاروں میں دندنا رہی ہے؟ کس آزادی سے ننگے سر، ننگے منہ، نیم برہنہ لباس میں پھر رہی ہے؟ اور کس بے تکلفی سے اغیار کے ساتھ دوستی بڑھاتی، محبت کی پینگیں چڑھاتی اور ان کی محفلوں کی زینت بنتی ہے؟ پھر وہ مسلمان مردوں کو دیکھتے تو اور بھی حیرت زدہ ہوتے کہ انھوں نے خود عیاشی اختیار کر کے اپنی عورتوں کو بھی عیاش بنا دیا اور مادر پدر آزاد کر دیا ہے اور کتاب وسنت کے احکام اس طرح فراموش کر دیے ہیں جیسے ان کے ساتھ ان کا کوئی تعلق ہی نہیں۔ العیاذ باللہ!

امانت داری

حضرت حسین رضی اللہ عنہ بہت متدین (دین دار) تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ ''الامین'' کے شہرۂ آفاق لقب سے مشہور اپنے محترم نانا جان صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح امانتوں کا بہت خیال رکھتے اور ان کی ادائیگی میں عجلت سے کام لیتے۔ یعنی امانت کی ادائیگی میں ذرا بھی تاخیر پسند نہ فرماتے تھے۔ اور دوسرے کی رقم اپنے استعمال میں لانے کو ممنوع جانتے تھے، ہاں، اگر اجازت مل جاتی تو اور بات تھی۔ مگر آپ پھر بھی احتیاط فرماتے۔ اگر کوئی شخص آپ رضی اللہ عنہ کے پاس امانت رکھ جاتا تو آپ اسے بہت سنبھال کر رکھتے اور اس کی انتہائی حفاظت کرتے اور اپنے گھر والوں سے کہتے کہ میری غیر حاضری میں فلاں شخص اپنی امانت لینے آئے تو اس کو دے دینا اور ہرگز تساہل سے کام نہ لینا۔

ایک بار کسی نے آپ سے پوچھا کہ نیک لوگوں کی کیا شناخت ہے؟ آپ نے قرآن کریم کی یہ آیت پڑھی:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ﴿﴾

''اور وہ لوگ جو اپنی امانتوں اور اپنے وعدوں کا خیال رکھتے ہیں۔ یعنی انھی صفات والے لوگ سچے مومن ہیں۔''[1]

اسی طرح ایک شخص نے آپ سے دریافت کیا کہ منافق کی کیا علامات ہیں؟ آپ نے حدیث مبارکہ پیش کرتے ہوئے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو آدمی امانت میں خیانت کرتا ہے وہ منافق ہے، حدیث کے الفاظ مبارکہ یہ ہیں: «إِذَا ائْتُمِنَ خَانَ» ''منافق کی ایک نشانی یہ ہے کہ جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو وہ اس میں خیانت کرتا ہے۔'' اور فرمایا: ''اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی ہے کہ کسی نے تمھارے پاس امانت رکھی ہو تو اس کو ادا کرو اور جو آدمی تم سے خیانت کرے تم اس کے ساتھ خیانت نہ کرو۔''[2]

ایک مرتبہ آپ کسی طویل سفر پر جا رہے تھے۔ آپ نے عازم سفر ہونے سے پہلے تمام امانتیں اہل خانہ کے سپرد کر دیں۔ اور فرمایا: ''یہ فلاں فلاں آدمیوں کی امانتیں ہیں انھیں ادا کر دینا، کیونکہ زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ کربلا کی طرف کوچ کرنے سے بیشتر آپ نے تمام امانتیں واپس لوٹا دی تھیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کے نام لیواؤں کو بھی امانت داری کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

اور خوب یاد رکھو! حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا صرف نام لینے سے بات نہیں بنے گی بلکہ آپ رضی اللہ عنہ کا مبارک طریقہ اپنانے سے بات بنے گی، ہم ان کی امانت ودیانت دیکھیں اور آج اپنے حالات دیکھیں۔ اور پھر بتائیں کہ کیا ہمارے اندر ان کے اوصاف کی کوئی رمق موجود ہے؟ اگر نہیں ہے تو پیدا کریں۔ اور اگر ہے تو اللہ کا شکر بجا لائیں۔

---

[1] المؤمنون، 23: 8. [2] سنن أبي داود، البيوع، باب في الرجل يأخذ حقه من تحت يده، حديث: 3535، وجامع ترمذي، البيوع، باب 38، حديث: 1264.

قرابت داروں سے سلوک

حضرت حسین رضی اللہ عنہ اپنے اعزہ واقرباء سے بھی حسن سلوک سے پیش آتے اور درجہ و مرتبہ کے مطابق ان کی خدمت کرتے، ان سے محبت روا رکھتے۔ جو سن رسیدہ ہوتے تو ان کی اور زیادہ عزت کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''حضرت حسین رضی اللہ عنہ قرابت داروں کو سمجھنے اور ان کے حقوق ادا کرنے میں ہم سب سے بڑھے ہوئے تھے۔ جہاں جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلقات تھے حضرت حسین رضی اللہ عنہ ان سب کا خیال رکھتے تھے حتیٰ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے متعلقین واعزہ کے حقوق کو بھی نظر انداز نہ کرتے تھے۔''

ایک دفعہ ایک شخص آپ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میں ام المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے خاندان اور برادری سے تعلق رکھتا ہوں، یعنی میں ان کا قریبی ہوں۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اس کا احترام کیا، تعظیم سے بٹھایا، خاطر مدارات کی اور جب وہ جانے لگا تو اسے نقدی اور تحائف دے کر رخصت کیا۔

ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے گھر کوئی مہمان آیا اور آپ کو پتہ چلا کہ وہ آپ کی نانی جان حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے پہلے شوہر سے کچھ تعلق رکھتا ہے، آپ نے اس کی دعوت کی اور اس سے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے متعلق کئی معلومات حاصل کیں اور دیر تک اس کے ساتھ گفتگو فرماتے رہے اور اپنی نانی جان محترمہ کو یاد کرتے رہے، حالانکہ خدیجہ کبریٰ رضی اللہ عنہا آپ رضی اللہ عنہ کی ولادت سے کئی برس پہلے فوت ہوچکی تھیں۔ جب وہ آدمی رخصت ہونے لگا تو آپ نے اسے کچھ ملبوسات اور تحائف عنایت فرمائے۔

جدّات رضی اللہ عنہن کی فرمانبرداری

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی حقیقی نانی جان یعنی حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا تو آپ کی پیدائش سے قبل ہی بہشت سدھار چکی تھیں، لیکن دوسری نانیاں یعنی حضرت فاطمۃ الزّہرا رضی اللہ عنہا کی سوتیلی مائیں آپ رضی اللہ عنہ نے بہت دیکھی ہیں، یعنی آٹھ نانیوں کی خدمت گزاری کا آپ رضی اللہ عنہ کو موقع ملا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی بھرپور خدمت میں رہا کرتے تھے۔ ان کی فرمانبرداری بھی کرتے تھے اور ان سے علمی فوائد ومنافع بھی حاصل کرتے تھے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حسین بن علی رضی اللہ عنہما نے ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی پاک صحبتوں سے نفع حاصل کیا۔ آپ ان سے مسائل پوچھتے اور حدیث سنتے تھے۔ سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جو حکم دیتیں آپ خندہ پیشانی سے بجالاتے اور ان کی بہت تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ ام المومنین ام حبیبہ رضی اللہ عنہا جناب ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی بیٹی تھیں، حضرت حسین رضی اللہ عنہ ان کی بھی بہت عزت کرتے تھے۔ غرض تمام جدّات رضی اللہ عنہن کی آپ نے بہت خدمت کی اور ان کی نافرمانی کو گناہ سمجھا۔ آپ کی سب نانیاں بھی آپ سے بہت محبت کرتی تھیں۔ اور جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حسین رضی اللہ عنہ کے لاڈ دیکھتے اور ان کو چاہتے اور ان کو دیکھے بغیر چین نہ لیتے تھے اور جس طرح حضرت علی اور فاطمہ رضی اللہ عنہما ان سے پیار کرتے تھے، اسی طرح آپ کی عظیم جدّات رضی اللہ عنہن بھی ان سے شفقت کرتی اور ان کے ناز اٹھاتی تھیں۔

بہن بھائیوں سے محبت

حضرت حسین رضی اللہ عنہ اپنے بھائیوں اور بہنوں سے بھی بہت محبت رکھتے تھے، آپ رضی اللہ عنہ

کے سوتیلے بھائی بھی تھے مگر آپ رضی اللہ عنہ اپنے برادر اکبر حضرت حسن رضی اللہ عنہ میں اور ان میں کوئی فرق نہیں سمجھتے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ کی ایک ہمشیرہ سیدہ اُم کلثوم رضی اللہ عنہا تھیں، جو سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ خلیفہ ثانی کے عقد میں تھیں۔ آپ رضی اللہ عنہ ان سے بہت محبت رکھتے تھے۔ جب عمر فاروق رضی اللہ عنہ وفات پا گئے اور ام کلثوم رضی اللہ عنہا بیوہ ہوگئیں تو ان کا دوسرا نکاح سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے بیٹی کے ایماء سے عون بن جعفر رضی اللہ عنہ سے کر دیا۔[1]

پھر جب ام کلثوم رضی اللہ عنہا وفات پا گئیں تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ اشکبار آنکھوں سے ان کے جنازے میں شریک ہوئے۔ اور بعد میں ان کی قبر پر جا کر بہت دعائے مغفرت کیا کرتے تھے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ آپ کے بڑے بھائی تھے، حسین رضی اللہ عنہ ان کی بڑی عزت کرتے اور ان سے محبت رکھتے تھے، سفر کو جاتے تو ان سے معانقہ کرتے، سفر سے آتے تو ان سے گلے ملتے۔ آپ رضی اللہ عنہ بہنوں کو تحفے تحائف بھیجتے رہتے اور ان کی ضروریات کا خیال رکھتے۔ آپ کی بہنیں بھی آپ پر جان چھڑکتی تھیں، چنانچہ سیدہ زینب رضی اللہ عنہا تو معرکہ کربلا میں بھی آپ کے ساتھ رہیں اور ایسا ساتھ دیا کہ آپ کی خاطر اللہ کی راہ میں اپنے فرزند قربان کر دیے۔

اگر کوئی بہن بھائی یا بھائی بھائی آپس میں لڑ پڑتے تو آپ رضی اللہ عنہ فوراً ان میں صلح کرا دیتے اور فرماتے کہ بہن بھائی کی محبت لڑنے کے لیے نہیں ہوتی، خوش رہنے اور اتحاد قائم رکھنے کے لیے ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں آپ رضی اللہ عنہ کی سیرت کے اس پہلو کو بھی اپنانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ افسوس! ہم آپ رضی اللہ عنہ کی مبارک زندگی کا یہ پہلو تقریباً فراموش کر چکے ہیں جبکہ ہمیں اسے فراموش نہیں کرنا چاہیے تھا۔

---

[1] دیکھیے شیعی کتب، مگر شیعہ دوست پھر بھی اس رشتے کا انکار کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ اس رشتہ سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی اہلبیت رضی اللہ عنہم سے رشتہ داری ظاہر ہوتی ہے۔ شاید انھیں یہ گوارا نہیں۔

حلیہ مبارک

شبیہ اقدس

جسم مبارک سینہ سے ٹخنوں تک آنحضرت ﷺ سے مشابہت رکھتا تھا،[1] چہرہ خوبصورت تھا اور اس سے وجاہت ٹپکتی تھی، آنکھوں میں چمک تھی، نگاہ میں رعب تھا، پلکیں گھنی اور لمبی تھیں، دانت مقطر سفید اور چمکیلے تھے، دہن نہ زیادہ تنگ نہ زیادہ چوڑا، ہونٹ متوسط اور نیم گلابی، پیشانی کشادہ، ناک اونچی، بھویں ہلالی، کانوں پر باریک رُوئیں، گردن مضبوط، داڑھی بڑی اور گھنی، مونچھیں کتراتے تھے، لب و ریش کی وضع جناب رسول اللہ ﷺ کی لب و ریش مبارک جیسی تھی، قد میانہ تھا، رنگ نہ تو بالکل گندمی تھا نہ بہت سفید، جوانی میں رخساروں پر سرخی جھلکتی تھی، لیکن بعد میں عمر کے لحاظ سے قدرے کمی واقع ہوگئی، سر کے بال گاہے کترا دیتے گاہے رکھ لیتے، لیکن سنت طریقہ کے مطابق بال رکھتے۔ سینے پر بال تھے، مگر بہت گھنے نہ تھے، شانے کشادہ اور موٹے، اعضائے بدن بہت متناسب اور گوشت سے گتھے ہوئے، جن سے قوت و ہمت، جرأت وشجاعت نمودار ہوتی تھی، اپنے والد معظم رضی اللہ عنہ کی طرح جھوم کر چلتے تھے اور یہ رفتار عرب میں شریفانہ اور شجاعانہ سمجھی جاتی تھی، دست و پا میں مضبوطی اور پختگی تھی۔ آپ رضی اللہ عنہ کو دیکھ کر دبدبہ پیدا ہوتا تھا۔

① جامع ترمذی، المناقب: باب مناقب ابی محمد الحسن بن علی رضی اللہ عنہما، حدیث:3779.

آواز

آپ ﷺ کی آواز میں کسی قدر غنہ تھا، یعنی ذرا ناک سے آواز نکالتے تھے، جو بہت پیاری لگتی تھی اور ایسی آواز عرب کے ہاں خوش کلامی، فصاحت اور شیریں بیانی کی دلیل سمجھی جاتی تھی۔ اسی آواز کی بدولت آپ ﷺ کی تلاوتِ قرآن نہایت مؤثر اور جاذب تھی۔ اور جو آپ ﷺ کی تلاوت سنتا وہ سنتا ہی رہتا۔ آپ آواز میں سختی اور تیزی کو ناپسند جانتے تھے۔ آپ کی آواز میں بہت سوز و گداز اور دھیما پن تھا۔

خضاب

جب بال سفید ہو گئے تو سر اور داڑھی میں مہندی اور وسمہ لگاتے تھے، جس سے اور حسین و خوبصورت لگتے تھے۔

مسئلہ یاد رکھیے! بالوں کو سفید چھوڑنے کی بہ نسبت رنگنا بہتر ہے۔ صرف مہندی سے رنگنا بھی جائز بلکہ بہتر ہے لیکن مہندی اور وسمہ ملا کر رنگنا بھی درست اور جائز ہے۔ جو آدمی کو پسند ہو، اور جس سے اس کا مومنانہ پیکر و جیہہ نظر آئے۔ اور دوسرے بھی اس جیسا بننے کی کوشش کریں یعنی داڑھی رکھنے کی خواہش کریں۔ لیکن یاد رکھیے بال سیاہ کرنا منع ہے۔

حضرت حسین ﷺ کو رنگین داڑھی بڑی بھلی لگتی تھی۔ آپ ﷺ کے ماننے اور چاہنے والوں کو بھی ان باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ یعنی داڑھی پوری رکھیں اور ضرورت محسوس کریں تو آپ ﷺ کے مطابق اسے رنگ لیں، مگر سیاہ رنگ نہ کریں۔ کیونکہ سیاہ رنگ کرنا ممنوع ہے۔ آنحضرت ﷺ نے سختی سے اس سے منع فرمایا تھا۔ مگر جس کی داڑھی مونڈھی ہوئی یا جو کے برابر ہو وہ غریب کیا خیال رکھے گا؟

داڑھی رکھنا کوئی معمولی یا عام سنت نہیں بلکہ اسے وجوب کا درجہ حاصل ہے۔ اس کا

مونڈھنا حرام ہے۔ نبی کریم ﷺ کو داڑھی منڈھوانے والے شخص سے شدید نفرت تھی۔ ایک مرتبہ دربار کسریٰ کا ایک سفیر جو داڑھی مُنڈھا تھا آپ ﷺ کی بارگاہ میں آیا، آپ ﷺ نے چہرۂ اقدس دوسری طرف پھیر لیا اور اس کی طرف نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

حضرت نبی کریم ﷺ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ سب کی بڑی پیاری داڑھیاں تھیں۔ ایک بھی نبی، ایک بھی صحابی، ایک بھی ولی داڑھی کے بغیر نہ تھا۔ حیرت ہے کہ ان لوگوں پر جنھیں حضرت حسین و حضرت علی رضی اللہ عنہما سے بے پناہ محبت کا دعویٰ ہے مگر ان کے مبارک حلیوں اور حد درجہ پیاری صورتوں سے نفرت ہے۔ معلوم نہیں ایسے کیوں ہے؟ شاید ہی کوئی ہوگا جس نے ان جیسی داڑھی سجائی ہو۔ ورنہ ہم نے تو 99% دوست بڑی مونچھوں والے اور داڑھی کے بغیر دیکھے۔ خود کہیے یہ محبت کیسی محبت ہے؟ ایسی محبت وعقیدت کو سچی محبت وعقیدت کہنا کہاں تک درست ہے؟ اللہ ہمیں اپنا اندر اور باہر ان جیسا بنانے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین

ناراض ہونے کی بات نہیں ہمارے واعظین و ذاکرین کو اپنی صورتیں دیکھنی چاہئیں؟ اور انھیں حضرت علی و حسین رضی اللہ عنہما جیسا بنانا چاہیے۔ لیکن افسوس کہ انھوں نے عام طور پر عظیم ہستیوں سے الٹ شکلیں بنا رکھی ہیں۔

لباس

بچپن کا لباس کچھ اور تھا یعنی وہی تھا جو بچے پہنتے تھے۔ مگر بالغ ہونے پر آپ شرعی پوشاک کے پابند ہوگئے، وہی پہنتے تھے جو آنحضرت ﷺ کی پوشاک سے ملتی جلتی تھی، جُبہ پہنتے تھے، سر پر پگڑی ہوتی اور کبھی ٹوپی، چادر ہمیشہ پاس رکھتے، تہبند یا لنگی آدھی پنڈلیوں تک یا ذرا نیچے باندھتے۔ کبھی پاجامہ پہنتے تو وہ بھی ٹخنوں سے اونچا ہوتا، کیونکہ یہ طریقہ سنت ہے۔ محبان اہل بیت شیعہ ہوں یا سنّی سب کو اس طریقہ کا خیال رکھنا چاہیے۔ سچا محب اپنے محبوب کی ہر ادا کو اپنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور وہ محبوب

سے بہتر کسی کی ادا کو نہیں سمجھتا۔ آپ رضی اللہ عنہ ہم سب کے نہایت محبوب ہیں۔ ہمیں آپ رضی اللہ عنہ کی اداؤں کو بھی محبوب رکھنا چاہیے آپ رضی اللہ عنہ کے کپڑے عام طور پر سادہ ہوتے، ہاں! کبھی کہیں سے تحفے میں قیمتی کپڑے آ جاتے تو وہ بھی استعمال کر لیتے، بشرطیکہ وہ ریشمی یا زرکار نہ ہوتے، لباس ڈھیلا ڈھالا ہوتا، تنگ پوشاک کو پسند نہ کرتے، کرتہ گھٹنوں سے نیچے قریب قریب ٹخنوں تک ہوتا مگر ٹخنوں کے نیچے ہرگز نہ ہوتا، کیونکہ ممنوع اور سنت کے سراسر خلاف ہونے کی وجہ سے ایسا کرنا گناہ ہے۔

آج کل سعودیہ کے عام لوگ اس اہم مسئلے کی پروا نہیں کرتے، جو ان کی کمزوری ہی شمار ہوگی۔ انھیں اپنا لباس ٹھیک کرنا چاہیے حضرت حسین رضی اللہ عنہ جو لمبا کرتہ استعمال فرماتے، بسا اوقات نیچے صدری بھی ہوتی۔

خوشبو

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بھی اپنے نانا محترم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح خوشبو مرغوب تھی۔ اگر مل جاتی تو روزانہ استعمال فرماتے، ورنہ جمعہ کے روز اور عیدین کے موقع پر ضرور لگاتے، کربلا میں بھی خوشبو ساتھ لے گئے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ کا حدیث: «كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُحِبُّ الطِّيبَ» (نبی صلی اللہ علیہ وسلم خوشبو کو پسند کرتے تھے) پر باقاعدہ عمل تھا۔ سنت رسول سمجھ کر جو بھی کام کیا جائے اس کا ثواب ملتا ہے۔

سواری

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کبھی اونٹ اور ناقہ کی سواری کرتے تھے اور کبھی گھوڑے کی، آپ رضی اللہ عنہ کے پاس تین گھوڑے تھے۔ ایک کا نام محموم، دوسرے کا لاحق اور تیسرے کا نام ذوالجناح تھا۔ یہ سفید تھے، محرم الحرام میں اہل تشیع اسی (ذوالجناح) کی نقل اتارتے اور ''ذوالجناح'' مع تابوت وعلم نکالتے ہیں، جو ناجائز ہے۔ ان کے اس فعل

پر کوئی شرعی دلیل نہیں ہے۔ اور اس کے بارے میں جو عقیدہ رکھا جاتا ہے اور ''فیض'' بانٹا جاتا ہے وہ بسا اوقات شرک یا مفضی الی الشرک ہوتا ہے، جس سے بہت دور رہنا چاہیے، دُلدل نام کا ایک خچر بھی آپ رضی اللہ عنہ کو ترکہ میں ملا تھا جو پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھا، ان سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو ملا، ان سے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے پایا اور ان سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو دستیاب ہوا، سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے بھی اس کی سواری کی ہے۔

انگوٹھی

کہتے ہیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ چاندی یا کسی اور دھات کی انگوٹھی بھی پہنتے تھے، جس پر کچھ الفاظ کندہ تھے۔ لیکن سونے کی انگوٹھی کبھی نہیں پہنی۔ کیونکہ اس کا پہننا شرعاً حرام ہے۔ لہٰذا شیعہ سنّی کوئی بھی ہو اسے اس امر حرام سے یکسر اجتناب کرنا چاہیے۔ ورنہ اس کی حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت درست نہ ہوگی۔

وہ روایات قطعاً غلط ہیں جن میں ہے کہ آپ کو جبرائیل علیہ السلام نے ایک انگوٹھی پہنائی تھی جس پر ''السید الشھید'' لکھا ہوا تھا اور وہ ایسی دھات سے بنی تھی جس کا دنیا میں وجود نہیں ہے۔ بھلا وہ کون سی دھات ہے؟ جھوٹ ہی بنانا ہو تو ایسا بنانا چاہیے جو ماننے کے قابل ہو۔ ایسی روایات گمراہ کن ہیں، ہمیں اس قسم کی بے سروپا باتوں کے بیان کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ جھوٹی اور خود ساختہ باتوں کو شہرت دینے سے احتیاط کرنی چاہیے۔ خصوصاً وہ باتیں جن کو رواج دینے سے شریعتِ مطہرہ کا حلیہ بگڑنے اور عقائد کو دھچکا لگنے کا خطرہ ہو۔ اس بے احتیاطی سے بداعتقادی جنم لیتی ہے جو بالآخر آدمی کو جہنم میں لے جاتی ہے۔ اللہ سب مومنین اور مومنات کو جہنم سے بچائے۔ (آمین، ثم آمین)

برتن

حضرت حسین رضی اللہ عنہ معمولی برتنوں ہی میں کھاتے پیتے تھے، کوئی خاص برتن نہ بنوا رکھے تھے۔ اور یہ جو مشہور ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کے لیے برتن آسمان سے اترے تھے۔ ایک طشت،

ایک کٹورا اور ایک آبخورہ تھا، یہ بے سروپا اور من گھڑت باتیں اور تراشیدہ افسانے ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ اللہ نے آپ کے واسطے شربت اور کھیر سے بھرے ہوئے چھوٹے چھوٹے کوزے بھیجے تھے اور حکم دیا تھا کہ سب مسلمان ہر سال محرم میں ایسے ہی مٹی کے کوزے بنوا کر شربت کھیر وغیرہ سے بھر کر اماموں کے نام پر دیا کریں، مگر یہ سب ڈھکوسلے ہیں جو شرک و بدعت میں داخل ہیں، جو اسلام اور شریعت اسلام کے منافی ہونے کی بنا پر باعث عذاب ہیں۔ ایسے مسائل ظاہر ہے سامان خورد ونوش کو رواج دینے کے لیے گھڑے گئے ہیں۔ غالباً ہمارے ملک میں عاشورہ کے ایام میں اسی ''حکم'' کے تحت اماموں کے کوزے بھر کر تقسیم کیے جاتے ہیں اور نہ صرف شیعہ اس گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں، بلکہ ان کی دیکھا دیکھی بہت سے سنّی بھائی بھی ان خودساختہ باتوں پر عمل کر کے اپنی نیکیاں برباد کر لیتے ہیں۔

پھر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جن ظروف میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کھاتے پیتے تھے، ان کو نہ کوئی ہاتھ لگا سکتا تھا، نہ استعمال کر سکتا تھا۔ یہ بھی اسلام کو ضعف پہنچانے والی بات ہے، کیونکہ اسلام تو اخوت ومساوات کا پیغام لے کر آیا ہے اور اس سے اسلامی برابری اور برادری کی تردید ہوتی ہے۔ ایسے نظریات سے بچنا اور گریز کرنا نہایت ضروری ہے۔ آپ خود کہیے جہاں اس قسم کے افکار ونظریات کی حکمرانی ہو وہاں قرآن وسنت کی کیا اہمیت یا ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟

افسوس! آج ہمارے کلمہ گو مسلمان ان خودساختہ مسائل کو اپنا کر قرآن وحدیث کو پس پشت ڈال رہے ہیں۔ جہاں مسلمانوں کا یہ حال ہو وہاں اسلام سربلند ہو تو کیسے ہو؟ قرآن وحدیث کی مخالفت کر کے نبی ﷺ واہلِ بیت سے رشتہ جوڑنا اور اسلام کو سربلند کرنا سب جھوٹ اور دھوکا ہے۔

ع......ایں خیال است ومُحال است وجنوں

سیّدنا حسین رضی اللہ عنہ کے ادبی محاسن

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ ایک بے عدیل شاعر اور بے نظیر ادیب تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ کی تحریر مثل کہکشاں روشن و درخشاں اور آپ رضی اللہ عنہ کی تقریر بوئے گل کی طرح معطر و جاذب ہوتی تھی جس میں دریا کی سی روانی، سرو و چمن کی سی شادابی اور شبنم کا سا نکھار ہوتا تھا۔ مگر واضح رہے کہ آپ کا کلام، آپ کا قلم، آپ رضی اللہ عنہ کا علم و ادب اسلام کی خدمت و اشاعت اور اس کے محامد و مکارم بیان کرنے کے لیے وقف تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ شعر و سخن میں اللہ تعالیٰ کی توحید، اس کی صفات، اس کی کبریائی حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور دوسرے مسائل کا ذکر فرماتے، خطابت اور کتابت میں بھی امور دینیہ ہی کا تذکرہ کرتے۔ آپ رضی اللہ عنہ اپنے علم و ادب اپنے شعر و سخن کو بے جا استعمال میں نہ لاتے۔ جیسا کہ عام شعراء کا طریقہ بلکہ وطیرہ ہے۔

کاش! کہ زمانہ حاضر کے شاعر اور ادیب خصوصاً "ترقی پسند" شاعر اور ادیب سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے اسلوب و طریق پر چلیں اور اپنی زبان و قلم کو فحش گوئی اور عریاں نویسی میں نہ لتھڑیں۔

افسوس! ہمارے اکثر شعراء و ادباء نے شعر و ادب کا مفہوم غلط سمجھا ہے اور اس کا معیار ایسا گھٹیا قائم کر لیا ہے، جس سے قوم کوئی نصیحت اور سبق لینے کے بجائے گمراہی و تباہی کی طرف پہنچ جاتی ہے۔

ذیل میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی گرانقدر اور بابرکت تحریر و تقریر اور شعر و سخن کے چند نمونے درج کیے جاتے ہیں:

ایک مکتوب میں اہل بصرہ کو تحریر فرماتے ہیں:

''جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق میں برگزیدہ بنایا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑی عزت بخشی، رسالت کے انعام سے نوازا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کی بہتری اور نجات کے لیے پیغام الٰہی کی تبلیغ فرمائی۔ اس کے بعد واضح ہو کہ ہم ملت میں افتراق و انتشار پھیلانا سخت ناپسند کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری اور سب لوگوں کی لغزشیں معاف فرمائے۔ میں اپنے اس خط کے ذریعے آپ لوگوں کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کرنے کی دعوت دیتا ہوں، اس وقت سنت مردہ اور بدعت زندہ ہو چکی ہے۔ میں آپ حضرات کو حق قائم رکھنے اور بدعتوں کو ملیا میٹ کرنے کی نصیحت کرتا ہوں، اگر آپ نے میرے کہنے پر عمل کیا تو آپ یقیناً سیدھی راہ پر چلنے لگیں گے اور صراط مستقیم کو پالیں گے۔''[1]

اس خط کا ایک ایک لفظ پڑھیے اور غور کیجیے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ امت کے نفاق و عناد، افتراق و انتشار، قتل و خونریزی کو کس قدر ناپسند کرتے۔ اس سے خود بھی احتراز کرتے اور دوسروں کو بھی اس سے بچنے کی تلقین فرماتے اور سب کو قرآن مجید اور سنت نبوی پر چلنے کی دعوت دیتے اور ان دونوں پر عمل کرنے کو صراط مستقیم سمجھتے۔ نیز بدعات و محدثات سے سخت بیزار و متنفر نظر آتے ہیں اور بار بار تاکید فرماتے ہیں کہ جیسے بھی ممکن ہو، بدعتوں کو مٹایا جائے اور کلام حق و کلام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو زندہ رکھا جائے۔

اب آپ رضی اللہ عنہ کی تقریر کا ایک نمونہ دیکھیے! جس وقت سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے ساتھ کوفیوں کا ایک لشکر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف لڑنے کے لیے روانہ ہوا، اس وقت

---

[1] تاریخ طبری: 357/5.

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے فوج کو مخاطب کر کے فرمایا:

''اے اہل کوفہ! آپ ہمارے مخلص اور قریبی دوست ہیں، آپ کا اولین فرض یہ ہے کہ جنگ کی ہولناک آگ بجھانے اور سرد کرنے کی کوشش کریں، کیونکہ جنگ ہر حالت میں حد درجہ تشویش ناک ہوتی ہے، اس کا انجام ہلاکت خیز ہے، اس کا ذائقہ بہت برا ہے، جس نے بھی جنگ میں عجلت کی، اس نے قوم کو نقصان پہنچایا اور اپنے آپ کو بھی ہلاکت میں ڈالا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ فتح یاب ہو کر واپس آئیں۔''[1]

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی اس مختصر مگر جامع تقریر کا ایک ایک فقرہ صلح و آشتی اور امن و سلامتی کا پیغام دے رہا ہے۔ فوج فریق مخالف سے جنگ کرنے جارہی ہے لیکن کیسی عجیب بات ہے کہ اس کا کمانڈر اس کو مشتعل کرنے اور ابھارنے کی بجائے جنگ کو ختم کرنے، اس سے گریز کرنے، اس سے بچنے، اس میں عجلت نہ کرنے اور قوم کو اس سے بچانے کی نصیحت کر رہا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ جنگ کے حامی تھے نہ سیدنا حسن و حسین رضی اللہ عنہما جنگ کرنا چاہتے تھے اور نہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ جدال و قتال کے طلب گار تھے بلکہ یہ سب کچھ فریقین کے ان سازشیوں اور فتنہ گروں کی شرارتوں سے ہو رہا تھا جو دونوں کو لڑا کر تماشا دیکھتے اور دین و ملت کو نقصان پہنچاتے تھے۔ اس کی تفصیل آئندہ صفحات پر سیدنا علی اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہما کے بیان میں آرہی ہے۔ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی تقریر و تحریر کے کچھ اور نمونے بھی وہیں مل جائیں گے۔

آپ کے چند اشعار ذیل میں ملاحظہ کیجیے...... مصائب و مشکلات میں اللہ کریم کی طرف رجوع کرنے سے متعلق فرماتے ہیں۔

---

[1] ابن عساکر: 328,327/4، و شرح نہج البلاغة مصری، ج-3.

إِذَا مَا عَضَّكَ الدَّهرُ فَلَا تَجْنَحْ إِلَى الْخَلْقِ

وَلَا تَسْأَلْ سِوَى اللّٰهِ تَعَالیٰ لَا قَاسِمَ الرِّزْقِ

''اگر تجھے زمانہ مصیبت میں مبتلا کر دے تو خلقت سے امداد نہ مانگ، بلکہ اللہ تعالیٰ سے اس کے دور کرنے کی التجا کر، کیونکہ رزق دینے والا وہی ہے۔''

دنیا کی بے تکلفی اور قناعت واستغناء کی نسبت کہتے ہیں...... ؎

اِغْنِ عَنِ الْمَخْلُوقِ بِالْخَالِقِ تَغْنَ عَنِ الكَاذِبِ وَالصَّادِقِ

وَاسْتَرْزِقِ الرَّحْمٰنَ مِنْ فَضْلِهٖ فَلَيْسَ غَيْرُ اللّٰهِ مِنْ رَازِقِ

مَنْ ظَنَّ أَنَّ النَّاسَ يَغْنُوْنَهٗ فَلَيْسَ بِالرَّحْمٰنِ بِالْوَاثِقِ

وَظَنَّ أَنَّ الْمَالَ مِنْ كَسْبِهٖ زَلَّتْ بِهِ النَّعْلَانُ مِنْ خَالِقِ

''اگر تجھ کو جھوٹی اور سچی ہر قسم کی مخلوق سے بچنا ہے تو اس سے تعلق توڑ کر صرف اللہ سے لو لگا لے۔

اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی روزی رساں نہیں ہے، وہی رحمان ہے اور تُو اسی رازق سے روزی کی التجاء کر۔

جو شخص یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ دنیا کے لوگ اس کو بے نیاز کر سکتے ہیں، وہ غلطی پر ہے اور اس نے اللہ پر بھروسا نہیں کیا۔

اگر اس کا یہ خیال ہو کہ مال و دولت اپنی کمائی سے حاصل ہوتی ہے اللہ سے نہیں ملتی، تو وہ ہلاکت کی طرف چلا گیا۔''

فانی دنیا کی حقیقت یوں کھولتے ہیں ؎

قَدْ عَرَفْنَاكَ يَا مُنْغِصَةَ الْعَيْشِ

وَيَا دَارَ كُلِّ فَانٍ وَّوَبَالٍ

''اے دنیا! ہم تجھے خوب جانتے ہیں تو زندگی کو خراب کرنے والی ہے، تو وہ گھر ہے جس کی ہر شے فانی اور وبال پذیر ہے۔''

جہاد فی سبیل اللہ کی تعریف یوں فرماتے ہیں ۔

وَاِنْ تَكُنِ الْاَبْدَانُ لِلْمَوْتِ اُنْشِئَتْ

فَقَتْلُ امْرِئٍ فِي اللّٰهِ بَالسَّيْفِ اَجْمَلُ

''اگر انسان کا جسم بالآخر موت سے فنا ہونا ہے تو پھر مرنے کا بہترین طریق یہ ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں تلوار چلاتا ہوا قتل ہو جائے۔''

آخرت کی مدح میں لکھتے ہیں ۔

لَئِنْ كَانَتِ الدُّنْيَا تُعَدُّ نَفِيسَةً

فَدَارُ ثَوَابِ اللّٰهِ أَعْلَىٰ وَاَنْبَلُ

''دنیا اگرچہ بڑی نفیس و مرغوب ہے لیکن اللہ سے اجر ملنے کا گھر دار الآخرت تو اس سے کہیں بہتر اور بہت خوبیوں والا ہے۔''

کثرت حرص کے متعلق نصیحت فرماتے ہیں...... ۔

وَاِنْ كَانَتِ الْاَرْزَاقُ قَسْمًا مُقَدَّرًا

فَقِلَّةُ حِرْصِ الْمَرْءِ بِالْكَسْبِ اَجْمَلُ

''جب آدمی کی قسمت میں اس کی روزیاں لکھی جا چکی ہیں تو پھر یہی بہتر ہے کہ وہ زیادہ مال کی حرص کو کم کر دے۔''

اپنے دوستوں کی بے وفائی اور اپنے ساتھیوں کی بے مہری اور اپنی مشکلات وغیرہ کے بارے میں یہ اشعار ارشاد فرمائے......

ذَهَبَ الَّذِيْنَ أُحِبُّهُمْ وَبَقِيتُ فِي مَنْ لَا أُحِبُّهٗ

''میرے دوست رخصت ہو چکے اور جو زندہ ہیں وہ میرے دوست نہیں۔''

(مطلب یہ کہ بعد والے لوگ پہلوں جیسے نہیں ہو سکتے۔)

فِي مَنْ أَرَاهُ يَسُبُّنِي ظَهْرَ الْمَغِيْبِ وَلَا أَسُبُّهٗ

''یہ مجھے پیٹھ پیچھے گالیاں دیتے ہیں، مگر میں انھیں گالیاں نہیں دیتا۔''

(ہر باکمال و باکردار شخص کے ساتھ ایسا سلوک ہوتا رہا ہے۔)

يَبْغِي فَسَادِي مَا اسْتَطَاعُوا وَأَمْرُهٗ مِمَّا أَرُبُّهٗ

''وہ میری بربادی چاہتے ہیں......اور میں ان کی بھلائی کا خواہش مند ہوں۔''

(کتنا بلند ہے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا کردار!!)

حنقا يدب لي الصرا وَ ذَاكَ مِمَّا لَا أَدُبُّهٗ

''وہ میرے ساتھ دشمنی اور فریب کرتے ہیں......لیکن میں ان سے ایسا نہیں کرتا۔''

وَيَرٰى ذُبَابَ الشَّرِّ مِنْ حَوْلِ يَطِنُّ وَلَا يَذُبُّهٗ

''وہ مجھے شر و مصیبت میں دیکھتے ہیں......مگر مجھے بچانے کے لیے نہیں آتے۔''

وَإِذَا خَبَا وَغْرُ الصُّدُورِ فَلَا يَزَالُ بِهِ يَشُبُّهٗ

''وہ اپنا کلیجہ ٹھنڈا ہو جانے پر بھی آتشِ انتقام کو بھڑکاتے رہتے ہیں۔''

أَفَلَا يَرٰى مِنْ فِعْلِهِ مَا قَدْ يسور إِلَيْهِ غِبُّهٗ

''کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ان کی بدعملیوں کا نتیجہ ان کے سامنے ہے؟''

حَسْبِي بِرَبِّي كَافِياً مَا اخْتَشِي وَالْبَغْيُ حَسْبُهُ

"مجھے اپنے رب پر بھروسہ ہے اور ان کو ظلم و زیادتی کا سہارا ہے۔"

وَ لَقَدْ مَنْ يَبْغِي عَلَيْهِ فَمَا كَفَاهُ اللّٰهُ رَبُّهُ

"جو شخص زیادتی سے کام لیتا اور چڑھائی کرتا ہے کیا رب تعالیٰ اس کے لیے کافی نہیں ہے؟"

(وہ کون سا مظلوم ہے، جس کے لیے اللہ تعالیٰ کافی نہیں ہوتا؟)

القصہ سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے کلام میں ہر حالت میں اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسا رکھنے، اسی سے فریاد و استمداد کرنے اور اسی کے دربار میں جھکنے کی ہدایت فرمائی ہے اور شرک و بدعت کا استیصال کیا ہے۔

آپ رضی اللہ عنہ کے کلام میں کس قدر اسرار و رموز پنہاں ہیں۔ ملاحظہ کریں۔ آپ رضی اللہ عنہ نے جو کچھ فرمایا، اس کا خلاصہ ہے:

"ہر دکھ، تکلیف میں اللہ ہی سے مدد چاہو، اس کے علاوہ بھلا کون دکھ دور کر سکتا ہے؟ مخلوق سے بے نیاز ہو کر خالق سے لو لگاؤ۔ اس کے علاوہ کوئی رازق نہیں۔ لوگوں پر اعتماد کرنے والا غلطی پر ہے۔ ایسے شخص کا دراصل اللہ تعالیٰ پر بھروسا نہیں۔ مال و دولت کا انحصار اپنی محنت پر نہیں اللہ تعالیٰ کی رحمت پر ہے۔ جو شخص صرف اپنی محنت پر انحصار کرتا ہے وہ ہلاکت کی طرف جاتا ہے۔"

مزید فرمایا: "دنیا فانی اور بے حقیقت ہے۔ موت سے کسی کو مفر نہیں۔ بہترین موت وہ ہے جو راہِ حق میں لڑتے ہوئے آئے۔ دنیا اگرچہ بہت دلکش ہے، لیکن آخرت اس سے بہت بہتر اور عمدہ ہے۔ جب رزق آدمی کی قسمت میں لکھا جا چکا ہے تو پھر حرص کم کر دینی چاہیے، مناسب حد تک محنت کرو جو مقدر میں ہوگا مل کر رہے گا۔"

اور فرمایا: ''اصل لوگ دنیا سے جا چکے ہیں جو باقی ہیں یہ ان جیسے نہیں۔ جو لوگ مجھے برا کہتے ہیں میں انھیں برا نہیں کہتا۔ وہ لوگ میری بربادی چاہتے مگر میں ان کی بھلائی چاہتا ہوں۔ وہ میرے ساتھ دشمنی اور دغا کرتے ہیں مگر میں ایسا نہیں کرتا۔ وہ لوگ میری مصیبت دیکھتے ہیں مگر میری مدد نہیں کرتے۔ (ایک وہ مدد ہے جو اللہ کرتا ہے اور ایک وہ مدد ہے جو بندہ کرتا ہے یہاں دوسری مدد مراد ہے۔)

فتنہ پرداز لوگ آتش فساد بھڑکانے میں لگے رہتے ہیں ان کا مشن ہی یہی ہے۔ کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ان کی بداعمالیوں کا نتیجہ ان کے سامنے ہے؟

ایک موقع پر یوں بھی فرمایا: ''مجھے رب کا سہارا ہے اور انھیں شرارت کا، کوئی ایسا مظلوم نہیں جسے اللہ کافی نہ ہو۔''

قارئین! حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا عقیدہ وعمل، توحید، توکل، صبر، زہد، قناعت، دنیا کی بے ثباتی، فکر آخرت کا غماز ہے۔

کاش! ہم عقائد و معاملات میں آپ رضی اللہ عنہ کے اسوۂ مبارک کو مشعل راہ بنائیں۔
آمین اللّٰھم آمین.

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے حکیمانہ اقوال

1. جب تُو دیکھے کہ کوئی شخص لوگوں کی عیب جوئی کر رہا ہے، تو کوشش کر کہ وہ تجھے شناخت نہ کرے، کیونکہ اس کا پہچان لینا ہی اس کی بہت بڑی عیب گیری ہے۔
2. جس کام کی طاقت نہ ہو اس کی کوشش کرنا عبث ہے۔
3. اپنی آمدن سے زیادہ خرچ نہ کرو۔
4. خطا سے زیادہ بدلہ نہ چاہو۔
5. اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے سوا اور کسی بات پر خوش نہ ہو، سچی خوشی اس کی رضا سے حاصل ہوتی ہے۔
6. جس بات کی صلاحیت نہ ہو اس کو حاصل کرنا فضول ہے۔
7. جس فرمانروا میں یہ تین عیب ہوں، وہ حکومت کے لائق نہیں: (1) دشمن سے خائف رہنا (2) کمزوروں پر ظلم کرنا (3) جود و کرم سے ہاتھ کھینچنا۔
8. جس شخص کے مذہب میں وہم و قیاس کا دخل ہوگا، وہ تمام عمر شک و شبہ، ظن و گمراہی اور کجروی میں مبتلا رہے گا۔[1]

---

[1] تاریخ کبیر.

نوٹ: اللہ کی کتاب اور رسول ﷺ کی سنت کی موجودگی میں ظن و قیاس اور بے جا استدلال کی پرستش کرنے والے جری لوگ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد پر غور کریں کہ آپ رضی اللہ عنہ نے اہل اسلام کو وہم اور گمان و قیاس کے قریب پھٹکنے سے بھی منع کیا ہے، چہ جائیکہ قیاس کو اختیار کر کے مذہب کا ایک جزو ››

9 اللہ تعالیٰ کی تعریف خود اسی کے ارشادات سے ظاہر ہے، وہ حواس و ادراک میں نہیں لایا جاسکتا، وہ قریب ہے مگر متصل نہیں، دور ہے لیکن تصور نہیں کیا جاسکتا، وہ اپنی علامات سے پہچانا جاتا ہے، اس کے سوا اور کوئی لائق عبادت نہیں، وہی سب سے عظیم و برتر اور اعلیٰ وارفع ہے۔[1]

10 ہم اہل بیت اللہ تعالیٰ سے جو کچھ طلب کرتے ہیں، وہ ہمیں عطا فرماتا ہے، اور اگر وہ ہمیں مصیبت میں دیکھ کر خوش ہے تو ہم بھی اس سے خوش ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رضا یہی ہے کہ وہ جس حال میں رکھے اس سے خوش رہا جائے۔ (روایت امام شافعیؒ)

11 دنیا دار لوگ مال و دولت کے غلام ہیں اور دین کا نام بھی اس وقت لیتے ہیں جب اس سے انھیں کوئی دنیوی نفع حاصل ہونے کی امید ہو، لیکن جب انھیں دین سے کوئی دنیاوی فائدہ نہیں پہنچتا تو اس سے الگ ہو جاتے ہیں۔

12 جو کچھ مانگنا ہے، اللہ سے مانگو...... اور اس کے سوا کسی کے آگے مت جھکو۔

13 مشرک وہ بھی ہے جو شرک کا ذرا تصور بھی اپنے دل میں کرتا ہے، چاہے اس پر عمل کرے یا نہ کرے اور وہ بھی ہے جو زبان سے کوئی مشرکانہ لفظ بولتا ہے خواہ اس کو اختیار نہیں کرتا۔

14 کسی کو فریب دینے والا اس جیب کترے سے بھی زیادہ گناہ گار ہے جو دن دیہاڑے لوٹ لیتا ہے۔

»» بنالیا جائے۔ صرف یہی نہیں بلکہ مذہب کی بنیادیں اس پر استوار کی جائیں۔ افسوس! آج کل یہ ''دھندہ'' کھلے بندوں ہو رہا ہے۔ حالانکہ قرآن و سنت کی سورج سے زیادہ روشن تعلیمات و ہدایات ہمارے سامنے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم انھی کی اتباع کریں۔ اور انھی کی نشر و اشاعت کریں۔ عالی مقام حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور جملہ صحابہ و اہل بیت رضی اللہ عنہم کا یہی موقف و مشن تھا۔ اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو صاف اور صحیح تعلیمات اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

[1] تاریخ کبیر.

15 ضلالت سے بچو، کیونکہ ضلالت نہ دین کا کچھ چھوڑتی ہے نہ دنیا کا، یہ برائیوں کی جڑ ہے۔ (قرآن وسنت کے ترک کا نام ضلالت ہے)

16 غرور کرنے والے عالم سے تواضع کرنے والا جاہل بہتر ہے۔ میرے والد محترم سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا شعر ہے...... ؎

كَمْ عَالِمٍ مُتَكَبِّرٍ سَتَرَ التَّكَبُّرُ عِلْمَهٗ

كَمْ جَاهِلٍ مُتَوَاضِعٍ سَتَرَ التَّوَاضُعُ جَهْلَهٗ

"کتنے عالم ہیں جو تکبر کرتے ہیں اور ان کا تکبر ان کے علم کو چھپا لیتا ہے اور کتنے جاہل ہیں جو تواضع کرتے ہیں اور ان کی تواضع ان کی جہالت کو چھپا لیتی ہے۔"

17 لوگو! اللہ تعالیٰ کی توحید کو زندہ رکھو...... اور شرک کو مٹا دو...... توحید کا زندہ رکھنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے اور کسی کو اس جیسا نہ بنایا جائے اور شرک کو مٹانا یہ ہے کہ خالص اللہ تعالیٰ کی بندگی کی جائے اسی سے ہر چیز طلب کی جائے اور غیر اللہ کا خیال تک نہ لایا جائے۔ (غیر اللہ، اس کے دشمن ہی کو نہیں کہتے، دوست ہو یا دشمن سبھی غیر اللہ اور "من دون اللہ" میں داخل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی بندگی کی اجازت نہیں، باقی سب کی بندگی ممنوع ہے)

18 لوگو! جس بات کا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم نہیں دیا ہے، وہ مت اختیار کرو اور جس بات کا اللہ اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے وہ اختیار کرو۔ قرآن کریم اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات واحکامات کا خلاصہ یہی ہے۔ (سبحان اللہ! کتنی پیاری تعلیم ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس پر صحیح توجہ دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین)

19 اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور دین کی خلوص قلب سے پیروی کرو، حق تعالیٰ

قرآن مجید میں فرماتا ہے:

﴿فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ﴾

''اللہ کی خالص الدین ہو کر عبادت کر۔''①

20 اچھا وہ ہے جسے سب اچھا کہیں اور بُرا وہ ہے جسے سب برا کہیں...... کسی اچھے کو چند لوگوں کے برا کہنے سے اور کسی برے کو چند لوگوں کے اچھا کہنے سے اچھائی یا برائی میں کچھ فرق نہیں پڑتا۔

21 مسلمانو! اللہ نے تمھیں اسلام جیسا دین دیا، قرآن جیسی کتاب دی، کعبہ جیسا حرم بخشا...... محمد ﷺ جیسا رسول تفویض فرمایا، خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم جیسے حکمران عطا کیے، تمہیں اس کا ہر وقت شکر گزار رہنا چاہیے اور آپس میں صلح و صفائی، مساوات، محبت و اخوت سے زندگی بسر کرنی چاہیے۔② (اللہ تعالیٰ ہمیں ان قیمتی اقوال پر توجہ دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!)

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی ذہانت و ذکاوت

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی ذہانت و ذکاوت کے بارے میں ابراہیم بن رباح موصی رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ ایک شخص نے ان پر کچھ مال کا دعویٰ کیا۔ آپ کو قاضی کے سامنے لایا گیا (اسلامی حکومت میں مدعی کے ساتھ مدعیٰ علیہ کو بھی عدالت میں حاضر ہو کر بمطابق قانون اپنی صفائی دینا پڑتی ہے) آپ قاضی کے سامنے آئے۔ اور بڑی جچی تلی بات کی۔ آپ نے فرمایا: ''یہ شخص اپنے دعوے کی سچائی پر حلف دے دے یا مجھ سے حلف لے لے۔'' چنانچہ اس شخص نے ان الفاظ سے حلف کی ابتدا کی:

«وَاللّٰهِ الَّذِیْ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ»

① الزمر، 39:2. ② الخلافة فی الاسلام.

''اللہ عظیم ذات کی قسم کھاتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔''

آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''ان الفاظ کی بجائے ان الفاظ کے ساتھ حلف کھاؤ۔'' ان الفاظ کا اردو ترجمہ یہ ہے:

''اللہ کی قسم! میں جس مال کا دعویٰ کرتا ہوں وہ حسین کے ذمے واجب ہے۔''

اس شخص نے انھی الفاظ کے ساتھ قسم کھا لی۔ وہ کھڑا ہی ہوا تھا کہ یکدم اس کے پاؤں ڈگمگائے اور ایسا گرا کہ وہیں ڈھیر ہوگیا۔ (اس نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو جھوٹا ثابت کرنا چاہا اللہ تعالیٰ نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی لاج رکھی، آپ کو سچا کر دکھایا اور آپ کے سامنے اسے ذلت کی موت مار دیا۔) آپ رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ آپ نے حلف کے الفاظ کیوں بدلوائے؟'' فرمایا: مجھے اندیشہ ہوا کہ یہ شخص اللہ تعالیٰ کی شان و بزرگی بیان کر رہا ہے اس کے ساتھ حلم کا معاملہ ہو جائے گا۔[1] (الحمد للہ! آپ رضی اللہ عنہ کی یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی اور وہ کیفر کردار تک پہنچ گیا)

آپ رضی اللہ عنہ کو ایسی ذہانت فطانت اپنے والدین محترمین رضی اللہ عنہما کی طرف سے منتقل ہوئی۔ وذلك فضل الله يوتيه من يشآء!

[1] کتاب الاذکیاء لإمام ابن الجوزی رحمه الله مترجم، المیزان: 76.

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے اوراد و وظائف اور دعائیں

متعدد کتابوں سے ثابت ہے کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی دعائیں مسنون ہوتی تھیں۔ آپ رضی اللہ عنہ نے کبھی کوئی غیر مسنون دعا نہیں مانگی۔ آپ رضی اللہ عنہ صرف وہی دعائیں مانگتے تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں، ذیل میں چند مسنون دعائیں درج کی جاتی ہیں:

آپ رضی اللہ عنہ جب کبھی خود بیمار ہوتے یا کسی مریض کی عیادت کے لیے تشریف لے جاتے تو یہ دعا بکثرت پڑھتے:

«اَذْهِبِ الْبَأْسَ رَبَّ النَّاسِ، وَاشْفِ أَنْتَ الشَّافِيْ، لَاشِفَاءَ إِلَّا شِفَائُكَ، شِفَاءً لَا يُغَادِرُ سَقَمًا»

''اے لوگوں کے رب! ہم سے تکلیف دور فرما، تو ہی شفا دینے والا ہے ہم سے تکلیف دور فرما۔ تیرے علاوہ کوئی شفا نہیں دے سکتا، ہمیں ایسی شفا عطا فرما جس کے بعد کوئی بیماری نہ رہے۔''[1]

جب امام ممدوح رضی اللہ عنہ سفر کو جاتے تو یہ دعا پڑھتے۔ اسی طرح جب آپ رضی اللہ عنہ سفر کربلا کے لیے روانہ ہوئے تو اس وقت بھی آپ کی زبان پر یہی دعا تھی۔ آپ نے تین بار اللہ اکبر کہا اور یہ دعا پڑھی:

«سُبْحَانَ الَّذِی سَخَّرَلَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِيْنَ، وَإِنَّا إِلٰى رَبِّنَا

---

[1] صحيح البخاري، الطب، باب مسح الراقي الوجع بيده اليمنى حديث: 5750۔مسلم، السلام، باب استحباب رقية المريض، حديث: 2191.

لَمُنْقَلِبُوْنَ، أَللّٰهُمَّ! إِنَّا نَسْئَلُكَ فِي سَفَرِنَا هٰذَا الْبِرَّ وَالتَّقْوٰى وَمِنَ الْعَمَلِ مَاتَرْضٰى اَللّٰهُمَّ! هَوِّنْ عَلَيْنَا سَفَرَنَا هٰذَا، وَاطْوِعَنَّا بُعْدَهُ، اَللّٰهُمَّ أَنْتَ الصَّاحِبُ فِي السَّفَرِ، وَالْخَلِيْفَةُ فِي الْأَهْلِ، اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوْذُبِكَ مِنْ وَعْثَاءِ السَّفَرِ، وَكَآبَةِ الْمَنْظَرِ، وَسُوءِ الْمُنْقَلَبِ فِي الْمَالِ وَالْأَهْلِ»

''پاک ہے وہ ذات جس نے یہ سواری ہمارے ماتحت کردی ورنہ یہ ہمارے بس میں نہ تھی۔ اور ہم اللہ کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ اے اللہ! ہم آپ سے اپنے اس سفر میں نیکی، تقویٰ اور ایسے عمل کا جو آپ پسند کریں سوال کرتے ہیں۔ اے اللہ! ہم پر یہ سفر آسان فرما اور ہمارے طویل سفر کو ہم پر لپیٹ دے۔ اے اللہ! آپ سفر میں ہمارے ساتھی ہیں اور ہمارے پیچھے ہمارے اہل میں ہمارے نگران ہیں۔ اے میرے اللہ! میں آپ سے اپنے سفر کی پریشانی، کسی بھی تکلیف دہ منظر، اور مال اور اہل میں بدترین طریقے سے لوٹنے کی پناہ پکڑتا ہوں۔''[1]

ایک دفعہ کسی غیر علاقہ کے چند آدمی آپ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: اے ابن علی! ہم خشک سالی میں مبتلا ہیں، مدت سے بارش کی ایک بوند بھی نہیں پڑی، انسانوں اور حیوانوں کا حال ابتر ہوگیا ہے، نہ اناج پیدا ہوتا ہے نہ چارہ اور نہ پانی۔ ہمارے لیے دعا فرمائیے کہ خدائے کریم ہم پر رحم فرمائے اور اپنے فضل سے مینہ برسا کر ہماری مشکلات دور کردے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں تمھیں وہ دعا نہ سکھادوں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قحط باراں میں پڑھا کرتے تھے؟ اور اس کی برکت سے

[1] صحيح مسلم، الحج، باب استحباب الذكر اذا ركب دابته متوجها لسفر حج او غيره و بيان الأفضل من ذلك الذكر، حديث: 1342.

بادل اُمڈ آتا اور برسنے لگتا۔ انھوں نے عرض کیا کہ ضرور سکھائیے، اس سے بہتر اور کون سی دعا ہوگی، تب آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تم لوگ نماز کے بعد یہ دعا مانگا کرو:

«اَللّٰهُمَّ أَغِثْنَا، اَللّٰهُمَّ أَغِثْنَا، اَللّٰهُمَّ أَغِثْنَا»

''اے اللہ! بارش نازل فرما، اے اللہ بارش فرما، اے اللہ بارش نازل فرما۔''[1]

روایت ہے کہ ان لوگوں نے واپس جا کر دو تین روز یہ دعا مانگی تو اللہ کے حکم سے اتنی بارش ہوئی کہ ان کا علاقہ سیراب ہوگیا۔ (دعاؤں کو سننے والا اللہ تعالیٰ ہے جس کی دعا کو جب چاہے وہ قبول فرمالے۔ البتہ نیک، اچھے اور زندہ لوگوں سے حدیث وسنت سے ثابت شدہ ذکر اذکار اور وظائف پوچھے اور دعائیں کروائی جاسکتی ہیں، قرآن و حدیث میں اس کا ثبوت موجود ہے۔)

روایت ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ مندرجہ ذیل دعائیں بکثرت پڑھا کرتے تھے۔ اور یہ بھی روایت ہے کہ جب آپ رضی اللہ عنہ نے میدان طف میں ڈیرہ لگایا، تو شب و روز ہر نماز کے بعد اس کا وظیفہ کرتے، یہاں تک کہ بحالتِ سجدہ بھی اس کا ورد فرماتے، وہ دعائے متبرک یہ ہے:

«اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ ذَنْبِي كُلَّهُ دِقَّهُ وَجِلَّهُ، وَأَوَّلَهُ وَآخِرَهُ، وَعَلَانِيَتَهُ وَسِرَّهُ»

''اے میرے اللہ! میرے بڑے چھوٹے، پہلے، پچھلے، ظاہر اور پوشیدہ غرض سب گناہ معاف کردے۔''[2]

آپ رضی اللہ عنہ ہر نماز کے بعد یہ دعا التزام سے پڑھا کرتے تھے:

---

[1] صحيح البخاري، الاستسقاء، باب الاستسقاء في خطبة الجمعة، حديث: 1014 اس طرح کا واقعہ کتاب ''حسین رضی اللہ عنہ سب کا'' ص: 112 میں بھی ہے۔ [2] صحيح مسلم، الصلاة، باب مايقال في الركوع والسجود، حديث: 483.

«اَللّٰهُمَّ! اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ، تَبَارَكْتَ يَا ذَاالْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ»

''اے اللہ! تو سلام ہے، تیری طرف ہی سے سلامتی ہے۔ اے جلال و اکرام والے رب! تو برکت عطا فرما۔''[1]

لیکن روایت مذکورہ میں یہ نہیں لکھا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ اس دعا کے ساتھ یہ بھی پڑھتے تھے:

«وَاِلَيْكَ يَرْجِعُ السَّلَامُ وَاَدْخِلْنَا دَارَالسَّلَامِ تَبَارَكْتَ رَبَّنَا وَتَعَالَيْتَ يَا ذَاالْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ»

''اے اللہ! تو ہی سلام کا مرجع ہے، ہمیں دارالسلام یعنی جنت میں داخل فرما۔ اے ہمارے رب! تو برکت والا ہے، بلند ہے، صاحب جلال و جبروت ہے اور بہت عزت والا ہے۔''

یہ الفاظ اگرچہ اچھے ہیں لیکن چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا میں شامل نہیں ہیں، اس لیے ہمیں بھی مسنون دعا میں شامل نہیں کرنے چاہئیں۔ ہمیں ایسا کرنے کی اجازت ہے نہ اختیار۔ علماء اور صوفیاء کو زیادہ احتیاط کرنی چاہیے اگر وہ احتیاط نہیں کریں گے تو عوام کیسے احتیاط کریں گے؟ ورنہ ایک وقت آئے گا کہ مسنون اور غیر مسنون خلط ملط ہو کر اصل الفاظ ختم ہو کر رہ جائیں گے۔

اوراد و وظائف

آپ رضی اللہ عنہ کلمہ توحید کا بہت ورد فرماتے، فارغ اوقات میں اکثر یہ پڑھتے رہتے:

«لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَاشَرِيْكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ

[1] صحيح مسلم، المساجد، باب استحباب الذكر بعد الصلوة، حديث: 591.

عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ»

''نہیں کوئی معبود مگر اللہ تعالیٰ، وہ ذات و صفات میں وحدہ لاشریک ہے، اسی کی بادشاہی ہے، اسی کی تعریف ہے۔ وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔''

اور اس ورد کے لیے کوئی خاص وقت مقرر نہ تھا۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں نے حسین بن علی رضی اللہ عنہما کو یہ وظیفہ بار بار پڑھتے سنا:

«لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَلَا نَعْبُدُ اِلَّا اِیَّاہُ، لَہُ النِّعْمَۃُ وَلَہُ الْفَضْلُ وَلَہُ الثَّنَاءُ الْحَسَنُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ»

''اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی معبود نہیں، ہم اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کی عبادت نہیں کرتے۔ وہی نعمت عطا کرتا ہے، وہی صاحب فضل و کمال ہے، اسی کی بہترین تعریف ہے، اللہ کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں، ہم اسی کے لیے خالص الدین ہیں، یعنی ہمارا دین بھی خالص ہے اور نیت بھی خالص۔''

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی ان دعاؤں اور ان وظائف سے بھی یہی ثبوت ملتا ہے کہ آپ ہر کام عین سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق کرتے اور غیر مسنون اعمال سے مکمل پرہیز فرماتے اور ہر چیز اللہ ہی سے طلب کرتے تھے۔

کاش! ہمارے دل میں بھی اتباع کتاب و سنت کا ایسا ہی شوق اور ایسا ہی جذبہ پیدا ہو جائے اور ہم ہر چیز سنت کے مطابق اللہ ہی سے مانگیں، کیونکہ اللہ کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں اور دوسرا اس کا اپنا حکم بھی یہی ہے کہ مجھ ہی سے مانگو۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی روزی رساں اور مالک و مختار ہے۔ اس کے علاوہ کوئی رازق ہے نہ قادر۔

ہمیں چاہیے کہ ہم وظائف و ادعیہ میں ملاوٹ کرنے سے بچیں۔ کیونکہ وظائف اور

دعاؤں کو بدلنا یا ان میں ملاوٹ کرنا نبوی ہدایت اور صحابہ و اہل بیت رضی اللہ عنہم کے طریقے کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا بابرکت طریقہ اور صاف ستھرا عقیدہ جو خالص توحید و سنت پر مبنی ہے دل و جان سے قبول و اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ بیشک جملہ اہل بیت رضی اللہ عنہم کا یہی منہج و مشن تھا۔ اس کا خاص الخاص خیال رکھنا ہمارا دینی و ملّی فریضہ ہے۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شہادت

سیدنا و مولنا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ چہارم اور بلند بخت داماد حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ 19 رمضان 40 ہجری کی شب کے وقت مسجد میں نماز عشاء ادا کر رہے تھے یا بقول بعض فجر کی نماز ادا کرنے کے لیے مسجد کی طرف جا رہے تھے کہ ایک نابکار عبدالرحمان بن ملجم نے آپ رضی اللہ عنہ پر ایسا بھرپور وار کیا کہ آپ رضی اللہ عنہ شدید زخمی ہو گئے، آپ رضی اللہ عنہ کو اٹھا کر گھر لایا گیا۔ زخم مہلک تھا اور آپ رضی اللہ عنہ سمجھ گئے تھے کہ جانبر ہونا ممکن نہیں ہے۔ ''نہج البلاغة'' کے مطابق آپ نے صاحبزادگان سیدنا حسن رضی اللہ عنہ، حسین رضی اللہ عنہ اور محمد ابن حنفیہ کو بلایا اور انھیں یہ وصیت فرمائی:

''اے بیٹو! اللہ تعالیٰ کا خوف دل میں رکھنا، تقویٰ اختیار کرنا، شاید دنیا تمھاری طلب گار بن جائے، مگر تم دنیا سے دور رہنا اور دنیا کی کوئی شے تم سے چھن جائے تو اس کا افسوس نہ کرنا۔ (غالباً خلافت مراد تھی) ہمیشہ اچھا اور شریف بننا، ظالم کو دشمن اور مظلوم کو دوست سمجھنا، میرے قتل کو بہانہ بنا کر مسلمانوں میں خونریزی نہ پھیلانا، میرے قاتل کے سوا کسی کا خون نہ بہانا، اگر میں اس ضرب سے شہید ہو جاؤں تو قصاص میں قاتل کو ایک ہی ضرب مارنا اور اس کا مُثلہ [1] ہرگز نہ کرنا، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیوانے کتے تک کے مُثلہ کرنے کی ممانعت فرمائی ہے، اپنے بھائیوں کے ساتھ اچھا سلوک

---

[1] مُثلہ کرنا ناک، کان وغیرہ کاٹنا ہے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ لوگ جذبہ انتقام میں آ کر بہت کچھ کر گزرتے ہیں۔ مگر عالی حسب و نسب اور بلند مرتبہ لوگ انسانیت کی ایسی تذلیل نہیں کیا کرتے۔

کرنا، آپس میں اتحاد رکھنا اور لوگوں کی خطاؤں سے درگزر کرنا۔" ایسی تفصیلات کے لیے "نہج البلاغۃ" کا مطالعہ فرمائیے۔

پھر آپ رضی اللہ عنہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوئے...... اور ان سے فرمایا:

"بیٹا! ہر حالت میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، خوشی ہو کہ غم، تکلیف ہو کہ راحت، اللہ تعالیٰ کو ہمیشہ خوش رکھنا اور اس کی رضا تلاش کرتے رہنا، صداقت کا دامن کسی صورت نہ چھوڑنا، سب سے انصاف کرنا۔ دوست اور دشمن، موافق اور مخالف سب کے ساتھ عمدہ برتاؤ کرنا۔ جس برائی کا نتیجہ بہشت ہو وہ برائی نہیں اور جس نیکی کا انجام جہنم ہو وہ نیکی نہیں۔ اپنی برائیوں کو دیکھنے والا دوسروں کا عیب گیر نہیں ہوتا۔ اور اللہ تعالیٰ کے انعام و اکرام پر قناعت کرنے والا کسی شے کے کھو جانے پر مغموم نہیں ہوتا۔ جو ظلم کی تلوار چلاتا ہے، وہ خود اس سے ہلاک ہو جاتا ہے اور اپنے بھائی کے لیے کنواں کھودنے والا خود اس میں گرتا ہے، اللہ کی مخلوق پر ظلم کرنا آخرت کا بدترین توشہ ہے۔"[1]

اسی طرح آپ رضی اللہ عنہ اپنی اولاد اور اپنے متعلقین کو نصیحتیں فرماتے رہے اور دم واپسیں تک پند و مواعظ جاری رکھے، آخر قدرت کے اٹل قانون کے سامنے جھکنا پڑا۔ اور 21 رمضان المبارک 40 ہجری کی رات کو امت کے عالم بے بدل، عابد شب زندہ دار اور اللہ کے شیر نے اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔[2] إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ.

آپ رضی اللہ عنہ کی شہادت پر کسی نے کہا ہے:

کسے را میسّر نہ شد ایں سعادت
بکعبہ ولادت بمسجد شہادت

(کسی کو بھی یہ سعادت میسر نہیں آئی کہ اس کی ولادت کعبہ میں اور شہادت مسجد میں ہو سوائے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے۔)

---

① الاعجاز و الایجاز، ملخصاً. ② البداية والنهاية: 340/7.

انتقال کے بعد سیدنا حسن اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہما نے آپ کو غسل دیا، محمد بن حنفیہ پانی لاتے تھے۔ پھر کفن پہنا کر خوشبو لگائی، آپ رضی اللہ عنہ کو تین کفن پہنائے گئے، سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے نماز جنازہ پڑھائی، جس میں خلق کثیر نے شرکت کی، سیدنا حسن، حسین رضی اللہ عنہما، محمد بن حنفیہ اور عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما نے آپ رضی اللہ عنہ کو قبر میں اتارا۔[1] اور اس طرح اسلام کا یہ آفتاب علم وفضل اور پیکر شجاعت و بسالت اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔ لیکن ایثار وقربانی اور اخلاص ووفا کی وجہ سے آپ کا نام مبارک قیامت تک کے لیے روشن ہوگیا۔

اب ذرا یہ بھی دیکھیے کہ سیدنا علی المرتضی رضی اللہ عنہ کی رحلت کے بعد حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو ''فضیلت'' کی کیسی کیسی سندیں دی جارہی ہیں، حسین رضی اللہ عنہ کے نام نہاد عاشق کہتے ہیں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جب ابن ملجم مردود کو قتل کیا گیا تو سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے اس کی لاش کا مُثلہ کردیا، یعنی جوش انتقام میں آکر آپ نے اس کے تمام اعضاء کاٹ دیے اور چند آدمیوں کے ساتھ مل کر اس کی لاش کو جلا دیا۔ إنا للہ! یہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر الزام ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ ہرگز ایسے منتقم مزاج اور سخت گیر نہ تھے۔

قارئین کے لیے دوسری نئی بات یہ ہے کہ ہمارے دوست اپنے بچوں کا نام عبدالرحمٰن نہیں رکھتے اور یہ نام محض اس لیے نہیں رکھتے کہ عبدالرحمٰن بن ملجم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے جن اسماء کو پسند فرمایا ان میں ایک نام عبدالرحمٰن بھی ہے۔ عناد اور دشمنی کا بھی کوئی اصول و اسلوب ہونا چاہیے۔ دشمنی کسی دشمن سے رکھتے پھر بھی کوئی بات تھی، لیکن ان اللہ کے بندوں نے نام ہی سے بیر رکھ لیا۔ جو حد درجہ نامناسب بات ہے۔ إِنَّا لِلّٰہِ......۔

معاذ اللہ! کس کس طریقے سے ہمارے ''محبان اہل بیت'' سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو بدنام کررہے ہیں، گویا سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے ابن ملجم کی لاش کا حلیہ بگاڑ کر اپنے

[1] البدایة والنهایة:7/340-341.

والد معظم رضی اللہ عنہ کی وصیت کو بھی ٹھکرا دیا اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی بھی خلاف ورزی کی......

انصاف سے کہیے کہ یہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی تعریف کی جارہی ہے یا توہین؟ پھر ایک گروہ کہتا ہے کہ سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے چونکہ مسجد میں شہادت پائی تھی اس لیے حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے مسجد میں جانا اور اس میں نماز پڑھنا ترک کردیا تھا اور یہ گروہ اسی لیے مسجد کو "قتل گڑھ" کہتا ہے، لاحول ولا قوۃ! اسی لیے یہ دوست مساجد کی طرف بہت کم توجہ دیتے ہیں۔ اگر کہیں بنوا بھی لیں تو وہ بھی نمازوں کی ادائیگی کے لیے نہیں بلکہ اسلام سے اپنا تعلق دکھانے کے لیے بناتے ہیں۔ یہ کوئی الزام نہیں آپ خود مشاہدہ کرسکتے ہیں۔

اندازہ کیجئے بزرگان دین کو کس کس طریق سے رسوا کیا جاتا ہے؟ اور کیسے کیسے الزام لگا کر ان کو اللہ اور اس کے دین کا دشمن قرار دیا جاتا ہے؟ العیاذ باللہ! حالانکہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بارے میں اس قسم کی گھٹیا سوچ کا تصور کرنا بھی حرام ہے۔

سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی رحلت کے بعد ان کے فرزند اکبر حضرت حسن رضی اللہ عنہ مسند آرائے خلافت ہوئے اور لوگوں سے بیعت لینا شروع کردی۔ بیعت کا سلسلہ ابھی جاری ہی تھا کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے عراق پر چڑھائی شروع کردی۔ جب حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو خبر پہنچی تو وہ بھی شام کی طرف روانہ ہوئے اور ساباط کے مقام پر آپ رضی اللہ عنہ نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا۔ جس میں جدال و قتال سے اظہار نفرت کیا اور مسلمانوں کے نفاق و افتراق اور فساد و خونریزی کے مٹانے کی تلقین کی۔ اس قیام میں اگرچہ آپ لشکر معاویہ کے ایک آدمی کے نیزے سے شدید زخمی ہوگئے، مگر آپ رضی اللہ عنہ کا ارادہ نہ بدلا۔ اور یہی چاہتے تھے کہ جیسے بھی ممکن ہو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے مصالحت ہو جائے۔ ادھر قبائل کے ممتاز آدمیوں نے مخفی طور پر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے بیعت کر لی اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ جو پہلے امیر کہلاتے تھے، اب باقاعدہ خلیفہ بن گئے۔ اپنے اثر و رسوخ اور تدبیر سے خلق کثیر کو اپنے ساتھ ملا لیا، لیکن بڑی مشکل یہ تھی کہ شرانگیزوں اور فتنہ خیزوں کی جماعت حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ میں صلح نہ ہونے دیتی تھی۔ دونوں بزرگ جب بھی ایک دوسرے کی طرف جھکنے لگتے، شرارتیوں اور سازشیوں کی یہ ٹولی دونوں کو پھر بھڑکا دیتی۔ یہی وہ سازشی جماعت تھی جو ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور امیر المومنین علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ میں جنگ کا باعث تھی، یہی طاغوتی گروہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ میں لڑائی کا سبب بنتا رہا۔ اور یہی شیطانی گروہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو مصالحت سے باز رکھتا تھا اور انھیں باہم لڑا کر ان کے قتال سے فائدہ اٹھاتا اور تماشا دیکھ کر خوش ہوتا اور اپنے تئیں یہ کہتے ہوئے بغلیں بجاتا تھا کہ اچھا ہے جو دین اسلام کو عظیم نقصان پہنچ رہا ہے اور مسلمانوں کی ہوا اکھڑ رہی اور طاقت پارہ پارہ ہو رہی ہے۔

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ صاحبِ ہوش و خرد، دانا وزیرک، معاملہ فہم، دور اندیش اور بہت بڑے مدبر تھے۔ منافقین اور معاندین کی ہزار رکاوٹوں کے باوجود آخر کار دونوں بزرگوں نے صلح کی ٹھان لی۔ کچھ یہ جھکے اور کچھ وہ جھکے۔ اور سیدنا حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا ایماء پاتے ہی امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے فوراً دو ایلچی ان کی خدمت اقدس میں بھیج دیے، جنھوں نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے صلح کی دعوت دی اور شرائط سے آگاہ کیا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ فوراً رضا مند ہو گئے۔ صلح نامہ لکھا گیا اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے چھ ماہ خلافت کرنے کے بعد 25 ربیع الاول 41 ہجری کو دستبرداری کا اعلان کر کے خلافت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو سونپ دی۔[1] صلح کی جو شرائط مقرر کی گئیں ان میں ایک اہم شرط یہ تھی کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ رائے عامہ کے بغیر کسی اور کو اپنا جانشین مقرر نہ کریں گے۔

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت

حضرت حسین رضی اللہ عنہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے مصالحت کرنے اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت سے دستبرداری کے بہت خلاف تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ صلح پر رضا مند ہوں اور قلمدان خلافت حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کردیں، غالباً یہ اس لیے تھا کہ دونوں فریقوں کو بھڑکانے اور لڑانے والی جماعت نے

---

① البداية والنهاية: 8/18-19.

آپ رضی اللہ عنہ کو زیادہ مشتعل اور مخالف بنا رکھا تھا، لیکن جب حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے انھیں سمجھایا اور دینی، قومی اور سیاسی نقصانات سے آگاہ کیا، تو وہ سمجھ گئے اور اپنے برادر بزرگ کی رائے سے متفق ہوگئے۔

مصالحت اور دستبرداری کے بعد سیدنا حسن رضی اللہ عنہ اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ سیدنا حسن اور حسین رضی اللہ عنہ نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہے تو مخلوق خدا انبوہ در انبوہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آنے اور بیعت کرنے لگی اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی مصالحت و مفاہمت سے شر و فتنہ اور فساد و عناد کا وہ سلسلہ کچھ عرصے کے لیے بند ہوگیا جس نے امت مسلمہ کے لہو سے اپنے ہاتھ رنگے تھے۔

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا حسن سلوک

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کے درجہ و مرتبہ کو خوب جانتے تھے۔ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے نورِ نظر ہونے کی وجہ سے جب بھی امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس جاتے تو آپ محبت سے انھیں اپنے پاس بٹھاتے اور قیمتی تحفے دے کر عزت سے رخصت کرتے۔

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے دونوں بھائیوں کے بڑے معقول وظیفے مقرر کر رکھے تھے اور اس کے علاوہ عطیات کی خطیر رقوم بھی بھیجتے رہتے تھے۔ ایک بار حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لے گئے، تو ابن کثیر کی روایت کے مطابق انھوں نے دونوں کو دو دو لاکھ درہم کا عطیہ دیا، پھر ایک دفعہ گئے تو ایک ایک لاکھ درہم دیے۔[1] اگر دونوں میں کسی قسم کی ترش روئی یا سخت کلامی پاتے تو درگزر کرتے اور نرمی سے

[1] سیر أعلام النبلاء: 264/3.

سمجھاتے، صلح کے بعد بھی معاند لوگ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو کئی طرح کا اشتعال دلاتے رہے مگر انھوں نے ان عاقبت نا اندیشوں کی باتوں پر کان نہیں دھرے۔ اور ان گرامی قدر شہزادوں کی تالیف قلبی کا ہر وقت خیال رکھا۔

سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی وفات

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے مصالحت کرنے کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ کوئی آٹھ سال تک زندہ رہے، اس عرصے میں آپ رضی اللہ عنہ کو کئی دفعہ زہر دیا گیا، مگر آخری مرتبہ 49 ہجری میں تو آپ رضی اللہ عنہ کو ایسا سخت زہر پلایا گیا کہ جگر کٹ کٹ کر تے سے حلق کے راستے نکلنے لگا۔ انا للہ۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے آپ سے دریافت کیا: ''برادر بزرگ! بتائیے تو سہی، آپ کو کس نے زہر دیا ہے؟'' حضرت حسن رضی اللہ عنہ فرمانے لگے: ''حسین! تم کیوں پوچھتے ہو اور کیوں اصرار کرتے ہو؟ کیا تم زہر دینے والے کی گردن مارو گے؟'' سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ہاں! میں ضرور اسے قتل کروں گا'' تب سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''بھائی! اگر زہر پلانے والا وہی ہے جس کا مجھے علم ہے تو خدائے منتقم خود ہی اس سے بدلہ لے گا اور اگر وہ بے گناہ ہے تو پھر میں یہ نہیں چاہتا کہ وہ میری وجہ سے خواہ مخواہ سزا پائے۔''[1]

اللہ اکبر! کتنا حوصلہ اور کیسا دل گردہ ہے کہ قاتل کا علم رکھنے کے باوجود اس کا پتہ نہیں بتایا اور بھید کو اس لیے چھپا رکھا کہ اس کو قتل نہ کر دیا جائے۔

ایسی عالی ظرف و بلند حوصلگی کون دکھا سکتا ہے؟ سبحان اللہ! کتنا بڑا حوصلہ تھا اس نواسۂ رسول کا۔ اَللّٰھُمَّ ارْفَعْ دَرَجَاتِہٖ.

حضرت حسن رضی اللہ عنہ اس سم مہلک سے بچ نہ سکے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اپنے بھائی اور اہل و

[1] سیر اعلام النبلاء: 274/3، والمنتظم لابن جوزی: 5/225-226.

عیال واطفال کو وصیت فرمائی اور فتنہ وفساد سے بچنے کی تلقین کی...... پھر ذکر الٰہی میں مصروف ہوگئے اور داعی اجل کو لبیک کہہ دیا، إِنَّالِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ.

تاریخ کبیر اور دیگر کتب کی روایت کے مطابق آپ رضی اللہ عنہ نے ماہ ربیع الاول 49 ہجری میں وفات پائی۔ نماز جنازہ حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ نے پڑھائی، آپ رضی اللہ عنہ کو عام قبرستان میں دفن کیا گیا۔[1]

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا دعوائے خلافت سے انکار

سیدنا حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا انتقال فرمانا ہی تھا کہ مسلمانوں میں آتش تشتت بھڑکانے اور خرمنِ امن کو آگ لگانے والے لوگ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پاس آنے لگے اور ان کو یہاں تک چکما دیا گیا کہ اگر آپ مدعی خلافت بن کر کھڑے ہوجائیں تو نجد وحجاز کے علاوہ شام ویمن اور عراق وغیرہ کے تمام لوگ آپ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہوں گے۔ کوفے کے بدعہد لوگ تو خصوصیت سے آپ رضی اللہ عنہ کو مشتعل کرنے لگے، لیکن سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے ان کو صاف جواب دے دیا:

> ''امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور میرے درمیان جو معاہدہ ہوچکا ہے جب تک امیر معاویہ رضی اللہ عنہ زندہ ہیں، وہ قائم رہے گا اور میں اس کو کسی حالت میں نہیں توڑ سکتا۔''[2]

نفاق انگیز لوگوں نے جب حضرت ممدوح رضی اللہ عنہ کا یہ جواب سنا اور ناکامی کا منہ دیکھا تو پھر وہ حضرت محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ کے پاس پہنچے اور کہنے لگے کہ اگر حسین انکار کرتے ہیں تو کرنے دیجیے۔ آپ خلافت کے مدعی بن جائیے، ہم سب آپ کے حامی وناصر ہیں، مگر وہ بھی نہ مانے۔ انھوں نے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ سے جا کر کہا کہ یہ لوگ ہمیں تباہ

---

① الاستیعاب: 374/1، والمنتظم لابن جوزی: 226/5. ② سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ: 403/1، بحوالہ أخبار الطوال، ص: 220. خلافت معاویہ اور یزید، ص: 71-72.

کرانا اور مسلمانوں کا خون بہانا چاہتے ہیں، جہاں تک ہو سکے ان سے بچ کر رہیں، یہ لوگ ہمارے خیر خواہ ہیں نہ دیگر مسلمانوں کے۔ بہر کیف فتنہ خیزوں نے چاہا کہ حسین رضی اللہ عنہ اور معاویہ رضی اللہ عنہ کو باہم لڑا کر اپنا اُلّو سیدھا کریں، امت کے خون سے زمین کو رنگین بنائیں، مگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی دور رس نگاہ اور انجام شناس دماغ نے اس کا ہولناک نتیجہ بھانپ لیا اور وہ مفسد اور ضرر رساں لوگوں کے جھانسے میں نہ آئے۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے تعلقات

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ جس طرح سیدنا حسن رضی اللہ عنہ سے سلوک کرتے تھے اس سے بھی زیادہ بہتر سلوک حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے کیا، ان کے سالانہ وظیفے کو برقرار رکھا۔ اور جب تک زندہ رہے ہمیشہ آپ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں بیش قیمت تحائف اور بھاری رقومات بھیجتے رہے۔

یہ قطعاً غلط ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی وفات پر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے بے حد خوشی منائی تھی اور یہ رنجیدہ خبر سن کر سیدنا حسین رضی اللہ عنہ غضب ناک ہو گئے اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دشمن بن گئے تھے، ایسی سب روایات باطل ہیں۔

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ شاعر بھی تھے۔ آپ کا شعر ہے:

لَسْتَ بِالْبَاقِي فَلَا تُشْمِتْ بِهِ كُلُّ حَيٍّ لِلْمَنَايَا مُرْتَهَنٌ

"کسی کی موت کی خبر سن کر تجھے خوشی نہیں منانی چاہیے، کیونکہ تُو نے بھی باقی نہیں رہنا ہے اور ہر زندہ چیز موت کے ہاتھ میں رہن ہے۔"

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ ان لشکروں میں بھی شرکت فرماتے رہے، جن کو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ غیر ممالک روانہ کرتے تھے، چنانچہ غزوۂ قسطنطنیہ میں کئی بار شریک ہوئے اور نہ صرف

خود شریک ہوئے بلکہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما اور سیدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ بھی آپ کے ساتھ ہوتے تھے اور ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ تو قسطنطنیہ ہی میں وفات پا گئے۔[1]

حضرت حسین رضی اللہ عنہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس اکثر جایا کرتے تھے اور کبھی وہ بھی آپ کے پاس آجاتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ ان کے پاس گئے تو ہزاروں درہم نقد اور بہت سے پارچات اور دوسرے تحائف عطا فرمائے۔ اور یہ کہہ کر رخصت کیا: ''اے ابنِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اور اسی وجہ سے آپ کی تعظیم کرتا ہوں، آپ آیا کیجیے آپ کو جس چیز کی طلب ہو میں ان شاء اللہ وہ حاضر کروں گا، مگر اللہ کے لیے منافقوں کی باتیں نہ سنا کیجیے۔''[2]

منبر معاویہ رضی اللہ عنہ پر خطبہ حسین رضی اللہ عنہ

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا ارشاد گرامی ہے: ''آل محمد وہ ہیں جو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، عمر فاروق رضی اللہ عنہ، عثمان غنی رضی اللہ عنہ، علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کو گالیاں نہیں دیتے۔''

ایک مشہور ترین سوانح نگار لکھتا ہے: ''ایک روز امیر معاویہ رضی اللہ عنہ منبر پر جمعے کا خطبہ دے رہے تھے کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ بھی تشریف لے آئے، لوگوں نے انھیں دیکھا تو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے کہنے لگے: ''یا امیر المومنین! حضرت حسین رضی اللہ عنہ آ گئے ہیں، انھیں منبر پر خطبہ دینے دیجیے۔'' امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ذرا میں اپنی نسبت کچھ کہہ لوں پھر خطبہ حسین رضی اللہ عنہ دیں گے۔'' امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد حسین رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہوئے اور پوچھا: ''حسین رضی اللہ عنہ! تم اللہ کا حلف اٹھا کر بتاؤ کیا میں سنگلاخ

---

[1] سیر أعلام النبلاء: 412/2، البدایة والنهایة: 61/8، المنتظم لابن جوزی: 250/5، تاریخ طبری: 232/5. [2] البدایة والنهایة: 8/150-51 باختلاف یسیر.

مکہ کی اولاد نہیں؟'' سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے کہا: ''درست ہے، مجھے اس اللہ کی قسم جس نے میرے نانا صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغام حق دے کر مامور فرمایا!'' پھر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''حسین رضی اللہ عنہ! تمھیں اللہ کی قسم! کیا میں مسلمانوں کا ماموں نہیں ہوں؟'' حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''اللہ کی قسم! جس نے میرے نانا جان رضی اللہ عنہ کو رسول بنا کر بھیجا، بالکل ٹھیک ہے۔'' امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پھر بولے: ''حسین! تمھیں رب العالمین کی قسم، کیا میں کاتب وحی نہیں ہوں؟ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''مولائے واحد کی قسم، جس نے میرے نانا جان صلی اللہ علیہ وسلم کو مخلوق کے لیے نذیر بنا کر مبعوث کیا، آپ صحیح کہتے ہیں۔'' بعد ازاں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ منبر سے نیچے آ گئے اور ان کی خواہش پر حضرت حسین رضی اللہ عنہ ان کی جگہ کھڑے ہو گئے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اللہ کریم کی ایسی تعریف و توصیف بیان فرمائی کہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے بعد کبھی کسی نے ایسی حمد و ثنا نہ کی تھی......، پھر فرمایا: ''اے مسلمانو! مجھ سے میرے والد ماجد نے اور میرے والد بزرگوار سے میرے محترم نانا جان صلی اللہ علیہ وسلم نے اور میرے مقدس نانا جان صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اور جبرائیل علیہ السلام سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ کرسی عرش کے پایہ کے نیچے حنائے سبز کا ایک پتہ ہے۔ جس پر لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ مرقوم ہے۔ پس آلِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے گروہ میں سے جو کوئی حشر کے دن کلمۂ طیبہ پڑھتا ہوا آئے گا رب قدوس اس کو بہشت میں داخل کرے گا۔'' امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''آلِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے گروہ کون ہیں؟'' حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''جو لوگ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور آپ رضی اللہ عنہ (معاویہ) کو گالیاں نہیں دیتے وہی آلِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے گروہ ہیں۔''[1]

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ارشاد مذکورہ بالا میں مہندی کے پتے پر کلمہ ثبت ہونے والی روایت اصلی ہو یا وضعی۔ اور اصل خطبہ میں کیا اور کیوں گڈ مڈ کی گئی ہے، اس کو تو رہنے

دیجیے۔ اور دیکھیے یہ کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ آلِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کی تعریف کیا فرما رہے ہیں۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بلیغ الفاظ کا مطلب یہ ہوا کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، عمر فاروق رضی اللہ عنہ، عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ، علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی مدح کرنے اور ان بزرگوں کے قدح سے بچنے والے ہی آلِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے رفیق و ہمراہی ہیں۔ اب یہ فیصلہ آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے معتقدوں کے ہاتھ میں ہے کہ جو لوگ آلِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے محبّ و معتقد ہو کر اصحابِ ثلاثہ رضی اللہ عنہم اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر سب و شتم کرتے اور انھیں برہنہ گالیاں دیتے ہیں اور سبّ و شتم کے بغیر ان کی کوئی تقریر مکمل نہیں ہوتی انھیں کیا کہنا چاہیے؟ ذرا سوچ لیں، کہ مذکورہ ارشاد حسین ابن علی رضی اللہ عنہما کا ہے کسی اور کا نہیں۔

حسین رضی اللہ عنہ کے ایفائے عہد کا ایک واقعہ

ایک دفعہ چند لوگوں کا ایک وفد حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے مہمان سمجھ کر ان کی خوب خاطر تواضع کی۔ دو بکریاں ذبح کرا کے بُھنا ہوا گوشت ان کو کھلایا۔ جب وہ لوگ کھا پی کر فارغ ہوئے تو آپ رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے: ''اے فرزندِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کو معلوم ہے کہ ہم کس غرض سے آپ کے پاس آئے ہیں؟'' حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے لاعلمی ظاہر کی۔ تو انھوں نے کہا: ''ہم اس لیے حاضر ہوئے ہیں کہ آپ معاویہ بن ابی سفیان کی بیعت توڑ دیں اور اپنی خلافت کا اعلان کر دیں۔ اللہ کی قسم! ہم سب لوگ آپ کے ساتھ ہیں اور دل و جان سے آپ کی مدد کرنے کو تیار ہیں۔''

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے جواب دیا:

---

① ابن عساکر: 315/4.

”اچھا، یہ بات ہے تو آپ لوگ فوراً واپس چلے جائیں اور اپنے آپ کو ناکام و نامراد سمجھیں، یعنی جو مراد اور خواہش آپ لوگ لے کر آئے ہیں اسے نہیں پا سکتے، کیونکہ میں بدعہد بننا نہیں چاہتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدہ شکنی سے سخت منع فرمایا ہے۔ نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی عہد شکنی کی تھی نہ اسے پسند فرماتے تھے۔ خوب سن لو! مجھے خلافت کی کوئی طلب نہیں۔ جب تک حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ زندہ ہیں میں اُن سے وفا کروں گا کیونکہ میں حلف اور بیعت کر چکا ہوں۔“[1]

ان واقعات کی روشنی میں دیکھنا یہ ہے کہ جو لوگ یہ مشہور کرتے ہیں کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے خلافت کا دعویٰ کر دیا اور بیعتِ معاویہ رضی اللہ عنہ توڑ دی تھی، وہ کس طرح حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بدعہد اور معاہدہ شکن بنا کر ان کی تحقیر کر رہے ہیں!! سچ تو یہ ہے کہ جاہل لوگ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی اپنے پاس سے بنا بنا کر جو تعریف کرتے ہیں اس میں ہتک اور بدنامی ہی کا پہلو نکلتا ہے کوئی فضیلت نہیں پائی جاتی۔ جھوٹ آخر جھوٹ ہوتا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں صحابہ و اہل بیت رضی اللہ عنہم دونوں کا صحیح مقام سمجھنے کی توفیق مرحمت فرمائے آمین۔ ایک گروہ کی حد سے زیادہ عزت بجالانا اور حد سے زیادہ بڑھا چڑھا کر ان کا ذکر و بیان کرنا اور ان کی تعریف کے ڈونگرے برسانا اور دوسرے فریق کی عزت کو داغدار کرنا عقل، نقل اور تعلیمات اسلامیہ اور عقائد دینیہ کے سراسر خلاف ہے۔

[1] سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ: 401/3 بحوالہ اخبار الطوال۔

سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی شخصیت

حالی مرحوم نے کہا ہے۔

نیکوں کو نہ ٹھہرائیو بد، اے فرزند! ایک آدھ ادا اُن کی اگر ہو، ناپسند

کچھ نقص انار کی لطافت میں نہیں ہوں اُس میں اگر گلے سڑے دانے چند

انبیاء علیہم السلام کے سوا وہ کون شخص ہے جو معصوم اور تمام عیوب ونقائص سے پاک ہے؟ اگر کسی مخلص اور نیک نیت آدمی میں دو چار سُقم بھی ہوں تو قابلِ مؤاخذہ نہیں ہے خصوصاً بابِ اجتہاد میں غلطی عنداللہ بھی معاف ہے۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بھی ایسے ہی بزرگ ہیں جن کی صالحیت اور تقویٰ میں کوئی شک نہیں، مگر ان سے اگر بتقاضائے بشریت یا بر بنائے اجتہاد کچھ غلطیاں صادر ہوئی ہوں تو انھیں ہدف ملامت نہیں بنایا جاسکتا۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ غلطیوں سے مبرّا انبیاء علیہم السلام کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ یہی درجہ معصومیت ہے جو اہل سنت کے نزدیک بجز انبیاء علیہم السلام کسی ولی بزرگ کو حاصل نہیں۔ اگر ہم عیب جوئی اور حرف گیری کا سلسلہ شروع کر دیں تو پھر کوئی بڑے سے بڑا آدمی بھی نہیں بچ سکتا۔ لہٰذا ہمیں اس موضوع کو چھیڑنا ہی نہیں چاہیے۔ ان کی فروگذاشتوں کو اجتہادی فروگذاشت سمجھ کر اعراض سے کام لینا چاہیے۔ خصوصاً بے مقصد اور بے جا تنقید کا ہمیں سوائے نقصان وخسران کے کچھ حاصل نہیں ہوسکتا اور نہ ہوگا۔ جبکہ بمطابق قرآن مجید اللہ نے انھیں معاف بھی کر دیا ہو۔ اللہ ہمارے خواہ مخواہ کے ناقدین کو شعور اور سمجھ دے۔ بہت سے اچھے بھلے لوگ بھی اس ''دریائے شور'' میں

بہہ رہے ہیں۔ اور لاشعوری میں علم و تحقیق اور عدل و انصاف کے نام پر مسلک اعتدال سے دور چلے گئے ہیں۔

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مخلص صحابی ہیں۔ آپ کے والد ابوسفیان رضی اللہ عنہ اور آپ نے فتح مکہ کے دن اسلام قبول کیا تھا۔ [1] اور اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صفوں میں جگہ حاصل کر لی تھی۔ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خسر ہیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے بہنوئی ہیں۔ یعنی اُم المومنین حضرت اُم حبیبہ بنت ابی سفیان رضی اللہ عنہا جو قدیم الاسلام ہیں، حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں تھیں، ابوسفیان رضی اللہ عنہ بعض غزوات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب رہے۔ اور معاویہ رضی اللہ عنہ نے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کافی جہاد کیے۔ امام بخاری و مسلم رحمہما اللہ نے صحیحین میں حضرت ابوسفیان اور معاویہ رضی اللہ عنہما کے فضائل و مناقب میں الگ الگ باب باندھے ہیں جن سے ان صنادید کا عظیم و وقیع مقام واضح اور متعین ہو جاتا ہے۔

ایک دفعہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اپنی ہمشیرہ اُم المؤمنین ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کی ملاقات کے لیے آئے کیونکہ ان کی آپس میں بہت محبت تھی۔ وہ دونوں باہم گفتگو میں مصروف تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: ''اُم حبیبہ! کیا تمھیں معاویہ رضی اللہ عنہ سے بہت محبت ہے؟'' اُم المومنین رضی اللہ عنہا نے جواب دیا: ''جی ہاں! یہ میرے حقیقی بھائی ہیں مجھے بہت پیارے ہیں۔'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر تمھیں ان کے ساتھ محبت ہے تو میں بھی انھیں محبوب رکھتا ہوں۔''

بتایئے! جسے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم محبوب رکھیں اسے دوسرے لوگ کیوں ناپسند کریں؟ اور اگر ناپسند کریں تو گناہگار ٹھہریں۔ [2] ناقدین اور عیب جُو لوگ حد سے بڑھ گئے ہیں وہ ایک ہی لاٹھی سے سب کو ہانکتے ہیں مگر ہم تو ایسا نہیں کر سکتے بلکہ ہم ایسی

---

① سیر اعلام النبلاء: 120/3. ② سیر اعلام النبلاء: 3/129-130.

شخصیات کے بارے میں اہانت و بے ادبی کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ اہل سنت کا یہی مسلک ہے۔ جو افراط وتفریط سے مبرا اور غایت درجہ محتاط ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام دوستوں کو ان عظیم ہستیوں کا زیادہ سے زیادہ ادب واحترام روا رکھنے کی توفیق دے۔ آمین

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی بلند قامت اور ممتاز شخصیت کو سمجھنے کے لیے درج ذیل حقائق پر غور کرنے کی ضرورت ہے...... سب جانتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ، حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی طرح حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو بھی کاتب وحی مقرر فرمایا تھا۔ یعنی آپ بھی قرآن کریم کی کتابت کیا کرتے تھے اور یہ منصب کوئی معمولی منصب نہ تھا۔ اور یہ نکتہ بھی قابل لحاظ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ایماء کے بغیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مذکورین کو وحی کی کتابت پر کیسے تعینات فرما سکتے تھے؟ کاتبین وحی کی امانت ودیانت پر شبہ درحقیقت اللہ اور نبی پر شبہ کے ہم معنی ہے۔ اگر ان باعظمت ہستیوں کا قرآن مجید کی کتابت وتدوین کرنا مشکوک ہوتا تو اللہ تعالیٰ ﴿ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ﴾ کا آفاقی اعلان نہ فرماتا۔ کتابتِ وحی کے علاوہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے سلاطین وملوک کو خطوط ومراسلات تحریر کرنا بھی آپ رضی اللہ عنہ کے سپرد تھا۔ اور بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ آپ کتابتِ حدیث بھی کیا کرتے تھے اور وہ باتیں بھی ثبت کرتے تھے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور وفود وقبائل کے درمیان ہوا کرتی تھیں۔ اور جن سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور اسلامی احکام کی تدوین میں مدد ملتی تھی۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں بھی امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اسلام اور مسلمانوں کی بہت خدمت کی اور متعدد جنگوں میں شرکت فرمائی۔ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ جیسے عدل گستر اور نڈر امیر المؤمنین نے آپ کو حاکمِ دمشق مقرر کیا اور حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ نے آپ کو شام کا گورنر بنا دیا۔

ان مذکورہ خدمات جلیلہ کے علاوہ آپ راوی حدیث بھی ہیں۔ اگرچہ آپ نے کم روایت کی ہے مگر کتب حدیث میں آپ کی چند روایتیں مرقوم ہیں۔

اس بات کا کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا کہ سیدنا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بہت بڑے مدبر، اعلیٰ پایہ کے سیاستدان تھے۔ معاملہ فہمی اور انجام شناسی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ نباضِ ملت تھے، نفسیات کے ماہر تھے، ہوا کا رُخ جاننے پہچاننے اور حالات پر قابو پانے میں اپنی مثال آپ تھے۔ بہت رُعب و دبدبہ رکھتے تھے۔ عوام کو زیر کر لینا اور باا‌ثر تدبیر سے دشمن کو ہمنوا بنا لینا آپ کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ فوجوں کی کمانداری خوب کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ اپنی امارت اور خلافت کے عہد میں عظیم الشان فتوحات حاصل کیں، اور وسیع وعریض علاقے اسلام کے زیر نگین کر دیئے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد حکومت میں 56 لاکھ مربع میل پر اسلام کا پرچم بلند کیا۔

خود فرمایئے! کیا یہ باتیں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے کمال جہانبانی پر شاہد ہیں یا نہیں؟ بے شک یہ آپ رضی اللہ عنہ کا بہت بڑا کارنامہ ہے جس کا کوئی مخالف سے مخالف بھی انکار نہیں کرسکتا۔ آپ رضی اللہ عنہ کو اور بھی بڑے کمالات حاصل تھے، مثلاً: آپ رضی اللہ عنہ تقریر و تحریر میں بہت ماہر تھے۔ شعر و سخن سے بھی شغف رکھتے تھے۔ دینی اور دنیوی علوم مروجہ سے کما حقہ بہرہ مند تھے۔

کہتے ہیں ایک دفعہ آپ رضی اللہ عنہ قرآن کریم کی تلاوت کر رہے تھے کہ ایک مقام پر سمندروں کا بیان پڑھ کر بحری معلومات حاصل کیں۔ اور اسی قرآن کریم کے بیان کے مطابق جہازوں کا ایک بیڑا بنالیا۔ جس نے فتوحات اسلامیہ میں کام دیا۔ اسلامی حکمرانوں میں بحری بیڑا ایجاد کرنے اور بحری فوج تیار کرنے کا سہرا آپ رضی اللہ عنہ ہی کے سر ہے۔[1]

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس کچھ سائنس دان بھی تھے۔ امریکہ کی بحری اور

---

[1] فتح الباری: 11/75-76.

ہوائی فوج کے افسرِ اعلیٰ مسٹر جے کے سپنر نے عمیق تحقیقات کے بنا پر لکھا ہے کہ جب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا تو ان میں ایک مسلمان ماہر سائنسدان ایسا بھی تھا جس نے ایک ہوائی جہاز تیار کیا اور اس پر چڑھ کر پرواز کی۔ مگر تھوڑی دور جا کر طیارہ گرا اور اپنے موجد سمیت پاش پاش ہوگیا۔[1]

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بعثت سے پانچ سال پیشتر پیدا ہوئے۔ اور ماہِ رجب 60 ھ میں وفات پائی إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ[2] یہ ہیں مختصر حالات اس جری، ذکی اور صاحب بصیرت انسان کے جس کے فضل و کمال کے اپنے اور غیر سبھی معترف ہیں! ہماری دعا ہے اور ہونی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ آپ رضی اللہ عنہ کے درجات بلند کرے۔ اور لغزشیں معاف فرمائے۔ (آمین) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود انھیں دعائیں دیں، یقیناً وہ شرفِ قبولیت پا چکی ہیں، جسے اللہ اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معاف کر دیا، ہم بھی انھیں معاف کر دیں۔ اگر ہمارے دوست معاف نہ کریں گے اس سے ان کا کچھ نہیں بگڑے گا، ہمارے اپنے ہی ایمان کا نقصان ہوگا، جو معمولی نقصان نہیں، غور سے دیکھا جائے تو ایمان کا نقصان ہی بہت بڑا نقصان ہے۔

① امریکی رسالہ بکرنٹ ہسٹری بابت ماہ جولائی 1928ء ماخوذ از سیرت شہید کربلا، جلد اوّل۔
② سیر اعلام النبلاء: 162/3.

باب: 5

یزید کی ولی عہدی کا مسئلہ

حضرت رسول کریم ﷺ کی رحلت کے بعد دَورِ صدیقی میں مختلف فتنوں نے سر اٹھایا، جن میں منکرینِ ختم نبوت، مانعینِ زکاۃ اور مرتدین [1] پیش پیش تھے، لیکن حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی دُور اندیشی، مستقل مزاجی اور ایمانی قوت نے ان فتنوں کو دبا دیا، دَور فاروقی میں بھی کوئی فتنہ سر نہ اُٹھا سکا۔ کیونکہ ایک تو تھوڑا عرصہ قبل حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فتنوں کی سرکوبی فرما دی تھی، جس نے آنے والے خلیفہ کی مشکل آسان کر دی تھی، دوسرا یہ کہ خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ خود بڑے عادل، منصف، زِیرک، معاملہ فہم، اور صاحبِ جلال و جبروت تھے، البتہ دَورِ عثمانی کے آخری حصے میں مختلف فتنوں نے پَر پُرزے نکالے اور سر اُٹھایا، اس میں شک نہیں کہ خلیفہ ثالث حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ بڑے معاملہ فہم اور صاحبِ ایمان وتقویٰ تھے مگر آپ رضی اللہ عنہ نہایت رقیق القلب، صاحب رفق وحِلم اور حد سے زیادہ حلیم و بُردبار تھے۔ بس شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد حالات دِگرگوں ہو گئے اور پھر ایسے تلپٹ ہوئے کہ بگڑتے ہی چلے گئے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ جب سریر آرائے خلافت ہوئے تو ملّی امن غارت اور ملکی سکون

---

[1] مرتدّین سے مراد اسلام سے کفر کی جانب لوٹ جانے والے لوگ ہیں۔ اسلام کے مطابق اِرتداد ہر درجہ موھِنِ اسلام اور بڑا جرم ہے کہ جس کی سزا قتل کے سوا کچھ نہیں۔ مرتد شخص کافر سے بھی برا ہے یہ شخص والد کا وارث نہیں بن سکتا، یہ شخص اسلام اور مسلمانوں کے لیے باعث بدنامی بننے کی بنا پر بدترین کافر شمار ہوتا ہے۔ جیسے قادیانی وغیرہ۔

کافی حد تک برباد ہو چکا تھا۔ آپ کا تقریباً پورا عرصۂ خلافت ہنگاموں اور شورشوں میں گزرا، اور حالات اس قدر نازک صورت اختیار کر چکے تھے کہ آپ رضی اللہ عنہ جیسے مدبر، عالی حوصلہ، پارسا اور عقیل وفہیم سے حل نہ ہو سکے، اور صورت یہ بن گئی کہ ''مرض بڑھتا گیا جُوں جُوں دوا کی۔''

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے روکنے اور ناپسندیدہ ترین جاننے کے باوجود آپ کے دَور خلافت میں مسلمانوں کے مابین مسلح جنگیں ہوئیں جن میں ہزاروں آدمی تہ تیغ ہوئے۔ اوران اسباب کی بنا پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کوئی پیش قدمی نہ فرما سکے۔ جبکہ آپ سے قبل خلفائے ثلٰثہ رضی اللہ عنہم کے عہد میں پیش قدمی ہوئی اور اسلامی قلمرو میں اضافہ ہوتا رہا۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے دَور میں شام، فلسطین اور اُردن وغیرہ کے گورنر رہ چکے تھے، اور آپ رضی اللہ عنہ کی باریک بین اور دور اندیش نگاہ ان تمام واقعات کو بچشم خود دیکھ چکی تھی۔ آپ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے صلح کے بعد جب اسلامی قلم رو سنبھالا تو جس کام کی طرف اوّلین توجہ دی وہ ملکی امن و امان تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے قلیل مدت میں خدا داد صلاحیت اور انتظامی قابلیت کی بدولت اپنے زیر حکومت علاقے کو امن وسکون کا گہوارہ بنا دیا۔ آپ رضی اللہ عنہ کے قلمرو میں پیار ومحبت کے پھول کھلنے اور اِخلاص وایثار کی کلیاں چٹکنے لگیں۔

آپ رضی اللہ عنہ کا یہی وہ تدبُّر تھا جس کے پیشِ نظر پہلے خلفاء رضی اللہ عنہم نے آپ رضی اللہ عنہ کو اعلیٰ منصب دیا تھا۔ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ جیسا دُور اندیش اور دانا و بینا، عدل گُستر، صاحب تدبیر حکمران آپ رضی اللہ عنہ کے حسن انتظام کا مدّاح تھا۔ ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''اے لوگو! تم میرے بعد آپس میں گروہ بندی سے بچو، اور اگر تم نے ایسا کیا تو سمجھ رکھو کہ معاویہ رضی اللہ عنہ شام میں موجود ہیں۔''[1]

---

① الإصابہ: 3/414، مطبوعہ مصر۔

اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جیسے صاحب تقویٰ اور بالغ النظر حکمران کو آپ رضی اللہ عنہ پر بے حد اعتماد تھا۔ اگر دورِ فاروقی میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ شام کے گورنر تھے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے آپ رضی اللہ عنہ کو شام کے علاوہ قنسرین، اردن اور فلسطین کی گورنری بھی سونپ دی تھی، کیونکہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے دیکھ لیا تھا کہ وہ جس علاقے کا نظم ونسق چلاتے ہیں وہاں امن وسکون کی کلیاں مسکرانے لگتیں اور گھی کے چراغ جلنے لگتے ہیں۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بھی آپ رضی اللہ عنہ کے تدبُّر اور قضا کے معترف تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ ''میں نے عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد کسی کو معاویہ رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر حق کا فیصلہ کرنے والا نہیں پایا۔'' [1]

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما جیسے حبر الأمہ کے آپ رضی اللہ عنہ کے بارے میں تأثرات یہ ہیں:

«لَيْسَ أَحَدٌ مِنَّا أَعْلَمَ مِنْ مُعَاوِيَةَ»

''ہم میں معاویہ رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں۔'' [2]

اور امام بخاری رحمہ اللہ نے ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے:

اِنَّهٗ فَقِيهٌ ''بیشک معاویہ رضی اللہ عنہ فقیہ ہیں۔'' [3]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا ارشاد ہے: ''میں نے معاویہ رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر سرداری کے لائق کوئی آدمی نہیں پایا۔'' [4]

یہ چند حوالے بطور مشتے از خروارے، پیش کیے ہیں جن سے یہ بتانا مقصود ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ علم وبصیرت، تدبیر وسیاست، ذہانت وفطانت، حلم وشرافت اور ملکی، قومی اور دینی خدمات میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔

سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب صحابی تھے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم میں ممتاز مقام رکھتے تھے۔ اور اصولِ جہانبانی میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ کے عہدِ حکومت

---

[1] البداية والنهاية: 135/8. [2] سنن کبریٰ بیہقی: 26/3، دکن. [3] البدایہ والنہایہ: 131/8، مطبوعہ مصر. اور دیکھیے صحیح البخاري، کتاب الوتر. [4] البدایہ والنہایہ: 135/8، مصر.

میں اسلامی مملکت نے بے حد ترقی کی، جو ہر اعتبار اور ہر پہلو سے پروان چڑھی، اور مملکت اسلامیہ کی ساکھ قائم ہو چکی تھی۔ سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ یہ چاہتے تھے کہ اسلامی ترقی رُک نہ جائے، بلکہ کسی طرح اسلامی سلطنت بڑھتی اور پھیلتی پھولتی چلی جائے۔ اس کام کے لیے آپ کی نگاہ اپنے بعد اپنے بیٹے یزید پر پڑی۔ اور اپنے بیٹے پر نگاہ اس لیے نہ پڑی کہ وہ آپ کا پسر تھا بلکہ اس لیے پڑی کہ وہ آپ رضی اللہ عنہ کے خیال میں اپنے اندر حکمرانی و جہانبانی کے جملہ ضروری اوصاف رکھتا تھا، اور یزید کی ساکھ بھی اچھی تھی۔ کسی بھی قابل ذکر شخص کے اس کے بارے میں برے خیالات یا منفی جذبات نہ تھے۔

ایک روز امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے بطور آزمائش یزید سے پوچھا کہ اگر تمھیں حکومت دے دی جائے تو اسے کس طرح چلاؤ گے؟ یزید نے جواب دیا:

كُنْتُ وَاللّٰهِ يَأَبَتِ عَامِلًا فِيهِمْ عَمَلَ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ.

"بخدا! ابا جان! میں عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے طریقے پر نظامِ حکومت چلاؤں گا۔" [1]

اس دُور اندیشانہ اور پُر مغز جواب سے یزید کی اس وقت کی فکری صلاحیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ خیال رہے اُس زمانہ میں یزید کی ساکھ اچھی اور شخصیت قابل اعتماد تھی۔ ہمارے عام لوگ شیعی پروپیگنڈے سے متاثر ہیں جو ان کے تعصب اور کوتاہ نظری پر دِلالت کرتا ہے۔ ہمارے بہت سے سُنّی احباب بھی امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور یزید دونوں کے بارے میں اچھے خیالات نہیں رکھتے، شیعہ تو ایسا نظریہ رکھتے ہی تھے۔ شیعی پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر وہ بھی نسلاً بعد نسلٍ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو بدعتی اور یزید کو شرابی کبابی، زانی، فاسق، فاجر بلکہ بعض کافر تک کہہ دیتے ہیں، بڑے بڑے علماء اور واعظین اپنی کتب میں یزید کو ملعون علیہ اللَّعْنَة "یزید پلید" اور پتہ نہیں کیا کیا لکھتے ہیں۔ اور "یہ حادثہ کربلا" اور "واقعہ حرہ" وغیرہ کی بنا پر کہتے اور لکھتے ہیں۔ وہ یہ قطعاً غور

---

[1] البداية: 229/8.

نہیں کرتے کہ بھلا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ جیسا ممتاز صحابی جس کے بارے میں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ''ہادی و مہدی'' بننے کی دعا کی ہو، بدعت کا کیسے ارتکاب کر سکتا ہے؟ اور یزید جس کے ہاتھ پر ننانوے فیصد مسلمانوں نے بیعت کی ہو جن میں ایک بہت بڑی تعداد اصحابِ رسول رضی اللہ عنہم اور تابعین کرام رحمہم اللہ کی تھی، جس میں امت کے عظیم لوگ شامل تھے، بھلا کیونکر فاسق و فاجر ہو سکتا ہے؟ کچھ دریدہ دہن لوگ ذرا نہیں جھجکتے اور شرماتے۔ وہ جھٹ صحابہ رضی اللہ عنہم کو ڈرپوک اور منافق پتہ نہیں کیا کیا کہہ دیتے ہیں نعوذ باللہ من ذالک۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ بلند بخت اور عظیم لوگ ہرگز ڈرپوک تھے نہ منافق۔ وہ بڑے دلیر، پکے مؤمن، خالص مسلمان اور حامل قرآن و سنت تھے۔ خصوصاً اہل سنت کو صحابہ رضی اللہ عنہم اور ان کے انتخاب کردہ امیر کو ہرگز موردِ الزام نہیں ٹھہرانا چاہیے۔ ذرا دل تھام کر اکابرین دین وملت کے کچھ افکار و خیالات ملاحظہ کیجیے۔ شاید آپ کے الجھے ہوئے مسئلے کے لیے کوئی واضح اور اچھی راہ نکل آئے۔

یزید کے بارے میں حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کا مشہور ارشاد ہے:

«وَإِنَّ ابْنَهُ يَزِيْدَ لَمِنْ صَالِحِيْ أَهْلِهِ»

''اور بلاشبہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا بیٹا یزید، ان کے صالح افرادِ خانہ میں سے ہے۔''[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ کی چشم دید شہادت ملاحظہ ہو، آپ نے فرمایا:

«قَدْ حَضَرْتُه وَأَقَمْتُ عِنْدَهُ فَرَأَيْتُهُ مُوَاظِبًا عَلَى الصَّلٰوةِ مُتَحَرِّياً لِلْخَيرِ، يَسْئَالُ عَنِ الْفِقْهِ، مُلَازِمًا لِلسُّنَّةِ»

''میں اس کے پاس گیا ہوں اور قیام پذیر رہا ہوں، میں نے اسے نماز کا پابند اور بھلائی کا طلب گار پایا، وہ فقہ و دانش کی باتیں پوچھتا ہے، اور سنت مطہرہ کا

---

① انساب الاشراف بلاذری: 4,3/2.

عامل و حامل ہے۔"[1]

امام ابنِ کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: «فَجَآءَ نَجِيباً ذَكِيًّا حَاذِقًا»

"یزید پیدائشی طور پر شریف الطبع، ذہین اور فہیم تھا۔"

اور اس کے دو تین صفحات کے بعد لکھتے ہیں:

«وَقَدْ كَانَ يَزِيْدُ فِيْهِ خِصَالٌ مَحْمُوْدَةٌ مِنَ الْكَرَمِ وَالْحِلْمِ وَالْفَصَاحَةِ وَالشِّعْرِ وَالشُّجَاعَةِ وَحُسْنِ الرَّأْيِ فِي الْمُلْكِ وَ كَانَ ذَا جَمَالٍ حُسْنِ الْمُعَاشَرَةِ»

"یزید عمدہ صفات کا پیکر تھا، وہ حلم و کرم، فصاحت و شعر گوئی، شجاعت و بسالت کا جامع تھا، امورِ سلطنت میں عمدہ رائے رکھتا تھا، حسین، وضع دار اور خوش کردار تھا۔"[2]

محقق علمائے اہلِ سنت اور جملہ اربابِ تحقیق کا یہی مؤقف ہے جو ہم نے مختصراً بیان کیا ہے، اور جنہوں نے اس کے برعکس لکھا ہے وہ اپنے پرائے صدیوں پرانے پروپیگنڈے سے حد درجہ متاثر ہیں۔ اور باوجود بڑا علم ہونے کے گہرائی میں نہیں گئے۔ اور محقق یا ابوالحقائق کہلا کر تحقیق کی وادی میں قدم نہیں رکھا۔ معلوم نہیں وہ یہ کیوں نہیں دیکھتے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے جب یزید کو خلافت کے لیے نامزد کیا تھا، اس وقت تو شہادت حسین رضی اللہ عنہ کا حادثہ ابھی پیش ہی نہ آیا تھا، بلکہ یہ حادثہ اس کے سریر آرائے خلافت ہونے کے عرصہ بعد پیش آیا تھا۔ لیکن وہاں بھی امر واقعی اور ثابت شدہ بات یہ ہے کہ جیسا کہ آئندہ آپ پڑھیں گے کہ شہادتِ حسین رضی اللہ عنہ میں یزید کا ہاتھ یا ایماء کچھ نہ تھا، اس سلسلے میں یزید کا کوئی اشارہ، ترغیب، فیصلہ یا حکم نہیں ملتا، ہاں،

---

[1] البداية والنهاية: 233/8. [2] البداية والنهاية: 228/8.

بدقسمتی سے یہ واقعہ اس کے دَورِ حکومت میں ہوا جس کی بنا پر وہ بدنام ہو گیا، اور دنیا جہان کے جملہ عیوب اس میں جمع ہو گئے، اور وہ شرابی، زانی، کبابی، فاسق، فاجر، کافر اور پتہ نہیں کیا کیا بن گیا؟

آیئے! اگر آپ کو اپنے مزاج کے خلاف بھی کچھ دیکھنے پڑھنے، سننے اور برداشت کرنے کا سلیقہ اور حوصلہ ہے تو ذیل کے متبحر اہلسنت علمائے ذی وقار کی تحقیقات بھی ملاحظہ فرمایئے۔ صحیح آدمی وہ ہوتا ہے جو طرفین کی تحقیقات و آراء کا بے لاگ مطالعہ کر کے رائے قائم کرے...... الحمد للہ! اب آہستہ آہستہ ایسے لوگ پیدا ہو رہے ہیں جو وادیٔ تحقیق و تجسس میں قدم رکھنا پسند کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب دوستوں کو ظرف کی کشادگی اور نگاہ کی وسعت عطا فرمائے۔ آمین۔

اہل تشیع کے ساتھ اہلسنت کا ایک طبقہ بھی یزید کی مخالفت کے پروپیگنڈے میں شریک ہو گیا۔ انھی کی زبان استعمال کی۔ اور وہ بھی ان کی طرح شرر بار بن گیا۔ اب ماہ محرم کی مجالس میں یہ فرق کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ شیعہ کون ہیں اور سنّی کون۔ اب ذرا حجۃ الاسلام امام غزالی رحمہ اللہ (جن کا اپنا ایک علمی مقام ہے ان) جیسی نابغہ روزگار شخصیت جو سبھی کے نزدیک نہایت واجب الاحترام ہے کا فتویٰ ملاحظہ ہو:

- حضرت امام غزالی رحمہ اللہ نے اپنے فتویٰ میں لکھا ہے:

«وَمَا صَحَّ قَتْلُهُ الْحُسَيْنَ وَلَا أَمْرَهُ بِهِ وَلَا رَضِيَهُ»

''یزید کا حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کرنا یا قتل کا حکم دینا یا اس پر راضی ہونا ثابت نہیں۔''

- حضرت ملا علی قاری رحمہ اللہ نے ''شرح فقہ اکبر'' میں یہی نظریہ پیش کیا ہے۔
- قاضی ابوبکر ابن العربی مالکی رحمہ اللہ جیسی شہرۂ آفاق شخصیت نے یزید کے فسق و فجور کی تردید کی ہے۔
- امامِ احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اپنی ''کتاب الزھد'' میں یزید کو پرہیزگار اور دین

دار لوگوں میں شمار کیا ہے۔

✽ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کے مایہ ناز شاگرد علامہ حافظ عبدالغنی مقدسی رحمہ اللہ نے اپنے فتویٰ میں لکھا ہے:

"یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت صحیح ہے، جن ساٹھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یزید کی بیعت کی ان میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی ہیں۔"

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا کبار صحابہ میں شمار ہوتا ہے۔

حاصل کلام یہ کہ اگر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید کو نامزد کیا تھا تو یہ آپ نے کوئی ناقابل معافی اور گشتنی جرم نہیں کیا تھا، بلکہ آپ نے نیک ارادے اور پاکیزہ جذبات لے کر اسے نامزد کیا تھا۔ جہاں تک سمجھ آتی ہے آپ کے سامنے پہلے دور کے تمام نازک حالات تھے، آپ یہ چاہتے تھے کہ میں اپنی زندگی ہی میں مسئلہ خلافت و امارت حل کر جاؤں تاکہ بعد میں ملت اسلامیہ انتشار کا شکار نہ ہو، اور مخالفین اسلام کو کسی سازش اور ریشہ دوانی کا موقع نہ مل سکے، بس یہ تھی سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی نیت۔ اور یہ تھا آپ کا نیک ارادہ، یعنی آپ نے ملک و ملت کو محض اختلاف و انتشار سے بچانے اور اسلامی قلمرو میں لا الہ الا اللہ کا پرچم لہرانے کے لیے یزید کی نامزدگی کی تھی، ورنہ اس لیے اس کی نامزدگی نہیں کی تھی کہ یزید بیٹا تھا، میں اسے حکومت دے کر خوش ہو کر جاؤں۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی دُور رَس اور جہاں بین نگاہ میں یزید آپ کی جگہ سنبھالنے کی خُوب اہلیت رکھتا تھا، جیسا کہ پیچھے آپ حوالہ جات ملاحظہ فرما چکے ہیں۔

ایک دفعہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے برسر منبر یہ دُعا کی:

«اَللّٰهُمَّ إِنْ كُنْتُ عَهِدْتُ لِيَزِيْدَ لِمَا رَأَيْتُ مِنْ فَضْلِهِ ......»

---

① الذیل علیٰ طبقات الحنابلہ لابن رجب: 2/34.

"اے اللہ! اگر میں نے یزید کو اس کی خوبی و کمال دیکھ کر ولی عہد بنایا تو اسے منزل تک پہنچا دے اور اس کی مدد فرما۔ اور اگر میں نے اسے محبتِ پدری کی بنا پر ولی عہد بنایا ہے تو تختِ خلافت پر متمکن ہونے سے قبل اس کی رُوح قبض فرما لے۔"[1]

اب بھی اگر کوئی شخص حقیقت حال اور امر واقعہ سے صرف نظر کر کے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو مطعون گردانے اور ان کی نیت پر حملہ کرے تو اس کی مرضی ہے، ہم نے تو نفس مسئلہ کی وضاحت کی کافی حد تک کوشش کی ہے۔ آگے لوگوں کی اپنی اپنی سوچ اور اپنی اپنی مرضی ہے۔

یہاں یہ بات ضرور پیشِ نظر رہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں ہمیشہ بہتر رائے رکھنی چاہیے کیونکہ ہمیں ان کے بارے میں بہتر اور اچھی رائے رکھنے کا حکم ہے۔ یہ مسئلہ دین، ایمان اور عقیدے سے تعلق رکھتا ہے اور بہت حساس ہے۔ یاد رکھیے! جمیع صحابہ رضی اللہ عنہم اخیار امت تھے۔ اللہ نے انھیں اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت و رفاقت اور نصرت و حمایت کے لیے خود چنا تھا، ان کے بارے میں بُرا سوچنا یا کسی مفہوم کی اچھی تعبیر کی بجائے گھٹیا تعبیر اختیار کرنا جس سے ان کی توہین و تنقیص یا ذم کا پہلو نکلتا ہو اچھا اور محتاط طریقہ نہیں، اس طریقے سے ان کے بارے میں عدم عقیدت بلکہ غایت درجہ نفرت کے رذیل جذبات پیدا ہو کر پروان چڑھتے ہیں، جو کسی شخص کے ایمان کے لیے شدید نقصان دہ ہیں۔ اس سے بڑا نقصان کیا ہو سکتا ہے کہ بندے کے پلّے ایمان نام کی کوئی شے ہی باقی نہ رہے۔ اور اس کا خاتمہ برا اور انجام تباہ کن ہو۔[2]

---

[1] تاریخ الاسلام للذهبی و طبقات المشاهیر و الاعلام: 268/2.

[2] اس سلسلے میں ہماری کتاب زیر ترتیب "گستاخان صحابہ رضی اللہ عنہم کا برا انجام" کا مطالعہ فرمائیے۔ (مؤلف رحمہ اللہ اصلاح امت کے لیے کچھ سوچتے یا لکھتے رہتے تھے۔ انھوں نے جس زیر ترتیب کتاب کا ذکر کیا ہے شاید ان کے مسودے سے مل جائے تو اسے شائع کیا جائے گا۔ ان شاء اللہ۔ (ناشر)

یزید کی جانشینی اور بیعت

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد ہی میں یزید کی خلافت کا اعلان فرما دیا تھا۔ کوئی بات اِخفا اور پردے میں نہ رکھی۔ اور بنام الٰہ حکومت اسے سونپ دی، امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے خود بھی اس کی بیعت کی۔ اور صحابہ رضی اللہ عنہم تابعین رحمہم اللہ اور دیگر مسلمانوں نے بھی اس کی بیعت کی۔ اور ان کا یزید کی بیعت کرنا بلا سوچے سمجھے نہ تھا بلکہ خوب غور و فکر کر لینے کے بعد تھا، وہ یزید سے بے خبر نہ تھے۔ اس کے عادات و خصائل سے آگاہ تھے، اس کی رائے اور تدبیر سے واقف اور شجاعت و بسالت سے باخبر تھے۔ کئی بزرگ اصحاب یزید کی زیر قیادت جہاد قسطنطنیہ میں شریک ہو چکے تھے، اور جو شریک نہیں ہوئے تھے وہ بھی اس کی حرب وضرب اور فن سپہ گری، شجاعت و تہوّر سے خوب آشنا تھے۔ دنیائے اسلام میں ایک بھی صاحب علم اور ذمہ دار شخص ایسا نہیں ملتا جس نے حادثہ کربلا سے قبل یزید پر لے دے یا نقد و جرح کی ہو یا علانیہ یا دبے الفاظ میں اسے فاسق، فاجر، شرابی، بدقماش، بے عقل، یا بزدل وغیرہ کہا ہو۔ نہ اس نے کبھی ریچھ پالا تھا نہ بندر۔ ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اگر پہلے زمانے کے لوگ خاموش رہے تو بعد میں آنے والے لوگ کیوں مضطرب ہیں؟ انھیں بھی خاموشی اختیار کر لینی چاہیے۔ اگر خاموشی اختیار نہ کریں گے تو اسلاف کا کیا نقصان ہوگا ہمارا اپنا ہی نقصان ہوگا۔ اور ملّی امن و سکون متأثر ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ لیں کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور

اسلاف اور جملہ اہل اسلام نے ترک اولیٰ سے کام لیا۔ وہ اجتہادی لغزش سے دو چار ہوئے۔ وہ اگر یوں نہ کرتے تو زیادہ اچھا ہوتا وغیرہ وغیرہ، مگر اب وقت پلٹ کر تو نہیں آ سکتا۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اور پھر صحابہ رضی اللہ عنہم کوئی عام بزرگ تو نہیں تھے جنھیں نقد و جرح کی سان پر چڑھایا جائے۔ جن کی توہین و تحقیر کا مشغلہ اختیار کیا جائے اور انھیں تمسخر و تضحیک کا تختۂ مشق بنایا جائے۔ یہ برائی پہلی برائی سے از روئے انجام کئی گنا زیادہ ہے۔ فافهم ولا تكن من الغافلين.

بعض احباب جہاد قسطنطنیہ میں یزید کی امارت کو تسلیم نہیں کرتے کیونکہ اگر وہ اس جہاد میں یزید کی شرکت کو تسلیم کر لیں تو یزید کا مَغْفُورٌ لَّہٗ ہونا ماننا پڑتا ہے اور یہ انھیں شدید ناگوار بلکہ ان کی برداشت سے بھی باہر ہے۔ مگر کیا کیا جائے، اس سلسلے میں صحیح اور صریح حدیث نبوی موجود ہے، جو شارحینِ حدیث کے نزدیک ٹھیک یزید پر چسپاں ہوتی ہے، وہ حدیث، اَصَحُّ الکُتُب، صحیح بخاری میں ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«أَوَّلُ جَيْشٍ مِنْ أُمَّتِي يَغْزُونَ مَدِينَةَ قَيْصَرَ مَغْفُورٌ لَّهُمْ»

”میری امت کا پہلا لشکر جو قیصر کے دارالحکومت قسطنطنیہ پر چڑھائی کرے گا وہ بخشا ہوا ہے۔“[1]

حضرت محمود بن ربیع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«وَيَزِيدُ بْنُ مُعَاوِيَةَ عَلَيْهِم بِأَرْضِ الرُّومِ»

”اس لشکر کا امیر یزید بن معاویہ تھا۔“[2]

علامہ ابن حجر عسقلانی، اور علامہ بدر الدین عینی حنفی اور علامہ قسطلانی رحمہم اللہ جیسے چوٹی

---

① صحيح البخاري، الجهاد و السير، باب ماقيل في قتال الروم، حديث: 2924. ② صحيح البخاري، التهجد، باب صلاة النوافل جماعة جماعة، حديث: 1186.

کے علماء و محدثین و مستند و معتبر شارحین بخاری جن کی علمی ثقاہت کے سامنے سب کی گردنیں جھکی ہوئی دکھائی دیتی ہیں، فرماتے ہیں:

«إِنَّ يَزِيْدَ بْنَ مُعَاوِيَةَ غَزَا بِلَادَ الرُّوْمِ. حَتّٰى بَلَغَ الْقُسْطُنْطِيْنِيَّةَ وَمَعَهُ جَمَاعَةٌ مِنْ سَادَاتِ الصَّحَابَةِ»

''یزید بن حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سرزمین روم میں جہاد کرتا رہا، یہاں تک کہ سرزمین قسطنطنیہ تک جا پہنچا، اور اس کے ساتھ اکابرین صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت تھی۔''[1]

علامہ قسطلانی رحمہ اللہ اجلّہ علماء میں سے ہیں آپ کے الفاظ یہ ہیں:

«كَانَ أَوَّلُ مَنْ غَزَا مَدِيْنَةَ قَيْصَرَ يَزِيدَ بْنَ مُعَاوِيَةَ وَمَعَهُ جَمَاعَةٌ مِنْ سَادَاتِ الصَّحَابَةِ......»

''سب سے پہلے جس نے سرزمین قیصر (روم) میں جہاد کیا وہ یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ تھا۔ اور اس کے ساتھ اجلّہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت تھی۔''[2]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ سے کون ناآشنا ہے؟ آپ فرماتے ہیں:

«فَسَارَ مَعَهُ، خَلْقٌ كَثِيْرٌ مِنْ كُبَرَاءِ الصَّحَابَةِ حَتّٰى حَاصَرَ الْقُسْطُنْطِيْنِيَّةَ»

''اس جہاد روم میں بہت سے کبار صحابہ رضی اللہ عنہم یزید کے ساتھ روانہ ہوئے یہاں تک کہ اس نے آگے پہنچ کر قسطنطنیہ کا محاصرہ کر لیا۔''[3]

اور اسی البدایۃ جلد 8، صفحہ 151 میں ہے: ''حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی اس لشکر میں شریک تھے۔''

---

[1] فتح الباری: 78/6، و عمدۃ القاری: 199/14. [2] قسطلانی بحوالہ حاشیہ صحیح البخاری: 410/1. [3] البدایہ والنہایۃ: 32/8.

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«أَوَّلُ جَيْشٍ غَزَاهَا كَانَ أَمِيرُهُمْ يَزِيدَ»

"پہلا لشکر جس نے وہ جہاد کیا ان کا امیر یزید تھا۔"[1]

امام ذہبی رحمہ اللہ کا بھی یہی ارشاد ہے......[2]

مؤرخ طبری لکھتا ہے:

"یزید بن معاویہ نے روم میں جنگ کی، یہاں تک کہ قسطنطنیہ تک پہنچ گیا۔"[3]

علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ کی بھی یہی تحقیق ہے......[4]

یہ تھوڑی سی تفصیل ہم نے اس لیے دی ہے تاکہ حدیث کا مذکورہ مفہوم سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ وہ لوگ جو وسیع مطالعے سے عاری اور علمائے تحقیق کی مجالس سے محروم ہیں بوجہ تقلید و جمود کے وہ بے سند قصے کہانیاں سن سن کر بہک جاتے ہیں۔ وہ ان دلائل کا بنظر غائر مطالعہ فرمائیں۔ شاید ان کے دل و دماغ کے دریچے کھل جائیں اور وہ کچھ حاصل کر سکیں جو انھیں حاصل ہونا چاہیے۔ ورنہ فی زمانہ بڑے بڑے اصحاب جبہ و دستار ہیں جن کا مطالعہ اور تحقیق سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے اور ہر دلیل کے سامنے نفی میں سر ہلا دیتے ہیں۔ لیکن اَدِلّہ و براہین کے مقابلے میں تنکوں کا سہارا کام نہیں دیتا۔

اسی جہاد قسطنطنیہ کے موقع پر حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ، جو شریک جہاد تھے، انتقال فرما گئے، اُن کی نمازِ جنازہ یزید نے پڑھائی اور سب مجاہدین نے، جن میں متعدد اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی تھے، اس کے پیچھے نماز ادا کی۔[5]

قیصر روم کو جب معلوم ہوا کہ ابو ایوب رضی اللہ عنہ کو قسطنطنیہ کے دامن میں دفن کیا گیا تو اسے ناگوار گزرا، اور اس نے ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے بارے میں چند نازیبا الفاظ

[1] منهاج السنة: 252/2. [2] المنتقى: 288. [3] تاريخ طبرى اردو: 56/5. [4] سيرة النبى: 601/5. [5] البداية والنهاية: 58/8.

کہے۔ یزید نے جب صحابی رسول ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ (جنھیں میزبانی رسول ﷺ کا شرف بھی حاصل ہوا) کی شان اقدس میں قیصر روم کے گستاخانہ الفاظ سنے، تو جوش و جذبے سے اپنے ہاتھ میں گرز لے کر قلعہ قسطنطنیہ کے صدر دروازے پر زور زور سے ضربیں لگائیں اور کہا:

«يَأَهْلَ الْقُسْطُنْطِينِيَّةِ هٰذَا رَجُلٌ مِنْ أَكَابِرِ أَصْحَابِ مُحَمَّدٍ نَبِيِّنَا وَقَدْ دَفَنَّا حَيْثُ تَرَوْنَ، وَاللّٰهِ لَئِنْ تَعَرَّضْتُم لَهُ لَأَهْدِمَنَّ كُلَّ كَنِيْسَةٍ مِنْ أَرْضِ الْإِسْلَامِ وَلَا يُضْرَبُ نَاقُوْسٌ بِأَرْضِ الْعَرَبِ أَبَدًا»

"اے ساکنان قسطنطنیہ! ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ ہمارے نبی، حضرت محمد ﷺ کے عظیم صحابی ہیں۔ اور تم دیکھتے ہو ہم نے انھیں اس جگہ دفن کیا ہے۔ اللہ کی قسم! اگر تم نے ان کی قبر کو کوئی نقصان پہنچایا تو یاد رکھو! میں اسلامی مملکت میں تمھارے تمام چرچ گرادوں گا، پھر سرزمین عرب میں (تمھارا) ناقوس کبھی نہ بج سکے گا۔"[1]

ہمیں معلوم ہے کہ مضمون میں قدرے طوالت ہوگئی ہے، مگر یہ طوالت ہم نے اس لیے اختیار کی تاکہ ہمارے وہ دوست جو پروپیگنڈے سے متأثر ہوکر یزید کو بے دین، بے غیرت، فاسق، فاجر، بزدل، نبی ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا دشمن اور پتہ نہیں کیا کچھ کہہ دیتے ہیں، ان کے سامنے اس پروپیگنڈے کی حقیقت ظاہر ہوجائے۔ اور انھیں خبر ہوجائے کہ یزید کا کردار کیسا تھا......؟

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے کو جانشین بنایا تو کیوں بنایا...... صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمہم اللہ اور تمام اہلِ اسلام نے جو اس کی بیعت کی تو کیوں کی......؟ اس قسم کے سوالات کا جواب گذشتہ صفحات میں آپ پڑھ چکے ہیں۔

[1] ناسخ التواریخ: 66/2.

یہ ہم نے جو تحقیق اور موقف پیش کیا یہ قرینِ انصاف بھی ہے اور قرینِ صواب بھی، کیونکہ اسے اختیار کرنے سے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ، صحابہ رضی اللہ عنہم، تابعین اور خانوادہ اہل بیت رضی اللہ عنہم کے بقیۃ السّلف ارکان رحمہم اللہ اور جملہ اہلِ اسلام کی پوزیشن صاف رہتی ہے اور ان پر کسی قسم کا حرف نہیں آتا، نہ کسی کو حرف گیری کا موقع ملتا ہے۔ بصورتِ دیگر یہ سب بزرگ مطعون اور موردِ الزام ٹھہرتے ہیں جو یقیناً درست نہیں۔

ہاں دو تین صحابہ رضی اللہ عنہم ایسے بھی تھے کہ جنھوں نے یزید کی بیعت نہ کی تھی۔ ان میں نمایاں نام حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما، حضرت ابنِ زبیر رضی اللہ عنہما اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ہیں، مگر ان میں ابنِ عمر رضی اللہ عنہما نے بعد میں بیعت کر لی تھی۔ اور خوف سے نہیں کی تھی بلکہ اپنی کامل رضا سے کی تھی۔ چنانچہ حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما جیسے متدیّن اور متقی صحابی کا اپنا ارشاد ہے، جسے کچھ شبہ ہو وہ آپ کا یہ ارشاد گرامی پڑھ لے:

«إِنَّا قَدْ بَايَعْنَا هٰذَا الرَّجُلَ عَلٰى بَيْعِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ»

”بے شک ہم نے اس شخص (یزید) سے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی ہے۔“[1]

ابنِ عمر رضی اللہ عنہما نے یہاں بَایَعْتُ کے بجائے بَایَعْنَا فرمایا، یعنی بجائے واحد متکلم کے جمع متکلم کا صیغہ استعمال کیا ہے جو آپ کے رفقاء صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی شامل ہے۔ دوسرے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما تھے جنھوں نے یزید کی بیعت نہ کی مگر آپ کی بیت اللہ (مکہ مکرمہ) میں حکومت قائم ہو چکی تھی، یہ الگ بات ہے کہ وہ دیر پا نہ رہی۔

بیعتِ یزید کا انکار کرنے والے تیسرے اہم فرد خود سیّدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ تھے۔ بیشک آپ رضی اللہ عنہ اپنے موقف پر ایک عرصہ تک قائم رہے۔ ”ایک عرصہ تک“ کے الفاظ ہم نے اس لیے استعمال کیے کہ آپ رضی اللہ عنہ پر ایک وقت ایسا بھی آ گیا تھا جب

---

[1] صحيح البخاري، الفتن، باب إذا قال عند قوم شيئًا ثم خرج فقال بخلافه، حديث: 7111.

آپ نے اپنے مؤقف میں تبدیلی فرمالی تھی، جس کا مفصل بیان آگے اپنی جگہ پر آئے گا۔ ہمارے بہت سے سنّی بھی اس بات سے بدکتے ہیں۔ مگر حقیقت حقیقت ہے جسے جوش، جذبے اور نعروں کی بلکار و للکار سے جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ مگر جی کڑا کر کے اگلے صفحات کا ایک بار ضرور مطالعہ فرمائیں، بفضلہٖ غلط پروپیگنڈے کے بادل چھٹ کر مطلع صاف ہو جائے گا۔ (ان شاء اللہ)

قارئین! پہلے بھی اس بات کی وضاحت کی گئی ہے، اب ایک مرتبہ پھر اس بات کی وضاحت کر دینا نامناسب نہ ہوگا کہ بعض کتب میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں ایسے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں کہ جن سے ان کی تنقیص ظاہر ہوتی ہے، لیکن ایسی باتوں کو ذہن میں لانے سے پرہیز کرنا چاہیے، کیونکہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ جماعتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ایک اہم رکن تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ کی صحابیت سے صحابہ و اہلبیت رضی اللہ عنہم تابعین اور ائمہ اربعہ وائمہ دوازدہ رحمہم اللہ اور حاملینِ حدیث وسنت کے کسی ایک فرد کو بھی اختلاف نہیں رہا۔ انھیں صحابہ رضی اللہ عنہم کی صف سے خارج کرنا سراسر ڈھٹائی اور سعی ناتمام اور لاحاصل ہے۔

یہ بات نہ بھولیں کہ قرآن وحدیث نے صحابہ رضی اللہ عنہم کا جو مقام بیان کیا ہے یہ نظریہ اور سوچ اس کے یکسر منافی ہے، نیز آپ رضی اللہ عنہ کے خلاف منفی حوالے مستند تواریخ کے مقابلے میں وارد ہونے کی وجہ سے کوئی اہمیت نہیں رکھتے، علاوہ ازیں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جب کسی صحابی کے بارے میں دو متضاد بیانات یا نظریات ملیں تو اُس بیان اور نظریے کو اختیار کرنا چاہیے جس سے ان کی حیثیت مجروح نہ ہوتی ہو۔ بلکہ اگر ان کی شان سے بعید کوئی قول ملے تو اس کی ایسی تاویل کرنی چاہیے جس سے ان پر کوئی حرف نہ آئے۔ کیونکہ صحابہ واہلِ بیت رضی اللہ عنہم کا احترام ملحوظ رکھنا ہمارا جزوِ ایمان ہے۔ دراصل صحابہ پر حرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر حرف ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر حرف اللہ پر حرف ہے، یعنی بات بہت دور چلی جاتی ہے۔ مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے عام مصنفین، مضامین

نگار اور واعظین و ذاکرین کرام ان اہم اور بنیادی باتوں کی جانب توجہ نہیں کرتے، یا ان حقیقت طراز اور قابلِ توجہ نکات کی جانب ان کا مخصوص ذہن اور تنگ مزاج مائل نہیں ہوتا۔ کوئی ایک بات ضرور ہے۔

اس سلسلے میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی کتاب ''منہاج السنہ'' شاہ عبدالعزیز محدث رحمہ اللہ کی کتاب ''تحفہ اثنا عشریہ'' قاضی ابوبکر کی ''العواصم'' مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی رحمہ اللہ کی کتاب ''خلافت راشدہ'' اور دیگر بہت سے راسخ علماء کی کتب موجود ہیں ان کا مطالعہ کریں۔ یا براہِ راست علمائے راسخین سے تبادلہ خیال کریں، بفضلہٖ فائدہ ہوگا اور شکوک وشبہات کا غبار چھٹ جائے گا۔ مولانا حافظ صلاح یوسف الدین حفظہ اللہ کی کتاب ''خلافت وملوکیت کی شرعی حیثیت'' مولانا حکیم عبدالرحمٰن بدوملہی کی ''امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ'' مولانا مفتی احمد یار خاں گجراتی کی ''امیر معاویہ رضی اللہ عنہ''، مولانا عبدالشکور لکھنوی، مولانا اللہ یار (جہلم)، مولانا محمد صدیق (فیصل آبادی)، مولانا نورالحسن بخاری، مولانا دوست محمد قریشی، مولانا محمد نافع، مولانا مہر محمد میانوالوی کی روح پرور کتب کا مطالعہ بھی خوب رہے گا۔ متقدمین ومتاخرین کی اور بھی بہت سی کتب ہیں جن کی بابت اہل علم سے دریافت کیا جاسکتا ہے۔ مطلب یہ گھسی پٹی تقریروں اور تحریروں پر اور آباء و اجداد کے رنگا رنگ اور سٹیٹ لائن سے متضاد نظریات پر اکتفا کرنے کی بجائے وسیع النظری سے اپنے دائرہ معلومات میں ہر ممکن اضافے کی کوشش فرمائیں۔ اور یہی اہل علم کے شایانِ شان ہے۔ جب تنگ نظر و تنگ ظرفی سے دور ہو کر مطالعہ فرمائیں گے تو بفضلہٖ ہر بات حقیقت کی آنکھوں سے نظر آئے گی اور جملہ اشکالات وحجابات آپ سے آپ اٹھ جائیں گے۔ (ان شاء اللہ)

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی وصیت

ماہِ رجب 60ھ میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بیمار پڑ گئے۔ آپ نے انتقال سے

پہلے یزید کو بلایا اور وصیت فرمائی، وصیت کے اہم حصے یہ ہیں:

"اے یزید! ہمیشہ اللہ سے ڈرتے رہنا۔ خلافت کا یہ معاملہ تمھارے سپرد ہوا ہے، اور اب تم ان تمام معاملات پر با اختیار ہو جن پر میں تھا...... لوگوں کے ساتھ نرم برتاؤ کرنا۔ اگر ان کی طرف سے تمھارے لیے تکلیف دِہ اور تنقیص آمیز باتیں سرزد ہوں تو ان سے چشم پوشی کرنا...... خبردار!! صالح اور بزرگوں کا ہمیشہ خیال رکھنا، ان کے ساتھ توہین اور تکبر سے پیش نہ آنا...... جب کسی کام کا ارادہ کرو تو نیک، پرہیز گار، عمر رسیدہ اور آزمودہ کار لوگوں کو بلا کر مشورہ کرنا...... ہر وقت مستعد رہنا، اپنے لشکر کی حفاظت رکھنا، نیز اپنے آپ کی اصلاح کرتے رہنا...... اپنے متعلق لوگوں کو انگلیاں اُٹھانے کا ہرگز موقع نہ دینا، کیونکہ عام لوگ عیب جوئی میں بڑے جلد باز ہوتے ہیں...... نماز میں ہمیشہ حاضر رہنا...... یاد رکھو! اہلِ مکہ ومدینہ کے عزو شرف پر آنچ نہ آنے دینا...... مختلف بلاد سے آنے والے وفود کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا...... بدخواہوں اور چغل خوروں کو اہمیت نہ دینا۔"[1]

اس کے علاوہ سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے کچھ اپنی تجہیز و تکفین کے بارے میں وصیتیں کیں، یہ ہے آپ کا اصل وصیت نامہ۔

مگر مقامِ افسوس ہے کہ عام مصنفین نے اپنی کتب میں دوسرا وصیت نامہ لکھ دیا ہے کہ جس سے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی شخصیت مجروح ہوتی ہے۔ وہ نمونہ بھی دیکھ لیجیے:

"یزید! میں نے تمھارے لیے سارے میدان ہموار کر دیے ہیں، تمھارے خلاف مجھے صرف چار آدمیوں کا خطرہ ہے، عبدالرحمٰن بن ابی بکر، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر اور حسین بن علی۔ بس آخری دونوں کا خیال رکھنا، حسین رضی اللہ عنہ

---

[1] البداية والنهاية: 8/230.

کو لوگ تمھارے مقابلے میں لا کھڑا کریں گے، تم ان کی قرابت کا لحاظ رکھنا، لیکن اگر باز نہ آئیں تو قتل کر دینا وغیرہ وغیرہ۔"

مگر یہ وصیت نامہ ابو مخنف شیعہ کا خود تراشیدہ ہے، صحیح وہی ہے جو پہلے بیان ہو چکا ہے۔ اور بعض نے آپ رضی اللہ عنہ کا ایک اور وصیت نامہ بھی لکھا ہے، مگر اس میں بھی گڑبڑ ہے، اس میں صحیح کے ساتھ غلط کی ملاوٹ کرنے کے علاوہ چابک دستی کا مظاہرہ کیا گیا ہے، ہم وہ وصیت نامہ بھی لکھ دیتے ہیں:

"اے یزید! تم اہلِ حجاز کی عزت کرنے اور اُن کے حقوق کی حفاظت و ادائیگی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھنا۔ کیونکہ یہی لوگ دین کی جڑ اور بنیاد ہیں۔ اور عراق والے اگر ہر روز ایک امیر طلب کریں۔ تو ان کا مطالبہ پورا کرنا اور اہلِ شام کے ساتھ محبت اور عمدہ سلوک رکھنا۔ قریش میں حسین بن علی، عبداللہ بن زبیر اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم سے خبردار رہنا۔ حسین بن علی رضی اللہ عنہما کے متعلق میرا خیال ہے کہ عراقی لوگ اُن کو خروج پر اکسائیں گے۔ اگر ایسا ہوا اور تم حسین پر غلبہ پاؤ تو عفوو درگذر سے کام لینا کیونکہ وہ قرابت دار بھی ہیں اور ان کا حق بھی بہت ہے۔ عبداللہ بن عمر کو تو عبادت سے فرصت نہیں ہے وہ شاید تمھارے خلاف نہ اُٹھیں۔ لیکن عبداللہ بن زبیر سے ہوشیار رہنا۔ اگر وہ بغاوت کریں تو قتل کر ڈالنا اگر صلح کر لیں تو مصالحت کر لینا اور جہاں تک ممکن ہو مسلمانوں کو خونریزی سے محفوظ رکھنا۔"[1] اور "تاریخ طبری" میں ہے کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کو چالاک لومڑی سے تشبیہ دی۔

ہمارے مقررین اور مضمون نگاروں کو ایسی محل نظر اور غیر معیاری باتوں کے بیان سے، خصوصاً جن سے صحابہ یا اہلبیت رضی اللہ عنہم کی پوزیشن مجروح اور شخصیت داغدار ہوتی ہو،

[1] البداية والنهاية: 8/118-119.

مکمل پرہیز کرنا چاہیے۔

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا انتقال

وصیت کرنے کے بعد امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے 22 رجب 60ھ میں وفات پائی۔[1]

جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے ان کی رحلت کی خبر سنی تو دونوں ہاتھ اُٹھا کر مغفرت کی دعا کی اور فرمایا:

''اللہ تعالیٰ اُن پر رحمت کرے وہ بڑے بلند مرتبہ آدمی تھے اور بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔''[2]

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی مندرجہ بالا وصیت پڑھنے سے واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے یزید کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہر طرح کی اذیت دہی اور بے حرمتی سے ہر قسم کی سختی سے باز رہنے اور ان پر کسی حالت میں ہاتھ نہ اٹھانے کی تاکید کی تھی۔

اس بات کی مسلم، غیر مسلم سب شہادت دیتے ہیں کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بہترین مدبّر اور ممتاز سیاستدان تھے۔ ملکی حالات پر خوب نظر رکھتے تھے۔ اپنی سیاسی تجربہ کاری اور بصیرت الٰہی سے انھوں نے معلوم کر لیا کہ حسین رضی اللہ عنہ لوگوں کے ورغلانے اور بھڑکانے سے حکومتِ یزید کے مقابلے میں اُٹھیں گے۔ مگر انھوں نے یزید

---

[1] یہ 22 رجب وہی تاریخ ہے کہ جس میں لکھنو کے اہل تشیع نے امام جعفر صادق رحمہ اللہ کے نام کے کونڈے بھرنے شروع کیے۔ اور صحابی رسول حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کی خوشی میں لوگوں سے چھپ چھپ کر حلوہ پوری بانٹنے لگے۔ جن کی دیکھا دیکھی ہمارے سیدھے سادھے سنی بھی کونڈے بھرنے لگے...... حالانکہ 22 رجب کا حضرت امام جعفر صادق رحمہ اللہ کے ساتھ سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ یہ دن تو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا یومِ وفات ہے۔ اہل سنت کو ہوش کے ناخن لینے چاہئیں۔ اور اس دن کونڈے بھر کر ''صحابہ دشمن تحریک'' میں حصہ نہیں لینا چاہیے۔ علمائے حق کو کھانوں پر گرنے کے بجائے ایمانی جرأت سے کام لے کر کلمہ حق بلند کرتے رہنا چاہیے۔ یہی ان کے شایان شان ہے۔ اللہ توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین [2] البداية والنهاية، مختصراً: 143/8.

کو تنبیہ کی کہ اگر وہ ایسا کریں تو تم بہر صورت درگزر سے کام لینا کیونکہ وہ ہمارے قرابت دار اور رسول اللہ ﷺ کے نواسے ہیں......۔لہٰذا جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے متعلق یزید سے کہا تھا کہ جب بھی موقع ملے انھیں قتل کر دینا......۔ وہ لوگ دراصل تاریخی حقائق سے بے خبر ہیں اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر بہتان لگاتے ہیں اور غالباً ان عظیم ہستیوں کو اپنے موجودہ لوگوں جیسا سمجھتے ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بہت سے لوگ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں شیعی پروپیگنڈے کا شکار ہیں اور اپنا ذہن صاف نہیں رکھتے۔ کچھ لوگ تعصب کے دام میں گرفتار ہیں، کچھ لوگ تاریخی حقائق پر صحیح نظر نہیں رکھتے اور محض لکیر کے فقیر ہیں، کچھ دوست مقام صحابیت سے نا آشنا ہیں اور انھیں مطلق یہ معلوم نہیں کہ قرآن و حدیث نے اصحابِ رسول ﷺ کا کیا مقام بتایا ہے۔[1] اور بعض کو آل ابی سفیان رضی اللہ عنہ کے خلاف ذہن رکھنے کی بدولت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ میں سرے سے کوئی خوبی نظر ہی نہیں آتی۔ خوبیاں بھی عیب دکھائی دیتے ہیں، کیونکہ جہاں نفرت اور سوئے ظن کو دخل ہو وہاں بھلا کوئی خوبی کیسے نظر آ سکتی ہے؟

قارئین! اس میں کوئی شک نہیں ہونا چاہیے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے محبوب صحابی تھے، اور قرآن حکیم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کی جو شان بتلائی ہے، یقیناً امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بھی اس کے مستحق ہیں، حضورِ اکرم ﷺ نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی نہ صرف عظمت بیان فرمائی بلکہ آپ رضی اللہ عنہ کے لیے دعا بھی فرمائی، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

«اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ هَادِيًا مَّهْدِيًّا وَّاهْدِ بِهِ»

---

[1] اس سلسلے میں ''مناقب صحابہ و اہلبیت رضی اللہ عنہم'' پر ہماری منفرد و ممتاز نئی کتاب منظر عام پر آنے والی ہے۔ اس پر کام ہو رہا ہے جس کا اسلوب الگ اور انداز بیان منفرد ہوگا۔ یہ کتاب بفضلہ الکریم قرآن و حدیث اور تاریخ اسلام کے عجیب دلائل اور دلکش نکات پر مشتمل مطالعہ کے لائق ہوگی۔

”اے اللہ! معاویہ رضی اللہ عنہ کو راہ نمائی کرنے والا اور ہدایت پانے والا بنا اور اس کے ذریعے لوگوں کو ہدایت کی توفیق عطا فرما۔“[1]

دوسری جگہ فرمایا:

«اَللّٰهُمَّ عَلِّمْهُ الْكِتَابَ وَمَكِّنْ لَّهُ فِي الْبِلَادِ وَوَقِهِ الْعَذَابَ»

”اے اللہ! معاویہ رضی اللہ عنہ کو کتاب اللہ کا علم عطا فرما اور انھیں دیار و امصار میں شوکت وقوت عنایت فرما اور عذاب سے محفوظ فرما۔“[2]

حضرت حسن رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان نقل کرتے ہیں:

«لَاتَذْهَبُ الْأَيَّامُ وَاللَّيَالِي حَتّٰى يَمْلِكَ مُعَاوِيَةُ»

”ایام ہائے لیل ونہار کی گردش اس وقت تک ختم نہ ہوگی جب تک معاویہ رضی اللہ عنہ خلیفہ نہ ہو جائیں۔“[3]

صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمہم اللہ کی نگاہ میں بھی امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا ممتاز مقام تھا۔ اور کیوں ممتاز نہ ہوتا، جبکہ خود سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی شان ومنقبت بیان فرما کر لوگوں کو ان کے ادب واحترام پر توجہ دلائی۔ اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرح ان کی محبت و تعظیم کو بھی سب کے لیے فرض و واجب قرار دیا۔ یہی وجہ ہے کہ جس کی بنا پر جملہ صحابہ رضی اللہ عنہم حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو بڑا مقام دیتے تھے۔

ایک مرتبہ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے سامنے کسی نے معاویہ رضی اللہ عنہ کی عیب جوئی کی تو آپ نے فرمایا:

”قریش کے اُس جوان کی بُرائی مت بیان کرو جو غصے کے وقت ہنستا ہے، اور

① جامع الترمذي، المناقب، باب مناقب معاوية بن أبي سفيان رضى الله عنه، حديث: 3842. ② المعجم الكبير للطبراني: 439/19، حديث: 1066، وتهذيب تاريخ دمشق: 7/25، وابن عدي في الكامل: 1810/5، البداية والنهاية: 1218. ③ البداية: 131/8.

جو کچھ اس کے پاس ہے بغیر اس کی رضا مندی کے حاصل نہیں کیا جا سکتا، یعنی ان سے بزور بازو کچھ نہیں لیا جا سکتا، اور اس کے سر پر پڑی چیز کو حاصل کرنا چاہو تو اس کے قدموں میں جھکنا پڑتا ہے۔''[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

«أَيُّهَا النَّاسُ لَاتَكْرَهُوا أَمَارَةَ مُعَاوِيَةَ فَإِنَّكُم لَو فَقَدْتُمُوهُ رَأَيْتُم الرُّءُوسَ تَنْدُرُ عَن كَوَاهِلِهَا كَأَنَّمَا الحَنْظَلُ»

''اے لوگو! تم معاویہ رضی اللہ عنہ کی امارت وحکومت کو ناپسند نہ کرو، کیونکہ اگر تم نے انھیں گم کر دیا تو تم دیکھو گے کہ سر اپنے کندھوں سے یوں کٹ کٹ کر گریں گے جیسے حنظل پھل اپنے پودے سے ٹوٹ کر الگ ہو جاتا ہے۔''[2]

یعنی ان کی عدم موجودگی میں عام قتل وغارت شروع ہو جائے گی۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے: ''میں نے معاویہ رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر سلطنت اور حکومت کے لائق کسی کو نہ پایا۔''[3]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب حمص کی گورنری سے عمیر بن سعد رضی اللہ عنہ کو معزول کر کے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو متعین کیا تو کچھ لوگوں نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں باتیں کیں، عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں ڈانٹا اور فرمایا:

«لَا تَذْكُرَا مُعَاوِيَةَ إِلَّا بِخَيرٍ فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ: اللّٰهُمَّ اهْدِبِهِ»

''معاویہ رضی اللہ عنہ کا جب بھی ذکر کرو اچھا ذکر کرو۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے

---

[1] الاستیعاب 3/377، مطبوعہ مصر۔ [2] البداية والنهاية: 8/131، ونهج البلاغة: 3/836.
[3] البداية والنهاية: 8/135، والكامل لابن الأثير: 5/4.

سنا، آپ ﷺ فرماتے تھے: "اے اللہ! اسے لوگوں کی ہدایت کا ذریعہ بنا۔"[1]

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا ارشاد ہے: "میں نے معاویہ رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر سیاست و قیادت کے لائق کسی کو نہیں پایا۔"[2]

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

«مَارَأَيْتُ أَحَدًا بَعدَ عُثمَانَ أَقضٰى مِن صَاحِبِ هٰذَا الْبَابِ يَعْنِي مُعَاوِيَةَ»

"میں نے عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد کسی کو معاویہ رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر حق کا فیصلہ کرنے والا نہیں پایا۔"[3]

قبیصہ بن جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«مَارَأَيْتُ أَحَدًا أَعْظَمَ حِلْمًا......»

"میں نے کوئی آدمی ایسا نہیں دیکھا جو معاویہ رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر بردبار، سیاست کے لائق، باوقار، نرم دل اور نیکی میں ان سے زیادہ ہو۔"[4]

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے تقویٰ اور عدل سے کون واقف نہیں، تاریخ شاہد ہے کہ آپ نے اپنے دورِ خلافت میں کبھی کسی کو کوڑوں کی سزا نہیں دی مگر ایک شخص کو آپ نے کوڑوں کی سزا دی، کیونکہ اس نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے متعلق زبان درازی کی تھی۔[5]

حضرت عبداللہ بن المبارک رحمہ اللہ سے کسی نے پوچھا کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ افضل ہیں یا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ؟ آپ کا چہرہ سُرخ ہوگیا، اور فرمایا:

---

① جامع الترمذي، المناقب، باب مناقب معاوية بن أبي سفيان: 3843. ② البداية والنهاية: 135/8. ③ البداية والنهاية: 133/8. ④ البداية والنهاية: 135/8، وتاريخ الخلفاء، ص: 149. ⑤ الاستيعاب: 383/3.

«وَاللّٰهِ، إِنَّ الْغُبَارَ الَّذِي دَخَلَ فِي أَنْفِ فَرَسِ مُعَاوِيَةَ مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ أَفْضَلُ مِنْ عُمَرَ وَأَلْفَ مَرَّةٍ»

''اللہ کی قسم! امیر معاویہ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے ہمراہ جہاد میں شریک ہوتے رہے عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ تو اس غبار کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتے جو ان کے گھوڑے کی ناک میں پڑا۔ اور وہ ان سے ہزار بار افضل ہے۔''[1]

آپ کا مطلب یہ تھا کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ صحابی رسول ﷺ ہونے کی وجہ سے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ سے بہت بلند مرتبہ ہیں۔

احنف بن قیس رضی اللہ عنہ حلم و بردباری میں بہت مشہور تھے، کسی نے ان سے پوچھا کہ آپ زیادہ حلیم و بردبار ہیں یا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ؟ آپ نے فرمایا:

''تم سے بڑا نادان کوئی نہیں دیکھا، معاویہ رضی اللہ عنہ قدرت رکھتے ہوئے بردبار تھے اور میں قدرت نہ رکھتے ہوئے بُردبار ہوں۔ میں ان سے کیسے بڑھ سکتا ہوں؟''

مشاہیر اسلام کی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں جو رائے تھی اس کی چند جھلکیاں آپ نے ملاحظہ کیں۔ علاوہ ازیں یہ بھی پیش نظر رکھیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حضورِ اکرم ﷺ کے محبوب صحابی اور قریبی رشتہ دار، یعنی ام المومنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے حقیقی بھائی تھے، گویا اس اعتبار سے آپ خال المسلمین (مسلمانوں کے ماموں) تھے اور آپ آنحضرت ﷺ کے نسبی رشتہ دار بھی تھے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کے چوتھے دادا عبد مناف سے نسب میں مل جاتے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ آپ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ممتاز مقام رکھتے تھے، اعلیٰ اخلاق و عادات کے مالک تھے، بڑے حلیم و کریم اور ذکی و فہیم تھے، کمال درجے کے نبّاض و سیاس تھے، غرض جملہ اکابرینِ امت آپ کو بے حد عزت و وقار کی نگاہ سے دیکھتے اور

[1] البداية والنهاية: 8/139، وبُستان المحدّثين، ص: 45.

انتہائی اونچا مقام دیتے تھے۔

ہاں، اس بات سے انکار نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا آپ رضی اللہ عنہ سے سیاسی محاذ پر اختلاف رہا، لیکن بڑے لوگوں کے مابین نظریے، سوچ، فکر، سیاست اور ترجیحات وغیرہ میں اختلاف رونما ہوجانا کوئی انہونی اور ناممکن بات نہیں۔ بالخصوص جہاں طرفین عالی دماغ ہوں، عموماً اختلاف ہوجاتا ہے۔ اس قاعدے کے مطابق ان عظیم ہستیوں میں اختلاف واقع ہوا۔ جسے اشتعال پسند لوگوں نے ہوا دی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دونوں بزرگ اپنی اپنی جگہ مخلص تھے اور صحیح نیت رکھتے تھے، یہ اختلاف پیش آمدہ مسئلہ میں فکر اور سوچ کا اختلاف تھا۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا مؤقف تھا پہلے قاتلینِ عثمان رضی اللہ عنہ کو کیفرِ کردار تک پہنچائیں، پھر حکومت چلائیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خیال تھا کہ پہلے میری حکومت قدم جمالے، پھر میں قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص لوں گا، بزرگوں کا اپنا اپنا مؤقف تھا، جو اپنی اپنی جگہ صحیح تھا۔ اور اس پر وہ برابر قائم رہے، ان کی نیت میں کوئی فرق نہ تھا۔ بہر حال ہم تو یہی کہیں گے کہ یہ ان کا اپنا اپنا اجتہاد تھا۔ اور ان کے اس اختلاف کو اجتہادی اور فکری اختلاف کہا جائے گا، باہم کافی فرق ہونے کا باوجود دونوں فقیہ تھے، دونوں بڑے عالم تھے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ مخلص تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ مقابلۃً حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مقام ومرتبہ اور علم وفقہ میں پایہ بہت بلند تھا۔

بہر کیف ہمیں دونوں عظیم ہستیوں میں باہم فرق ہونے کے باوصف ان کا ایک سا احترام ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے۔ کسی کے بارے میں ہرگز دل میں میل یا ملال رکھنا روا نہیں۔ اور یہ سمجھنا چاہیے کہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ ہماری دائیں آنکھ ہیں تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ہماری بائیں آنکھ ہیں، اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ ہماری آنکھوں کا تارا ہیں، تو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ ہمارے جسم کی راحت ہیں، دونوں بزرگ قوم کی آبرو، ملت کا سرمایہ اور دین کی عظمت وشان ہیں۔ دونوں کا احترام بجالانا ہمارا دینی ومذہبی فریضہ ہی نہیں

بلکہ ہمارا قومی اور ملّی فریضہ بھی ہے۔ اس طرح نہ صرف ہمارے درمیان خلیجِ تفرقہ کی وسعتیں کم ہوں گی بلکہ ہمارے چمنستان خزاں رسیدہ میں بھی بہار آئے گی۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بارے میں جو نظریات اور جذبات و تأثرات ہیں انھیں اگر آپ ملاحظہ کرنا چاہیں، تو البدایہ والنہایہ: 127/8، مطبوعہ مصر اور جمع الفوائد، صفحہ:843 وغیرہ کا مطالعہ فرمائیں۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے اسی فضل و کمال کو دیکھ کر حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے آپ سے صلح کر لی تھی، ایک شخص نے اس صلح پر ناروا تنقید کی، حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا: (جسے یاددہانی کے لیے پھر عرض کرتے ہیں، حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی عظمت کے اگر ہم واقعی قائل ہیں تو ان کا یہ ارشاد مبارک بھی قابل توجہ ولحاظ ہونا چاہیے:)

«لَا تَقُلْ ذَاكَ فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ: لَاتَذْهَبِ الْأَيَّامُ وَاللَّيَالِي حَتّٰى يَمْلِكَ مُعَاوِيَةُ»

''ایسی بات نہ کر، کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ کہتے سُنا کہ گردشِ لیل ونہار اس وقت تک ختم نہ ہوگی جب تک معاویہ رضی اللہ عنہ امیر نہ بن جائیں گے۔''[1]

یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے تختِ خلافت، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے حوالے کر دیا۔ ازاں بعد ان کی بیعت بھی کی اور انھیں خلیفہ برحق بھی تسلیم کیا، اور اس طرح آنحضرت ﷺ کی وہ پیشین گوئی پوری ہوئی:

''میرا یہ بیٹا (حضرت حسن رضی اللہ عنہ) مسلمانوں کے دو گروہوں کے مابین صلح کرائے گا۔''[2]

یہ ارشاد بخاری شریف میں بھی ہے اور اسے مُلا باقر مجلسی کی کتاب ''جلاء العیون'' میں بھی نقل کیا گیا ہے، اور مقام غور ہے اگر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ باصلاحیت اور

---

① البداية والنهاية: 131/8. ② صحيح البخاري، فضائل أصحاب النبي ﷺ، باب مناقب الحسن والحسين رضي الله عنهما، حديث: 3646.

باکردار نہ ہوتے تو بھلا حضرت حسن رضی اللہ عنہ جیسا نیک خصائل، صاحبِ بصیرت اور دلیرو جَری اور ممتاز بزرگ آپ کو خلافت و امارت سونپ سکتا تھا؟ کیا حضرت حسن رضی اللہ عنہ نعوذ باللہ غلط کار تھے؟ اہل تشیع تو انھیں معصوم، پاک، یعنی غلطیوں سے محفوظ و مامون اور ''پنجتن'' میں سے ایک فرد شمار کرتے ہیں۔ انھیں تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے فیصلے پر سر تسلیم و رضا خم کر لینا چاہیے۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے فضائل ومحاسن کے سلسلے میں متعدد احادیث، اقوال اور واقعات موجود ہیں، جو بیان کیے جاسکتے ہیں، مگر ہمارا مقصد ان اقوال و واقعات کا استقصاء واحاطہ نہیں بلکہ ہمارا مقصود اپنے ان بھولے بھٹکے احباب کے قلوب واذہان کو صاف کرنا ہے، جو مخالفین و معاندین صحابہ رضی اللہ عنہم کے ناروا پروپیگنڈے سے متأثر ہو کر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں عداوت ونفرت کے قبیح اور جلے کٹے جذبات رکھتے ہیں۔ اور اس رو میں بڑے بڑے ''دانا و بینا'' بہتے ہوئے نظر آتے ہیں جس کا دکھ ہے۔ لیکن ہمیں جملہ صحابہ واہل بیت رضی اللہ عنہم کا حد درجہ احترام بجا لانا چاہیے۔ اور ان کے ساتھ پوری عقیدت رکھنی چاہیے۔ ہماری اسی میں خیر ہے، ورنہ بھاری خسارہ ہے۔ مفتی احمد یار خان صاحب گجراتی بریلویہ کے مشہور بزرگ، اعلیٰ حضرت فاضل بریلی کے براہِ راست فیض یافتہ اور شہرۂ آفاق عالم ومفسّر حضرت مولانا سیّد نعیم الدین بریلوی مراد آبادی کے مایۂ ناز شاگرد ہیں، اپنی لاجواب کتاب ''امیر معاویہ رضی اللہ عنہ'' میں کیا خوب تحریر فرماتے ہیں۔ ہم عام برادران اہلسنت کے استفادہ کے لیے وہ پیش کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم آئینہ خدا نما ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب رضی اللہ عنہم آئینہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نما، خدا کو پہچاننا ہے تو حضور کو جانو اور مانو۔ اور حضور کو جاننا اور ماننا ہے تو ان کے انصار ومہاجرین رضی اللہ عنہم کو مانو۔ یہ بھی خیال رہے کہ نبیوں میں سے ایک نبی

یا پیغمبر کا انکار سارے پیغمبروں کا انکار ہے......۔ اسی طرح ایک صحابی کا انکار، اہل بیت اطہار میں سے کسی ایک بزرگ سے سرتابی در پردہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور سارے اہل بیت رضی اللہ عنہم کا انکار ہے۔"

"آج مشاہدہ ہو رہا ہے کہ جس دل میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے عداوت پیدا ہوئی تو اس کا انجام یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ اس میں اہل بیت اطہار رضی اللہ عنہم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تمام ہی کی نفرت پیدا ہوگئی۔ اور سب پر زبان طعنہ دراز کرنے لگے۔ اس پر زمانہ ماضی و حال شاہد عدل ہے۔"

✽ "خوارج: یہ لوگ سیدنا علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ کے لشکر کے سپاہی اور آپ کے جاں نثار تھے۔ آپ پر جان و مال قربان کرتے تھے۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح فرمائی تو بعض لوگ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے عناد کے جوش میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے متنفر ہو گئے۔

✽ روافض: یہ مدعیان محبتِ اہل بیت بھی بُغض امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیماری میں گرفتار ہیں۔ اور اس بیماری کا نتیجہ یہ ہے کہ ان میں سے اکثر حضرات اہل بیت اطہار سے در پردہ متنفر ہیں......۔ فی زمانہ بہت سے سنّی کہلانے والے بزرگ بغض معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیماری میں گرفتار ہیں۔ اہل دل حضرات اس حالت پر خون کے آنسو روتے ہیں۔ اس رسالہ (یعنی امیر معاویہ رضی اللہ عنہ) میں ان سنّی حضرات سے خطاب ہے جو کچھ غلط فہمیوں کی بنا پر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے بد دل ہیں اور ان کی عظمت کے انکاری ہیں۔"[1]

(اللہ کرے ہمارے سنی بریلوی احباب اور کچھ نہیں تو اپنے حکیم الامت حضرت مفتی صاحب کی حکمت بھری باتیں ہی سمجھ لیں۔ مصنف)

---

[1] کتاب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ، ص: 6-7،11۔

یزید اور اس کی حکومت

یزید کے بارے میں ہم پیچھے لکھ چکے ہیں کہ شروع ہی سے اس کے خلاف زبردست اور منظّم پروپیگنڈہ کیا گیا اور یہ باور کرایا گیا کہ یزید نا اہل اور نالائق تھا، معاملاتِ حکومت کی سُدھ بُدھ نہ رکھتا تھا، زانی تھا، شرابی تھا، جوا کھیلتا تھا، کتوں سے پیار کرتا تھا، بڑا جلد باز اور ظالم تھا، گانے بجانے کا رسیا تھا۔ اس نے بندر پال رکھے تھے، تارک صوم وصلوٰۃ تھا، کبھی جہاد پر نہ گیا تھا۔ آنے والے کو شراب پیش کرتا تھا، بڑے بڑے صحابہ رضی اللہ عنہم نے اسے شراب پیتے دیکھا۔ نوجوان عورتیں اس کی صحبت میں رہتیں۔ اس قسم کے اس کے خصائل بیان کیے گئے اور اس کی ظاہری شکل وصورت کو بھی حد درجہ بگاڑ کر پیش کیا گیا، کہ لحیم وشحیم اور ہٹا کٹا تھا، توند نکلی ہوئی تھی، چہرہ مکروہ تھا، رنگ کالا اور چہرے پر چیچک کے داغ تھے، جسم بالوں سے اٹا ہوا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

قارئین! عدل وانصاف کا تقاضا یہ ہے کہ صحیح سچی اور راہ لگتی بات کی جائے، کسی کے جوش محبت میں آ کر تعریف کے پُل نہ باندھے جائیں، اور جوشِ نفرت وعناد میں آ کر نوک زبان وقلم پر غلط بات نہ لائی جائے بلکہ ہمیشہ وہ بات کہی جائے جو مبنی بر حقیقت ہو، بیشک یہ کام بڑا مشکل ہے مگر اسی میں عظمت ہے، اور یہی قرینِ انصاف ہے۔

یہاں کوئی شخص یہ نہ سمجھ لے کہ ہم یزید کے وکیل یا مؤید ہیں۔ اور اسے صحابہ و اہلبیت رضی اللہ عنہم سے افضل مانتے ہیں۔ افضل تو بہت دور کی بات ہے ہم یزید کو ان کے کسی فرد کے ہم پلّہ بھی نہیں جانتے، ہم برملا کہتے ہیں ہزار یزید ایک طرف، اکیلے حسین رضی اللہ عنہ دوسری طرف، ہزار یزید مل کر بھی تنہا حسین ابن حیدر رضی اللہ عنہ کے ہم پلّہ تو کجا، ان کی کفِ پا کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتے۔ جو بات زیر موضوع ہے ادھر توجہ فرمائیے، ان عظیم ہستیوں کی فضیلت پر قرآن ناطق ہے، وہ سب کے سب مرحوم ومغفور ہیں، ان کی عظمت و

بزرگی کی شہادت قرآن کریم میں جا بجا ملتی ہے۔ اللہ نے اپنے کرم سے ان کی غلطیاں معاف فرما دی تھیں۔ اور وہ سب کے سب بلندی کے بہت ہی اونچے مرتبے پر فائز تھے اور فائز ہیں اور ان کی عظمت کا پرچم قیامت تک لہراتا رہے گا۔ قارئین! بات کو ذرا سمجھنے کی کوشش کریں۔ جہاں تک یزید کی ذات کا تعلق ہے یہ ان ابرار واخیار صحابہ رضی اللہ عنہم کی بہ نسبت بہت پیچھے اور عظمت میں ان سے بہت نیچے ہے۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود وہ ایسا بھی نہیں تھا جیسے ناروا پروپیگنڈے نے مشہور کر رکھا ہے کہ وہ زانی وشرابی اور فاسق اور فاجر تھا اگر وہ زانی وشرابی اور فاسق و فاجر ہوتا تو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو رہنے دیجیے ایک طرف۔ کیونکہ کوئی کہہ سکتا ہے کہ باپ کی اپنے بیٹے کے حق میں صفائی معتبر نہیں ہوتی (لیکن کسی صحابی اور اہلبیت کے کسی فرد کے بارے میں یہ مؤقف درست نہیں، اس لیے کہ وہ سب کے سب نہایت سچے اور نہایت عادل تھے اس کے باوصف یزید کے بارے میں دوسرے اعیان و اصحاب رضی اللہ عنہم کی شہادتیں اور ریمارکس بھی ملاحظہ فرمائیے کہ وہ کیا تھے۔ بیشک یزید مصؤن ہے نہ محفوظ، نہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ جیسا آئیڈیل بلکہ اسے حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے کوئی نسبت ہی نہ تھی، چہ نسبت خاک را......۔

مگر حقائق وہ بھی تو نہیں جو کتابوں میں بھر دیے گئے ہیں اور جو منابر و مجالس میں دہرائے جاتے ہیں۔ آپ اتنا تو تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے امور خلافت حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیے تھے۔ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے معتمد علیہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ موصوف دور خلافت راشدہ میں عظیم حکمران اور بہترین کنٹرولر مانے جاتے تھے۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے بیان میں آپ ان کا ذکر پڑھ چکے ہیں، اعادے کی ضرورت نہیں۔ پھر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے اجتہاد و بصیرت، ملکی حالات کو اعلیٰ طریق پر قائم رکھنے کے لیے اپنے بیٹے میں استعداد وصلاحیت دیکھتے ہوئے اسے حکومت کے لیے موزوں پایا۔

مقام غور ہے! تقویٰ و ورع اور چیز ہے مگر کنٹرولنگ پاور (Controling Power) اور چیز ہے۔ جن مسلمانوں نے بشمول صحابہ و اہل اہلبیت رضی اللہ عنہم، یزید کی بیعت کی وہ بھی انجان، ڈرپوک یا کمزور ایمان نہیں تھے۔ بلکہ انھوں نے اس دور کے حالات دیکھتے ہوئے سر اطاعت خم کیا تھا۔ انھوں نے امیر وقت یزید کی نہ صرف خود تائید وحمایت کی بلکہ دوسروں کو بھی ہچکچاہٹ سے روکتے رہے۔ اس وقت یزید کے بارے میں برے تأثرات نہیں تھے، کیونکہ یزید کی اس وقت کی سیرت و کردار اور بسالت وشجاعت سب کے سامنے تھی۔ اور یہ باتیں مستند تاریخی کتب میں موجود ہیں۔ جنہیں اربابِ تحقیق و دانش نے تسلیم کیا ہے۔ یزید کو فاسق و فاجر کہنے کا مطلب واضح الفاظ میں اس کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ یزید کے حامی و مؤید کافر نہیں تو منافق اور فاسق و فاجر ضرور تھے۔ شیعہ ذہن یہی ہے۔ اور دکھ ہے کہ بہت سے سنّی بھی اس پروپیگنڈے کا شکار ہیں۔

کوئی پانچ برس ہو رہے ہیں لاہور کے ایک ڈاکٹر مولوی محمود صاحب بریلوی نے ''امام حسین رضی اللہ عنہ اور یزید کے وکیل کتاب'' لکھ کر ہمارا مؤقف سمجھے بغیر اپنی طرف سے جواب دیا ہے۔ لیکن بعض جگہ شاید خون کا دباؤ ہونے کی وجہ سے قلم پر قابو نہیں رہا۔ موصوف اگر عالم ہیں تو انداز عالمانہ شان سے دور ہے۔ وہ کتاب ابھی ابھی ہم نے دیکھی ہے۔

اب آپ سمجھ چکے ہوں گے کہ یزید کا یہ غلط خاکہ کیوں پیش کیا گیا؟ اس کے خلاف اس زبردست اور بے جا پروپیگنڈے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ یہ محض اس لیے کہ یزید امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا فرزند تھا اور ابوسفیان رضی اللہ عنہ کا پوتا تھا اور حسین رضی اللہ عنہ اس کی بیعت سے گریز فرماتے تھے، کیونکہ آپ خود کو خلافت کا حقدار سمجھتے تھے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ (سوئے اتفاق) حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی اس کے دورِ خلافت میں شہادت واقع ہوئی تھی۔ اگر یہ باتیں نہ ہوتیں اور کم از کم شہادتِ حسین رضی اللہ عنہ اس کے عہد میں واقع نہ ہوئی ہوتی تو پھر غالباً یزید کی سیرت اور صورت میں یہ خامیاں دکھائی نہ دیتیں۔

ناراض ہونے کی بات نہیں یہ سب عناد و بغض اور منفی پروپیگنڈے کے کرشمے ہیں۔ حقیقت اور عدل وانصاف کا دامن چھوڑنے سے اکثر یوں ہوجاتا ہے۔

جن لوگوں نے کتب کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ ثمامہ بن اثال رضی اللہ عنہ نے اسلام لانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ان جذبات کا اظہار کیا: ''اسلام سے قبل میرے نزدیک محمد صلی اللہ علیہ وسلم پورے کرۂ ارضی میں سب سے بُرے اور مکروہ انسان تھے (استغفر اللّٰہ ثم استغفر اللّٰہ...... معاذ اللّٰہ) لیکن اسلام لانے کے بعد اس کی نگاہ میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پورے عالم رنگ وبُو میں سب سے اچھے اور حسین ودلبر ہوگئے ہیں۔''[1]

یہ امر واقع ہے کہ عقیدت یا نفرت کی وجہ سے غور وفکر اور سوچ و بچار کی سب قدریں بدل جاتی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ جب مسلمان ہوئے تو یہود کو علم نہیں تھا، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے دریافت کیا کہ بتاؤ، عبداللہ ابنِ سلام تم میں کیسے ہیں؟ انھوں نے کہا: ''سب سے اچھا ہے، اچھے کا بیٹا ہے۔'' مگر یہی ابنِ سلام رضی اللہ عنہ جب ان کے سامنے کلمہ پڑھتے ہوئے آئے تو سب نے کہا: ''سب سے بُرا ہے اور بُرے کا بیٹا ہے۔'' یہ سب عقیدت اور نفرت کے کرشمے ہیں، ہمیں ہر حال میں ایسی بات کرنی چاہیے، جو سچی صاف اور مبنی بر حقیقت وانصاف ہو۔

حکم قرآنی ہے: يَآأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا

''اے ایمان والو! ہمیشہ صاف اور سیدھی بات کرو۔''[2]

مزید ارشاد ہے: فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ

---

[1] صحيح البخاري، المغازي، باب وفد بني حنيفة وحديث ثمامة بن أثال، حديث: 4372، وصحيح مسلم، الجهاد والسير، باب ربط الأسير وحبسه، حديث: 1764.

[2] الأحزاب 70:33.

''پس ہمیشہ عدل سے کام لو، اگرچہ کوئی تمھارا کتنا ہی قریبی ہو۔''[1]

ان مثالوں سے ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ کسی سے نفرت یا عقیدت کی وجہ سے اس کا برا خاکہ، خلاف واقعہ اور بھونڈا نقشہ نہیں کھینچنا چاہیے اور بغض و عناد کی وجہ سے کسی کی کردار کشی کرنا عقلاء اور اصحاب دیانت کے نزدیک ہر جگہ ناروا ہے۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے بے شک ہمیں بڑی محبت اور بے حد عقیدت ہے اور ہونی چاہیے۔ آپ کا بہت اعلیٰ اور ممتاز مقام ہے، سب درست، سب صحیح، جیسا کہ ہم اسی کتاب میں باحوالہ بیان کر چکے ہیں اور یہی ہونا چاہیے مگر ہم محض اس لیے یزید کا جھوٹا خاکہ پیش کریں اور غلط نقشہ کھینچیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے یزید کی بیعت سے انکار کر دیا تھا، اور اس کے عہد میں شہید ہوئے تھے، یہ بھی تو قرینِ انصاف نہیں۔ جہاں تک آپ رضی اللہ عنہ کی عظمت وفضیلت اور درجہ و برتری کا تعلق ہے اس میں کوئی شک ہے نہ شک کی گنجائش۔ ہماری ذاتی رائے بھی بے شک یہی ہے کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ یزید سے بدرجہا بہتر و افضل تھے اور ہیں، حسین رضی اللہ عنہ کے والد یزید کے والد سے اعلیٰ، حسین رضی اللہ عنہ کی والدہ یزید کی والدہ سے بلند تر اور حسین رضی اللہ عنہ کے محترم و مکرم نانا جان صلی اللہ علیہ وسلم یزید کے نانا سے بہر پہلو اشرف و اعلیٰ اور ساری مخلوقات کے سردار تھے۔ یزید تو رہا ایک طرف، کائنات میں کسی کے نانا کو حسین رضی اللہ عنہ کے گرامی منزلت نانا جان صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی نسبت ہی نہیں، لیکن یزید اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ باپ بیٹے دونوں ایسے بھی نہیں تھے جیسا انھیں بتایا اور باور کرایا جاتا ہے۔ بلکہ مستند کتب تاریخ بتاتی ہیں کہ یزید کا خاندان بھی اچھا تھا اور اس کی صورت و سیرت بھی عمدہ تھی...... آیئے کچھ اوجھل باتیں بھی دیکھیں، پڑھیں اور تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھیں۔ علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

[1] الأنعام، 6: 152.

''یزید کی ولادت سے قبل اس کی والدہ نے خواب میں دیکھا کہ ان کی کوکھ سے چاند برآمد ہوا ہے، خواب کی تعبیر یہ بتائی گئی کہ ان کے ہاں فرزند پیدا ہوگا، جو امارت و سیاست اور اُولو العزمی میں درجۂ کمال حاصل کرے گا۔''[1]

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ اسی کتاب کے ص 145 پر یزید کی والدہ میسون رحمہا اللہ جو کہ سردار مخول بن انیف کلبی کی بیٹی تھیں، کے بارے میں لکھتے ہیں:

«وَكَانَتْ حَازِمَةً عَظِيمَةَ الشَّأْنِ جَمَالًا وَّرِيَاسَةً وَّعَقْلًا وَّ دِينًا»

''میسون رحمہا اللہ بڑی محتاط اور حسن و جمال، ریاست و سرداری، ذہانت و ذکاوت اور دین میں اعلیٰ درجہ رکھتی تھیں۔''

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما، حضرت دحیہ رضی اللہ عنہ، حضرت وائل رضی اللہ عنہ اور حضرت قطن رضی اللہ عنہ اسی قبیلہ بنی کلب سے تعلق رکھتے تھے، یہ قبیلہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی تبلیغی مساعی کی بدولت اسلام کی نعمت سے بہرہ ور ہوا تھا۔ میسون رحمہا اللہ کے قبیلے بنی کلب سے حضرت ابن عوف رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے رشتہ داریاں قائم کی تھیں۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو اپنی کلبیہ بیوی رُباب سے بہت محبت تھی، جس کا ذکر البدایہ والنہایہ 8/ 209 میں موجود ہے۔ میسون رحمہا اللہ صاحب تقویٰ خاتون تھیں، ان کے حالات میں مذکور ہے کہ وہ حلال و حرام کا بہت خیال رکھتی تھیں۔[2]

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ اسی میسون رحمہا اللہ کے نکاح اور یزید کی ولادت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

«فَتَزَوَّجَهَا مُعَاوِيَةُ فَوَلَدَتْ لَهُ يَزِيْدَ بْنَ مُعَاوِيَةَ فَجَآءَ ذَكِيًّا حَاذِقًا»

---

[1] البداية والنهاية: 8/80. [2] كتاب مذكور: 145.

''حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے میسون رحمہا اللہ سے شادی کی اور ان سے یزید پیدا ہوا، جو ذکی اور سریع الفہم تھا۔''[1]

اور یہ حوالہ بھی قبل ازاں مذکور ہو چکا ہے:

''یزید حلیم و کریم، دلاور و بہادر، صاحبِ تدبیر، خوش اخلاق اور حسین و جمیل تھا۔''[2]

حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ نے یزید کے اوصافِ حمیدہ کو دیکھ کر فرمایا تھا:

«فِدَاكَ أَبِي وَأُمِّي وَاللّٰهِ! مَا قُلْتُهَا لِأَحَدٍ قَبْلَكَ»

''میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، اللہ کی قسم! «فِدَاكَ أَبِي وَأُمِّي» کے الفاظ میں نے آپ سے قبل کسی کے لیے استعمال نہیں کیے۔''[3]

حضرت سعید بن مسیّب رحمہ اللہ یزید اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ دونوں کو خطیب اسلام کہتے تھے، الفاظ یہ ہیں:

«خُطَبَآءُ النَّاسِ فِي الْإِسْلَامِ مُعَاوِيَةُ وَابْنُهُ......»[4]

اس کی توثیق علامہ ابن ابی الحدید شیعہ نے بھی کی ہے، لکھتے ہیں:

«كَانَ يَزِيدُ بْنُ مُعَاوِيَةَ خَطِيبًا شَاعِرًا»

''یزید خطیب اور شاعر تھا۔''[5]

ظاہر ہے خطابت کے لیے علم کے ساتھ جوش و جذبہ اور شاعری کے لیے ادب میں مہارت کی ضرورت ہے۔ اور یہ وہ بات ہے کہ جس کا شیعہ عالم بھی اقرار کر رہا ہے۔ گویا یزید میں دونوں خوبیاں تھیں۔

یزید کے جو اشعار ہم نے دیکھے ہیں ان میں جوش، اعتدال، ادب اور فصاحت

---

① البداية والنهاية: 80/8. ② البداية والنهاية: 230/8. ③ أنساب الأشراف بلاذري: 3/4.
④ البداية والنهاية: 311/8. ⑤ شرح ابن أبي الحديد: 824/2.

بدرجہ اتم موجود ہے، کوئی شعر لفظاً و معناً معیار سے فروتر نہیں ہے۔

اہل اسلام یزید کے سریر آرائے خلافت ہونے سے قبل بھی اسے عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

یزید نے تین مرتبہ لوگوں کو حج کرایا اور امیر حج کے فرائض بھی انجام دیئے اور عرب میں یہ منصب اہم شخصیت ہی کو دیا جاتا تھا، چنانچہ امام ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

«حَجَّ بِالنَّاسِ يَزِيْدُ بْنُ مُعَاوِيَةَ فِيْ سَنَةٍ......»

''یزید نے لوگوں کو 51ھ، 52ھ اور 53ھ میں حج کرایا۔''[1]

یزید کے محاسن کے بارے میں اور بھی اقوال ہیں جن کا اپنے وقت پر ذکر آئے گا۔

جن کتب میں یزید کے معائب و مثالب کا ذکر ہے، انھوں نے سنی سنائی باتیں نقل کی ہیں، تحقیق سے کام نہیں لیا۔ حضرت علامہ ملا علی قاری حنفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اور یزید، ولید، اور مروان کی مذمت میں جھوٹی اور وضعی (گھڑی ہوئی) روایات ہیں۔''[2]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ابن عساکر نے یزید کی مذمت میں جس قدر روایات بیان کی ہیں:

«كُلُّهَا مَوْضُوعَةٌ لَا يَصِحُّ شَيْءٌ مِنْهَا»

''وہ سب خود تراشیدہ ہیں، ان میں ایک بھی درست نہیں۔''[3]

امام غزالی رحمہ اللہ کی علمی جلالت سے کون آشنا نہیں آپ تو یہاں تک فرماتے ہیں:

«أَمَّا التَّرَحُّمُ عَلَيْهِ فَجَائِزٌ بَلْ هُوَ مُسْتَحَبٌّ......»

''یزید کے لیے رحمہ اللہ کہنا جائز بلکہ مستحب ہے۔ اور یزید تو ہماری ہر نماز کی دعا:

[1] البداية والنهاية: 229/8. [2] موضوعات كبير، ص: 106. [3] البداية والنهاية: 231/8.

«اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِلْمُؤْمِنِیْنَ» میں داخل ہے، «فَاِنَّہٗ کَانَ مُؤْمِنًا» کیونکہ وہ مؤمن تھا۔"

یہ حوالہ البدایہ والنہایہ میں درج ہے۔ اور ساتھ یہ الفاظ بھی ہیں:

«وَمَنَعَ مِنْ شَتْمِہٖ وَلَعْنِہٖ لِاَنَّہٗ مُسْلِمٌ وَلَمْ یَثْبُتْ بِاَنَّہٗ رَضِیَ بِقَتْلِ حُسَیْنٍ»

"امام غزالی رحمہ اللہ نے یزید پر سبّ وتبرّا کرنے سے منع کیا ہے کیونکہ وہ مسلمان تھا اور یہ ثابت نہیں کہ وہ حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت سے راضی تھا۔"[1]

یزید کے بارے میں یہ جو عوام بلکہ کثیر خواص کی زبان پر "فاسق و فاجر" کے الفاظ ہیں، یہ الفاظ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے بھی باوجود یزید سے اختلاف رکھنے کے استعمال نہ کیے۔ صحیح بات یہ ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو یزید کی بیعت سے اس لیے انکار تھا کہ وہ خلافت کے لیے باپ کی بیٹے کے حق میں نامزدگی کو درست نہ جانتے تھے، علاوہ ازیں آپ رضی اللہ عنہ خلافت کے لیے خود کو یزید سے زیادہ حقدار سمجھتے تھے۔ آپ کا خیال تھا کہ افضل کے ہوتے ہوئے مفضول یعنی غیر افضل خلیفہ اور امیر نہیں بن سکتا اور حالات سے لگتا ہے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا ارادہ خود اسلامی قلمرو سنبھالنے کا تھا اور ان کے ذہن میں جو خاکہ تھا اسے نافذ کرنا چاہتے تھے۔ وہ بہ نسبت یزید کے اپنے آپ کو حکومت و امارت کا زیادہ اہل، موزوں اور حقدار جانتے تھے۔ اور حقیقت بھی یہی تھی۔ اور آپ یہ بھی سمجھتے تھے کہ خلافت ہمارے ہی خاندان میں دائر و مرکوز رہنی چاہیے۔ اس بارے میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے صریح الفاظ بیشک نہ ملتے ہوں مگر آپ کی جملہ مساعی و تدابیر اس پر دلالت کرتی ہیں۔ اور یہ بھی آپ کی فکر اور اجتہاد تھا۔ اور اجتہاد میں خطا وصواب

[1] ابن خلکان: 449/2.

دونوں کا احتمال ہوتا ہے۔ اجتہاد میں غلطی کے وقوع کا کسی صاحب علم کو انکار نہیں۔ نہ اس میں مجتہد کی کوئی اہانت ہے۔ آپ نے یزید کو فاسق، فاجر، بے دین، زانی اور شرابی...... وغیرہ کبھی نہیں سمجھا، نہ کہا۔ اس سلسلے میں کوئی معتبر حوالہ پیش نہیں کیا جاسکتا۔ اگر کسی کے پاس کوئی مستند اور ٹھوس حوالہ ہو تو پیش کرے، ہم شکریے کے ساتھ قبول کریں گے۔ اور یہ بات بھی محقق اور ثابت شدہ ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے جہاد قسطنطنیہ میں یزید کے زیر کمان شرکت فرمائی تھی، ملاحظہ ہو، البدایہ والنہایہ ج 8/ 150، 151، جیسا کہ آپ پہلے پڑھ چکے ہیں۔

علاوہ ازیں حضرت حسین رضی اللہ عنہ جب دشتِ کربلا میں محصور ہو گئے تو آپ نے فرمایا تھا کہ مجھے یزید کے پاس جانے دو، میں خود اس کی بیعت کروں گا، آپ کے الفاظ مبارک یہ ہیں:

«فَأَضَعُ یَدِی فِي یَدِہٖ»

''میں یزید کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دوں گا۔''[1]

اگر کسی دوست کو الفاظ کی صحت میں شبہ ہو تو کتابیں دیکھ لے۔ اور اگر ہمارے ترجمہ میں شک ہو تو خود ترجمہ کر لے۔

تلخیص الشافی شیعہ احباب کی معتبر کتاب ہے، مطلب یہ کہ شیعہ سُنی دونوں کی کتب میں یہ حوالہ موجود ہے۔ اس لیے خواہ مخواہ کسی دوست کو پیش کردہ بات کا انکار نہیں کرنا چاہیے۔ مگر یہ کہتے جانا ''میں نہیں مانتا'' اس کا تو کوئی علاج نہیں۔

اس طرح کے حوالہ جات پیش کرنے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی یزید کو فاسق و فاجر نہیں جانتے تھے، کیونکہ ان کے نزدیک اگر یزید ایسا ویسا ہوتا جیسا کہ باور کرایا جاتا ہے، تو آپ ہرگز اس کے زیرِ کمان جہاد پر نہ نکلتے۔ اور پھر جب

---

[1] ابن خلدون: 2/104، وتلخیص الشافي أبوجعفر طوسي، ص:471.

سفر کوفہ میں محصور ہو گئے تھے تو یہ کبھی نہ کہتے کہ ”مجھے یزید کے پاس جانے دو، میں خود مسئلہ طے کر لوں گا اور یزید کی بیعت کروں گا۔“ بلکہ اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ یزید کو مومن سمجھتے تھے۔ ورنہ فاسق، فاجر، زانی، شرابی اور کافر کی بیعت چہ معنی دارد؟ اور یزید کی خلافت سے جو آپ کو اختلاف تھا، وہ از قبیل اجتہاد تھا جس کی وضاحت ہم کر چکے ہیں۔ نبی کے علاوہ ہر ایک کی ذاتی سوچ وفکر اور اجتہاد میں دونوں احتمال پائے جاتے ہیں اور یہ کوئی انوکھی اور نئی بات نہیں بلکہ یہ دور نبوی سے ہوتا آیا ہے۔ اس سے کسی بزرگ کی شان میں کوئی تنقیص (کمی) واقع ہوتی ہے نہ حرف آتا ہے۔ شیعہ سنی دونوں کی کتب فقہ میں ایسے محتمل اقوال کی کثیر مثالیں موجود ہیں۔

سیدنا حضرت زین العابدین رحمہ اللہ کے یہ الفاظ بھی یزید کی پوزیشن کو واضح کرتے ہیں:

«وَصَلَّى اللّٰهُ أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ وَ أَحْسَنَ جَزَاءَهُ»

”اللہ امیر المومنین (یزید) پر رحمت بھیجے اور انھیں نیک جزا عطا فرمائے۔“[1]

کہیے حضرت زین العابدین رحمہ اللہ جیسا عظیم، اورع واتقی واعبد الناس شخص کسی شرابی وزانی کے بارے میں یہ الفاظ استعمال کر سکتا ہے؟

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے انتقال کے بعد یزید نے تختِ خلافت پر متمکن ہوتے ہی ایک خطبہ دیا، یہ خطبہ یزید کی شخصیت اور عوام کے تأثرات کو واضح کرتا ہے، خطبہ یہ ہے:

«اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي مَاشَاءَ صَنَعَ، مَنْ شَاءَ أَعْطَىٰ وَمَنْ شَاءَ مَنَعَ......»

”تمام تعریف اللہ ہی کے لیے ہے، وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے، جس کو جو چاہتا ہے دیتا ہے جس سے چاہتا ہے روک لیتا ہے۔ وہ جس کو چاہے ذلیل کرے،

---

[1] طبقات ابن سعد اردو: 220/5 وبلاذری: 39/4، الإمامة والسياسة، ص: 218.

جس کو چاہے سر بلند کرے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ اللہ کی ایک رسی تھے، اللہ نے جب تک چاہا اسے دراز رکھا اور جب چاہا اسے قطع کر دیا۔ آپ اَسلاف سے کمتر اور اَخلاف سے بہتر تھے، میں اللہ کی بارگاہ میں ان کی صفائی نہیں کر رہا، وہ تو اپنے رب کے پاس چلے گئے، وہ انھیں معاف کرے تو اس کی مہربانی ہے اور اگر مؤاخذہ کرے تو کوتاہیوں کا بدلہ ہے۔ ان کے بعد مجھے امورِ خلافت کا ذمہ دار بنایا گیا ہے۔ میں جہل سے عذر نہیں کرتا اور علم کی طلب سے مایوس نہیں۔ آپ لوگ سنبھل کر رہیں، اللہ جسے ناپسند جانتا ہے اسے بدل دیتا ہے، اور جس چیز کو پسند کرتا ہے اسے آسان بنا دیتا ہے۔''[1]

لوگ جب یہ خطبہ سن کر واپس ہوئے تو بمطابق امام ابنِ کثیر رحمہ اللہ: «وَهُمْ لَا يُفَضِّلُونَ عَلَيْهِ أَحَدًا» ''لوگ (امیرِ وقت یزید کے خطاب سے) اس قدر متأثر ہوئے کہ وہ اس پر کسی اور کو ترجیح نہ دیتے تھے۔''[2]

یہ ترجیح نظمِ حکومت کے سلسلے میں تھی نہ کہ علی الاطلاق ترجیح تھی۔ مطلب یہ کہ ان کے خیال میں یزید امارت و خلافت کے لیے موزوں ترین آدمی تھا اس سے زیادہ موزوں اور کوئی نہیں تھا۔ اس وقت اگرچہ تقویٰ و طہارت اور خشیت و انابت میں اور بھی بڑی بڑی شخصیتیں شہرہ رکھتی تھیں لیکن نظمِ حکومت چلانے اور اس وقت کے ابتر حالات کو بہتر بنانے اور شورشوں کو دبانے کے لیے تقویٰ کے ساتھ ساتھ کسی پاورفل کنٹرولر کی ضرورت تھی جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں، بس اس لیے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے یزید کا نام پیش کیا اور تقریباً بہت بھاری اکثریت نے اُسے قبول کیا۔

یزید میں کوئی شرعی عیب اور نقص بھی نہیں تھا جیسا کہ بادلائل آپ پڑھ چکے ہیں، اور وہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ جیسے امام السیاست کا بیٹا ہونے کے ناتے سے اصولِ جہاں بانی

① العقد الفريد: 378/2. ② البداية والنهاية: 143/8.

سے کافی حد تک آگاہ تھا۔ وہ تقویٰ میں بیشک صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمہم اللہ جیسا نہ تھا، مگر اس کا علمی و عملی پایہ کوئی گرا ہوا بھی نہ تھا جیسا کہ قدیم پروپیگنڈے کی بنا پر عوام میں یہ بات عام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم اور دیگر اہل اسلام نے اسے بلا خوف، بلا جبر و اکراہ، برضا و رغبت منتخب کر لیا۔

عظیم محدث و فقیہ حافظ عبدالغنی مقدسی رحمہ اللہ خلافت یزید کے بارے میں فرماتے ہیں:

«قَالَ بَعْضُ الْعُلَمَاءِ: بَايَعَهُ سِتُّونَ مِنْ أَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ مِنْهُمُ ابْنُ عُمَرَ رضی اللہ عنہما»

''بعض علماء کے مطابق ساٹھ صحابہ رضی اللہ عنہم نے یزید کی بیعت کر لی تھی جن میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی شامل تھے۔''[1]

جہاں تک یزید کی بیعت کا تعلق ہے، وہ تو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی زندگی ہی میں استصوابِ رائے سے تقریباً ہو چکی تھی۔ لیکن پھر دوبارہ بیعت ہوئی، اور غالب اکثریت نے بیعت کر لی۔ اس کا ذکر بلاذری: 4/4، الامامۃ والسیاسۃ: 1/ 202، البدایہ: 8/ 148، تاریخ طبری اُردو: 5/ 181 میں موجود ہے۔

البتہ تین قابلِ ذکر اصحاب حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما نے پس و پیش کیا۔ بعض مؤرخ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کا نام بھی بتلاتے ہیں، لیکن یہ درست نہیں، کیونکہ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے بیعت کر لی تھی۔[2]

اور حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما خلافت یزید سے چند برس قبل ہی انتقال کر

[1] طبقات الحنابلہ لابن رجب۔ [2] البلاذري: 4/4، والإمامه والسياسه: 1/202 .

چکے تھے۔“[1]

اور پہلے تین میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بھی بیعت کر لی تھی۔ تقویٰ، پرہیز گاری اور پابندیٔ شرع میں آپ رضی اللہ عنہ کا پایہ مسلّم ہے۔[2]

باقی رہ گئے حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما انھوں نے بیعت نہ کی، بلکہ یزید کی مخالفت کی۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

«بَايَعَ ابْنُ عُمَرَ وَابْنُ عَبَّاسٍ وَصَمَّمَ عَلَى الْمُخَالَفَةِ الْحُسَيْنُ وَعَبْدُ اللّٰهِ بْنُ الزُّبَيْرِ»

”ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بیعت کر لی، مگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ابن زبیر رضی اللہ عنہما مخالفت پر قائم رہے۔“[3]

مؤرخ شہیر علامہ ابنِ خلدون رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

«وَلَمْ يَبْقَ فِي الْمُخَالَفَةِ لِهٰذَا الْعَهْدِ الَّذِى اتَّفَقَ عَلَيْهِ الْجُمْهُوْرُ إِلَّا ابْنُ الزَّبَيْرِ»

”خلافتِ یزید پر (عالی جناب حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بعد) سوائے ابنِ زبیر رضی اللہ عنہ کے سب متفق ہو چکے تھے، اور کوئی باقی نہ رہا۔“[4]

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا بالآخر رجحان ومیلان آپ کے فرمان فَأَضَعُ يَدِي فِي يَدِهٖ سے معلوم ہو جاتا ہے۔ آپ کا یہ رجحان اپنی جگہ بڑی اہمیت کا حامل ہے اور یہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی پیش کردہ مشہور تین صورتوں میں سے تیسری صورت تھی، جس کی

---

① تهذيب التهذيب: 6/147، والبداية والنهاية: 8/89. ② دیکھیے: صحيح البخاري: 1053/3. ③ البداية والنهاية: 8/151. ④ مقدمه ابن خلدون: 176.

لطافت اور باریکی تک عام دوستوں کی نگاہ نہیں پہنچ پائی، ورنہ خود سوچیں یزید کے پاس اور کس لیے جانا تھا؟ جو دوست ہماری بات سے اتفاق نہیں کرتے وہ شیعہ سنی معتبر ایک دو کتابوں سے نہیں بلکہ متعدد کتب سے حوالہ جات ملاحظہ فرما کر اپنا شبہ دور کر سکتے ہیں۔

یزید کی بیعت کرنے والے اتنے لوگ تھے کہ جن کی صحیح تعداد کا اندازہ ہی نہیں، اور ان میں کثیر صحابہ رضی اللہ عنہم تھے جن میں دو عشرہ مبشرہ، چودہ اصحابِ رضوان، اٹھارہ اصحابِ بدر، پانچ ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر کبار وصغار 233 صحابہ تھے، یہ کل تعداد 272 ہے۔ اربابِ تحقیق نے باقاعدہ نام بنام ان کی فہرست بنائی ہے، اور تابعین کرام رحمہم اللہ کا تو شمار ہی نہیں کہ کس قدر تھے۔ ان میں سے کسی نے بھی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے مؤقف کی تائید وحمایت نہیں کی تھی۔ نہ آپ کے اجتہاد سے اتفاق کیا، نہ آپ کے ساتھ نکلے، نہ یزید کے مقابلے کو جہاد سے تعبیر کیا، بلکہ اس کے برعکس انھوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو یزید کے مقابلے اور مخالفت سے منع کیا اور سفر کوفہ سے روکا، یہ تفصیل عنقریب آ رہی ہے۔

سب صحابہ رضی اللہ عنہم ایسے مخلصین و قانتین تھے جنھوں نے اعلائے کلمۃ الحق کے لیے جہاد کیے، قربانیاں دیں، اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت پر بیوی بچوں کو نچھاور کر دیا، بھرے پُرے گھروں کو نظر بھر کر نہ دیکھا، راہ حق میں جسم چھدوا دیا، گردنیں کٹوا دیں، ہر پریشانی و اذیت اور تکلیف وصعوبت برداشت کی، مگر اسلام کا جھنڈا جھکنے نہ دیا۔ خلاصہ کلام یہ کہ ان کے اِخلاص کا عالَم یہ تھا کہ انھوں نے کسی بھی قربانی کو بخندہ پیشانی اور بہ طِیبِ خاطر پیش کرنے سے دریغ نہ کیا۔ بلکہ ایمان وایقان اور اخلاص ووفا کے پھول نچھاور کرنے میں کوئی کمی اٹھا نہ رکھی۔ ان کے زرّیں کارناموں سے تاریخ کے اوراق آج بھی روشن ہیں۔

ایک طبقے کا خیال ہے کہ یہ سب لوگ (یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم معاذ اللہ) خوف یا لالچ کا شکار ہو گئے تھے، چنانچہ شیعی کتاب ''الامامۃ والسیاسۃ'' میں لکھا ہے:

«وَالْقَومُ سَكَتُوا، وَلَمْ يَتَكَلَّمُوا شَيْئاً حَذَرَ الْقَتْلِ»

''لوگ مُہر بہ لَب اور جامد وساکت رہے۔ اور قتل کے خوف سے کسی نے زبان تک نہ کھولی۔''[1]

اہل تشیّع کا اصحابِ رسول کے بارے میں ایسا منفی پروپیگنڈہ تو قدیم سے ہے ہی، مگر افسوس! شیعی پروپیگنڈے سے متأثر بہت سے عوام اور قلیل المطالعہ اور سطحیت پسند کثیر اہل علم بھی شیعہ نہ ہونے کے باوصف کسی حد تک یہی شیعی ذہن رکھتے ہیں۔

اللہ کے لیے کہیے!!! کہ وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو ایمان وتقویٰ کی معراج پر فائز تھے، شجاعت وبسالت کا پیکر تھے، سراپا خودداری اور غیرت ایمانی تھے، صداقت ودیانت کا نشان تھے، اور جو تلواروں کے سائے تلے اوقات زندگی بسر کرتے تھے کیا وہ کسی خوف یا لالچ میں آ کر یزید کی حکومت کو تسلیم کر سکتے تھے؟ کبھی نہیں، ہرگز نہیں۔ یہ اور اس قسم کا سارا پروپیگنڈہ دراصل اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایک سازش کے تحت کیا گیا۔ اور منظم طور پر ہو رہا ہے، جو شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد سے شروع ہوا اور برابر جاری رہا، اور آج بھی کیا جا رہا ہے۔ اور تکلیف وہ بات یہ ہے کہ ہمارے کچھ سادہ لوح مسلمان امر واقعہ اور حقیقت حال کو مطلق طور پر سمجھ نہیں پا رہے۔ اور اسی پروپیگنڈے کے بہاؤ میں مسلسل بہتے چلے جا رہے ہیں۔ اور بہاؤ سے بچنے کے لیے ہاتھ پاؤں بھی نہیں ہلاتے۔

برادران اہلسنت سے عرض ہے کہ للہ اپنے مطالعے کو وسعت دیں۔ پروپیگنڈے پر نہ جائیں۔ یہ دین وایمان کا مسئلہ ہے۔ شان صحابہ واہلبیت رضی اللہ عنہم کا مسئلہ ہے، مہربانی کر کے ذرا سوچ سمجھ کر چلیں، ایسا نہ ہو کہ کہیں آپ بھی عالمِ لاشعوری میں اس سبائی پروپیگنڈے میں شریک ہو کر ادب کے نام پر بے ادبی اور بد اعتقادی کے

[1] كتاب الامامة والسياسة: 1/190.

گہرے گڑھے میں جاگریں۔ یہاں مسئلہ اصحابِ رسول ﷺ کے دفاع کا ہے۔ زیادہ نہ سہی کم از کم یہ تو غور کریں کہ اگر یزید کو "پلید" باور کرایا جائے تو اس کی تائید کرنے والوں کو پھر کیا کہیں گے......؟ اس کی بیعت کرنے والوں کو کیا نام دیں گے؟ کبھی سوچا اور غور کیا آپ نے؟ یہ بظاہر معمولی سی بات کہاں سے کہاں تک لے جائے گی؟ بُرا ہو جمود و تعصّب کا۔

قارئین! خوب سمجھ لیں ہم یزید کا دفاع نہیں کرتے بلکہ اصحاب رسول رضی اللہ عنہم کا دفاع کرتے ہیں۔ یزید کا دفاع ہم پر فرض ہے نہ واجب، نہ مؤکّد ہے نہ مستحَب۔ صرف حقائق سے آگاہی ہماری اصلی غایت ہے۔ کیونکہ صحابہ واہلبیت رضی اللہ عنہم کو موردِ الزام ٹھہرا کر مجرمین کے کٹہرے میں کھڑا کردینا ہمیں گوارا ہے نہ برداشت۔ نہ یہ ہمارے لائق ہے نہ شایان شان۔

قرآن مجید صحابہ کرام واہل بیت عظام رضی اللہ عنہم کے بارے میں ایسے بیہودہ نظریات کی تشہیر کرنا تو رہا الگ، ان کے بارے میں ایک ثانیے کے لیے بھی توہین آمیز اور منفی پروپیگنڈے کی اجازت نہیں دیتا۔ قرآن مجید ان کی عظمت کا پھریرا لہراتا اور اعلان کرتا ہے:

1 ﴿أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ "وہ لوگ کامیاب ہیں۔"

2 ﴿أُولَٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ﴾ "وہ لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔"

3 ﴿فَإِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْغَالِبُونَ﴾ "بے شک اللہ کا گروہ ہی غالب ہے۔"

4 ﴿أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا﴾ "وہ لوگ پکے سچے مومن ہیں۔"[1]

ابرار واخیار کی ایسی جماعت کہ جن کی منقبت و مدحت عالم الغیب والشہادہ خود بیان کرے، ان کے ایمان اور تقویٰ کا خود اعلان کر کے ان کی تعریف وتوصیف کو

[1] علی الترتیب: الأعراف 7:157، الحجرات 49:7، المائدة 5:56، الأنفال 8:4.

قرآن مجید کا حصہ بنا دے (سبحان اللہ سبحان اللہ)، وہ بھلا کسی دباؤ یا لالچ میں آ کر حق کا ساتھ چھوڑ سکتے تھے؟ ناممکن ناممکن۔

این خیال است و محال است و جنوں

بہر کیف صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم نے کسی خوف یا لالچ میں آ کر یزید کی بیعت نہ کی تھی۔ نہ یہ دباؤ میں آنے والے تھے۔ اور نہ ہی کسی لالچ یا کسی دھمکی کو خاطر میں لانے والے تھے بلکہ ان جملہ فرزندان توحید نے برضا و رغبت بیعت کی تھی اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے کی تھی۔ یہ دنیائے اسلام کو خواہ مخواہ کی جنگ و جدل کے بھاڑ سے نکال کر اسے امن و سکون کا گہوارہ دیکھنا چاہتے تھے، ان کی نیت نیک تھی، ارادے اچھے تھے، عزائم بلند تھے۔ ان کی بیعت ایسی ویسی اور خام بدہن منافقانہ نہ تھی جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے اور باور کراتے ہیں۔ بلکہ علیٰ وجہ البصیرت تھی، دل کے پختہ ارادے، نیک نیتی سے تھی اور قطعاً آزادانہ تھی۔ انھوں نے نہ وہ خاکہ پیش کیا تھا نہ سمجھا تھا جسے آج کل ''حسینیت'' اور ''یزیدیت'' کا نام دے کر اچھالا اور امت کو دو متوازی حصوں میں تقسیم کر کے پیش کیا جا رہا ہے۔ ان اَسلاف کرام رضی اللہ عنہم نے ایک ذہن کو اسلام اور دوسرے کو کفر و نفاق بنا کر پیش نہیں کیا تھا جو آج کل پیش کیا جا رہا اور باور کرایا جا رہا ہے۔ اللہ کرے اس روشنی کے دور میں لوگ ہر بات کو اسی طرح سمجھیں جس طرح وہ ہے۔ اور ہر تصویر کو اسی طرح دیکھیں جس طرح وہ ہے۔ سوچے سمجھے بغیر ''ٹھیک ہے، سب غلط ہے غلط ہے'' کہتے جانا بھی درست نہیں۔ لیکن یہ کام معمولی نہیں بڑی عزیمت اور عظمت کا ہے۔ جو توفیق الٰہی کے بغیر ممکن نہیں۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور یزید

ہم یہ بتا چکے ہیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے یزید کی خلافت سے اتفاق نہ کیا، اور ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے یزید سے کیوں اختلاف کیا، اور اس اختلاف کی نوعیت کیا تھی۔ مگر بعض لوگ کہتے ہیں کہ یزید ظلم ڈھاتا تھا، شعائر اللہ کی پروا نہ کرتا تھا، اسلام کی تضحیک، صحابہ رضی اللہ عنہم کی تحقیر، محدّثین کی بے ادبی، اولیاء کی بے حرمتی اس کا دن رات کا معمول تھا۔ توحید و سنت مفقود ہو چکی تھی۔ سنتیں پامال ہو رہی تھیں، ان حالات کو دیکھ کر حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اس ظالم اور بے دین حکومت کے خلاف جہاد کا علم بلند کیا، لیکن یہ بات بنانے والے لوگوں سے ہم پوچھتے ہیں! آپ رضی اللہ عنہ اگر اس لیے یزید کی بیعت سے گریز کر رہے تھے کہ یزید فاسق و فاجر، ظالم اور بے دین تھا تو پھر آپ نے اس کے فسق و فجور اور ظلم و بے دینی کا اظہار کیوں نہ فرمایا؟ آپ جیسے بہادر اور نڈر کو اظہارِ حقیقت سے کون سا عذر مانع تھا؟

اور بالفرض اگر یزید بے دین اور زندیق تھا تو پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جیسے اصحاب ایمان وتقویٰ نے اس کی بیعت کیوں کی؟ اگر یزید ایسا ہی مجرم اور سیاہ کار تھا تو پھر محمد بن حنفیہ، حضرت زین العابدین، حضرت عبداللہ بن جعفر، حضرت ابن عباس، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جیسے اجلّہ اصحاب نے اس کی تعریف کیوں کی؟ اور وہ حسین رضی اللہ عنہ کو یزید کی مخالفت سے کیوں منع فرماتے رہے؟ اور اگر یزید ایسا ہی تھا تو پھر حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے یزید کے پاس جانے کا ارادہ کیوں فرمایا؟ یہ سب باتیں غور

کرنے کی ہیں۔اس لمحۂ فکریہ کا ہم نے تھوڑے لفظی تغیر کے ساتھ اس لئے ذکر کیا ہے تاکہ دوست ان حقائق پر کچھ غور فرمائیں۔اگر کسی کے پاس ان سوالات کا کوئی معقول اور مبنی بر حقیقت جواب ہو تو ہمیں آگاہ فرمائے۔اگر دلیل میں وزن ہوا، اور صحابہ و اہل بیت رضی اللہ عنہم کی پوزیشن پر کوئی حرف نہ آیا تو تسلیم کر لیں گے۔لیکن اگر بات نہ بنی......تو پھر......؟

ہم متعدد بار کہہ چکے ہیں کہ یہ بات درست نہیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ یزید کی بیعت اس لیے نہیں کرتے تھے کہ وہ یزید کو فاسق، فاجر، زانی اور زندیق جانتے تھے۔قرائن، شواہد اور حالات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کا یزید سے اختلاف یہ نہیں تھا جو بتایا جا رہا ہے۔ بلکہ آپ رضی اللہ عنہ کا اختلاف محض فکری اور اجتہادی نوعیت کا تھا، آپ رضی اللہ عنہ باپ کی بیٹے (یعنی امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی یزید) کے لیے نامزدگی سے اختلاف رکھتے تھے، نیز آپ رضی اللہ عنہ اپنے آپ کو خلافت کا حقدار سمجھتے تھے، حالات و قرائن کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے اور آپ کا خیال تھا کہ خلافت محض ہمارے خاندان کا حق ہے کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں ہوسکتا۔ علاوہ ازیں آپ رضی اللہ عنہ کا یہ بھی خیال تھا کہ یزید پوری دنیائے اسلام کا خلیفہ منتخب نہیں ہوا۔ یہ سب کا خلیفہ بنا ہے اور نہ بن سکتا ہے۔لیکن یہ آپ رضی اللہ عنہ کا اپنا نظریہ تھا، اپنی فکر تھی۔

عالی جناب حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پورے احترام کے ساتھ عرض ہے کہ اس نظریے اور فکر کی واقعات نے تائید کی نہ کسی قابلِ ذکر شخصیت نے حمایت کی۔ یہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا اپنا تفرد، اپنی رائے اور اپنا اجتہاد تھا، جس کا جلد ہی آپ رضی اللہ عنہ کو اندازہ ہوگیا۔ یہی تو فرق ہے نبی اور غیر نبی میں۔ غیر نبی اپنی رائے سے قدم اٹھاتا ہے، جبکہ نبی رب کی وحی سے قدم اٹھاتا ہے۔ یہ مقامِ معصومیت ہے جو صرف انبیاء علیہم السلام کو حاصل ہے۔حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو دنیا جہاں کی ہر فضیلت وشوکت حاصل تھی لیکن آپ

اس کے باوصف نبوت کے درجے پر فائز نہ تھے۔ [1]

ایک اور بات بھی ہے کہ اہلِ کوفہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے بہت عقیدت و محبت کا اظہار کرتے تھے اور یہ خواہش رکھتے تھے کہ اگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ یہاں تشریف لے آئیں تو ہم انھیں اپنا امیر و امام مان لیں گے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بھی ان سے حسن ظن تھا کہ یہ لوگ اہلِ بیت کے سچے محبّ اور عقیدت گزار ہیں، چنانچہ کوفہ والوں کے پیہم خطوط اور پیغامات آ رہے تھے۔ جن کا مفہوم قریب قریب ایک ہی تھا کہ ''اے حسین رضی اللہ عنہ! آپ جس قدر جلدی ممکن ہو یہاں تشریف لے آئیں، ہم سب آپ رضی اللہ عنہ کے جاں نثار اور فرمانبردار ہیں، ہم آپ رضی اللہ عنہ کو اپنا امیر بنا لیں گے اور ہرگز آپ کی حکم عدولی نہ کریں گے......''

مؤمن سادہ ہوتا ہے۔ یہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی سادگی تھی یا حد سے زیادہ حسن ظنی یا پھر نوشتہ تقدیر ہی ایسا تھا کہ آپ نے ان مکاران و بے وفایان و شاطرانِ کوفہ کے احوال اور سابقہ ریکارڈ پر توجہ نہ فرمائی یا آپ کی نگاہ مبارک ادھر منعطف نہ ہوئی۔ اور آپ ان کے پیغامات اور خطوط پر سو فیصد اعتماد کر بیٹھے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے کوفیوں کو سچا، باوفا، اطاعت شعار، اور عقیدت مند یقین کر لیا جبکہ کوفی اندر سے ایسے نہ تھے۔ آپ کے ذہن میں جو خاکہ بظاہر نظر آ رہا تھا وہ یہ تھا کہ مکہ مکرمہ میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما اپنی حکومت قائم کر چکے ہیں۔ ابن زبیر رضی اللہ عنہما حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی طرح حد درجہ عابد، زاہد اور صاحب علم و تقویٰ تھے۔ بیشک ان دونوں بزرگوں کی عبادت، زہد، تقویٰ اور صحابی رسول ہونے کے ناتے سے شان اور فضیلت یزید سے بہت زیادہ تھی۔

---

[1] ملائکہ بھی معصوم ہوتے ہیں مگر ان کی اور نبی کی معصومیت میں فرق ہے۔ انبیاء علیہم السلام جنس بشر سے ہوتے ہیں اور ان میں وہ تمام خواص ہوتے ہیں جو جنس بشر میں پائے جاتے ہیں مثلاً غم، غصہ، عجلت اور دیگر خواص۔ لیکن ملائکہ کی یہ سب باتیں مرضی مولیٰ کے تابع ہوتی ہیں۔

بلکہ یزید کو ان بزرگوں اور دیگر سب صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی کوئی نسبت نہ تھی۔ مگر جیسا کہ آپ پیچھے پڑھ چکے ہیں کہ مصر، شام، عراق کی تقریباً 56 لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی وسیع وعریض مملکت جو انارکی اور طوائف الملوکی کا شکار ہو چلی تھی، جس کے سمندروں میں ارتعاش، ہواؤں میں زہرناکی، دریاؤں میں طوفان، فضاؤں میں قنوطیت، چشموں اور آبشاروں میں یاس، حالات میں ابتری تھی اور جگہ جگہ گروہ بندیاں اور جتھے تھے۔ اور جس مملکت میں اگر ایک طرف اصحاب رسول سیدھے سادے مسلمان اور پُر امن شہری تھے تو دوسری طرف روافض وخوارج اور منافقین کے کیمپ تھے۔ ان حالات سے نمٹنے کے لئے کوئی اسی طرح کا زور آور اور کارِ حکومت چلانے کے لئے سخت گیر، اور کسی حد تک تجربہ کار آدمی چاہیے تھا جیسے اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ سے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی صورت میں متعین کر دیا تھا۔ علاوہ ازیں جب یہ حقیقت اور قرآن مجید کا فیصلہ ہے کہ اللہ کے علم وحکم کے بغیر درخت کا کوئی پتہ گرتا ہے، نہ آندھی کا کوئی ذرہ اٹھتا ہے، نہ دریاؤں میں جوش آتا ہے، نہ سمندر متلاطم ہوتے ہیں، نہ بگولے اٹھتے ہیں، نہ موجیں ٹکراتی ہیں، نہ زمین لرزتی ہے، نہ پہاڑ کانپتے ہیں، نہ بادل گرجتے ہیں، نہ بجلیاں کوندتی ہیں، نہ بحری بیڑے کنارے لگتے ہیں، نہ جہاز غرقاب ہوتے ہیں، نہ ندیاں جاری ہوتی ہیں، نہ چشمے ابلتے ہیں، نہ پہاڑ لاوا اگلتے ہیں، نہ شہاب ثاقب فضا کو چیرتے ہیں، نہ سیّارے مدار میں گھومتے ہیں، نہ شمس وکواکب چمکتے ہیں، نہ ماہتاب آنکھ مچولی کرتا ہے، نہ سبزہ لہلکتا ہے، نہ پھول مہکتے ہیں، نہ آسمان سے سحاب رحمت برستا ہے، نہ زمین کے نیچے سے فوارے ابلتے ہیں۔ غرض کائنات کا حسن وبہار، باغ وراغ کی گلفشانیاں اور عطر بیزیاں، نسیم وشمیم کے جھونکے، سبک بادخرام کی اٹھکیلیاں، مرغانِ خوش نما کی چہک، گلہائے رنگا رنگ کی مہک، خلّاق عالم کی شان رحیمی وقیوّمی کے دم قدم سے وابستہ ہے۔ ہر ذرے، ہر لہر، ہر تھپیڑے، غرض ہر شے، ہر شے کی ہر

حرکت میں قادر وعلیم کا علم وحکم اور قدرت واختیار کارفرما ہے۔ یہی مطلب ہے ان آیات قرآنی کا ﴿ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ [1]

﴿ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴾ [2] ﴿ يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴾ [3]

﴿ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ [4]

اب آیئے ذرا تاریخ کے اوراقِ زریں پلٹیے اور بتایئے ......آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سراقدس پر تاج ختم نبوت سجانے والا کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو انبیاء ومرسلین اور جمیع مخلوقات اور کل مخلوقات سے زیادہ شان عطا کرنے والا کون ہے؟ حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کے متصل بعد خلافت ونیابت کا بوجھ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے کندھوں پر ڈالنے والا کون ہے؟ ان کے بعد بہ ترتیب خاص حضرت عمر فاروق، پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تخت خلافت پر متمکن کرنے والا کون ہے؟ [5] پھر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی جانب خلافت منتقل کرنے والا کون ہے؟ پھر چند ماہ بعد ادھر سے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ تک خلافت پہنچانے والا کون ہے؟......اسلامی قلمرو کو مکے، مدینے سے اور جزیرۂ عرب سے نکال کر شام، عراق، مصر بلکہ افریقہ کے قلب تک پہنچانے والا کون ہے؟ پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے لے کر حضرت حسن رضی اللہ عنہ، تک علی الترتیب چاروں خلفاء کو مرتبہ شہادت دینے والا کون ہے؟ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو مقتول ہونے سے بچانے والا کون ہے؟ حاصل کلام یہ کہ رب تعالیٰ نے اپنے علم وحکم سے جسے مناسب سمجھا خلافت عنایت کردی اور جسے موزوں جانا خلافت کے ساتھ شہادت بھی دے دی۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے بعد یزید کو خلافت اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو شہادت دے دی۔ اختلاف کا ہر ایک کو حق حاصل ہے مگر ہمارا اپنا

---

[1] البقرۃ 2:20. [2] البقرہ 2:253. [3] البقرۃ 2:117. [4] یوسف 12:21. [5] ہماری تازہ ایمان افروز اور لاجواب کتاب ''خلافتِ راشدہ'' کا مطالعہ فرمائیں۔

میلان، رجحان اور طبعی ذوق، عالی مقام حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی طرف ہے کہ خلافت آپ کو ملنی چاہیے تھی کیونکہ آپ رضی اللہ عنہ اس کے پورے اہل تھے۔ یا کسی اور بزرگ کو جو براہِ راست رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فیض یافتہ اور کارِ حکومت چلانے اور ان ناگفتہ بہ حالات کو قابو میں لانے کی اہلیت اور اپنے کمالِ فن سے آراستہ ہوتا۔ اس وقت حسین رضی اللہ عنہ کا ہم پلّہ اور کوئی تھا بھی نہیں۔ لیکن آخری کتاب کا آخری فیصلہ ارشاد قرآنی ہے:

﴿ وَمَا تَشَآءُونَ إِلَّآ أَن يَشَآءَ ٱللَّهُ رَبُّ ٱلْعَٰلَمِينَ ﴾ [1]

آیت کا مفہوم کسی نے یوں بیان کیا ہے کہ

ع ہوتا وہی ہے جو منظور خدا ہوتا ہے

بہر حال خلافت خلافت ہے اور شہادت شہادت۔ خلافت کا اپنا مقام ہے اور شہادت کا اپنا۔ محض خلافت شہادت کے درجے کو نہیں پاسکتی، قرآن مجید میں شہید کی بابت ارشادِ ربانی ہے:

﴿ وَلَا تَقُولُوا۟ لِمَن يُقْتَلُ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ أَمْوَٰتٌۢ ﴾ [2]

﴿ وَلَا تَحْسَبَنَّ ٱلَّذِينَ قُتِلُوا۟ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ أَمْوَٰتًۢا ...... ﴾ [3]

اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر اس کی رفعت شان کو دوبالا کر دیا، لیکن یہ خصوصیت ہر خلیفہ کو نصیب نہیں ہوئی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلافت ملی، لیکن شہادت نصیب نہیں ہوئی۔ اور اگلے چاروں خلفائے عظام رضی اللہ عنہم کو بشمول حضرت حسن رضی اللہ عنہ منصب خلافت بھی مل گیا اور مرتبۂ شہادت بھی۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا ان پر خصوصی انعام اور خصوصی فضل و کرم تھا کہ انھیں دونوں مناصب و مراتب نصیب ہو گئے ﴿ وَذَٰلِكَ فَضْلُ ٱللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَآءُ ﴾ [4]

---

[1] التكوير: 29. [2] البقرة: 154. [3] البقرة: 169. [4] المائدة: 54.

یہ رتبۂ بلند ملا جسے بھی مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں؟

دوسری بات یہ ہے کہ جس کے حق میں اللہ کا جو فیصلہ تھا وہ ہو چکا، جس کو خلافت ملنا تھی وہ مل گئی، جس کو شہادت ملنا تھی وہ مل گئی، اور جس کو خلافت اور شہادت دونوں ملنا تھیں وہ مل گئیں۔ اب بعد والے مسلمانوں کا باہم الجھنا، اور پہلوں کو مطعون کرنا سراسر بے مقصد، بے مطلب، بے فائدہ اور لاحاصل ہے۔ جس طرح پانی کو بلونے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا اسی طرح ایسی بحثوں میں پڑنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ یعنی ان پر سب وشتم کرنے اور طعن کرنے کا کوئی مقصد ہے نہ فائدہ نہ ثواب، بلکہ الٹا گناہ اور عذاب ہے جو خواہ مخواہ واجب ہو جاتا ہے۔

کتنا عبرت آموز ہے یہ ارشاد قرآنی:

﴿ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۖ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴾

"یہ لوگ تھے جو گزر چکے، ان کے لئے وہ کچھ ہے جو وہ کر چکے، اور تمھارے لئے وہ کچھ ہے جو تم کرو گے، ان کے اعمال اور تگ و تاز کے بارے میں تمہیں مطلق سوال نہ ہوگا۔"[1] اور یہ ارشاد ساتھ ساتھ دو مرتبہ آیا۔

اور کتنا یاد رکھنے کی لائق ہے یہ فرمان نبوی:

«لَا تَسُبُّوا الْأَمْوَاتَ فَإِنَّهُم قَدْ أَفْضَوْا إِلٰى مَا قَدَّمُوا»

"فوت شدگان کو گالی نہ دو کیونکہ وہ جو کام کر کے گئے وہ اس کی سزا یا جزا کو پہنچ چکے ہیں۔"[2]

① البقرة 2:141. ② صحيح ابن حبان: 290/7، حديث: 3021، سنن دارمي: 311/2، حديث: 2511.

فوت ہونے والوں میں انبیاء علیہم السلام بھی ہیں ان کے بعد صحابہ واہل بیت رضی اللہ عنہم اور پھر ان کے بعد والوں کا درجہ ہے، جو اپنی جگہ بہت بلند ہے۔

بس ہمیں اپنے اپنے عقائد اور اعمال کو نبوی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرنی چاہیے تا کہ ہم دنیا و آخرت میں سرخرو ہوسکیں۔ صحابہ یا اہل بیت رضی اللہ عنہم کی شان میں مندا بولنے سے نہ ایمان سلامت رہتا ہے نہ اعمال محفوظ رہتے ہیں۔ یہ دونوں جہانوں کا خسران ہے۔ ہمیں اپنی قوم اور نئی نسل کو نقصان وخسران سے بچانا چاہیے نہ کہ ان بیچاروں کو اس سے دوچار کرنا چاہیے۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ، پیچھے بیان کردہ وجوہات کی بنا پر، برابر اپنے مؤقف پر قائم رہے اور بڑے بڑے صحابہ رضی اللہ عنہم آپ کو سمجھا رہے تھے مگر آپ کسی کے مشورے پر کان دھرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ہر آدمی کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے، آپ کا بھی اپنا مزاج تھا، وہ اپنی جگہ بڑا قابل قدر اور لائق تحسین تھا، اور یہ بھی اپنی جگہ پر درست ہے کہ آپ اپنی رائے اور سوچ کو سولہ آنے درست سمجھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اس سلسلے میں کسی سے مشورہ لیا، نہ کسی کے مشورے پر توجہ فرمائی بلکہ برابر اپنی رائے پر قائم رہے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ مشہور صحابی ہیں، فرماتے ہیں:

«غَلَبَنِی الْحُسَیْنُ عَلَی الْخُرُوْجِ وَ قُلْتُ لَهُ: اِتَّقِ اللّٰهَ فِي نَفْسِكَ وَالْزِمْ بَيْتَكَ وَلَا تَخْرُجْ عَلٰى ......»

''حسین رضی اللہ عنہ مجھ پر خروج کے حوالے سے غالب آ گئے (وہ اس طرح کہ) میں نے ان سے کہا: اللہ سے ڈرو، اور آرام سے گھر میں رہو، اور اپنے امام (یزید) کے خلاف خروج نہ کرو (مگر آپ رضی اللہ عنہ نہ مانے اور یزید کے خلاف نکل پڑے)''[1]

---

[1] البداية والنهاية: 163/8.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، سب ان کی جلالت سے آشنا ہیں، وہ فرماتے ہیں:

«غَلَبَنَا حُسَيْنُ بْنُ عَلِيٍّ بِالْخُرُوْجِ وَ فِي أَبِيْهِ وَأَخِيهِ عِبْرَةٌ»

''حسین رضی اللہ عنہ نے ہم پر خروج کے لیے زور دیا، حالانکہ انھیں اپنے ابا جان اور برادر عزیز (یعنی حضرت علی اور حضرت حسن رضی اللہ عنہما کے حالات) سے عبرت ہونی چاہیے تھی، اور دوسرے لوگوں کی طرح بیعت کر لینی چاہیے تھی۔ مگر......''[1]

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

«كَلَّمْتُ حُسَيْنًا، فَقُلْتُ: اِتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تَضْرِبِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ»

''میں نے حسین رضی اللہ عنہ سے بات چیت کی اور ان سے کہا: ''اللہ سے ڈرو اور لوگوں کو باہم برسرِ پیکار نہ کرو۔''[2]

حضرت ابو واقد اللیثی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«أَنْ لَّا يَخْرُجَ فَإِنَّهُ مَنْ يَّخْرُجْ فِي غَيْرِ وَجْهِ خُرُوجٍ إِنَّمَا خَرَجَ لِقَتْلِ نَفْسِهِ»

''وہ (یعنی حسین رضی اللہ عنہ) خروج نہ کریں، اس لیے کہ جو شخص بغیر کسی وجہ کے خروج کرتا ہے، وہ اپنی جان کو معرض خطر میں ڈالتا ہے۔''[3]

اور یہ بات آپ رضی اللہ عنہ نے حسین رضی اللہ عنہ کو اللہ کا واسطہ دے کر کہی تھی۔

شہرۂ آفاق مؤرخ علامہ محمد خضری بک مصری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''اس وقت بکثرت صحابہ رضی اللہ عنہم حجاز، شام، بصرہ، کوفہ اور مصر میں موجود تھے، ان میں سے کسی ایک نے بھی نہ خود یزید کے خلاف خروج کیا، اور نہ حسین رضی اللہ عنہ

---

① البداية والنهاية: 163/8. ② البداية والنهاية : 163/8. ③ البداية والنهاية : 163/8.

کے ساتھ ہو کر کیا۔''[1]

اگر یزید کی حکومت کافرانہ یا فاجرانہ تھی تو صحابہ واہل بیت رضی اللہ عنہم اور دیگر اہل اسلام کو خروج کرنا چاہیے تھا نہ کہ اس سے روکنا چاہیے تھا! کیا خیال ہے آپ کا؟

بہر حال حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی اپنی ایک سوچ، اپنی رائے اور ایک اجتہاد تھا، جس میں آپ منفرد تھے۔ اپنی جگہ یہ سوچ کیسی ہی عمدہ کیوں نہ ہو مگر اتنا ماننا پڑے گا کہ اس عہد کا کوئی بزرگ یا قابلِ ذکر شخص آپ رضی اللہ عنہ سے متفق نہ ہو سکا۔ اور اس کی محض وجہ یہ تھی کہ اس سے مُلکی و ملّی نظم وضبط متاثر ہوتا تھا، فتنہ وفساد کی چنگاریوں کو ہوا ملتی تھی، اور خرمنِ سکون سلگنے کا اندیشہ تھا۔ اور ایسے تجربات پہلے بھی ہو چکے تھے اور وہ جملہ بھیانک اور اندوہناک حالات اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تھے اور انھیں اندازہ تھا کہ ایسے مواقع سے منافقین کس طرح فائدہ اُٹھاتے اور ملک وملت کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ وہ دوبارہ یہ تلخ تجربہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔

کئی لوگ ناسمجھی کی بنا پر اس دانشمندانہ نظریئے کو بدنام کرنے کے لیے طرح طرح کے نام دیتے ہیں، اور بلا سوچے سمجھے مخالفینِ صحابہ افراد کی ڈگر پر چلتے ہوئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان میں ناروا جملے بول دیتے ہیں۔ بلکہ بسا اوقات صریح بے ادبی اور گستاخی کے الفاظ زبان سے نکال دیتے ہیں۔ اور فکر صحابہ رضی اللہ عنہم کو ''یزیدیت'' کہہ کر اہانت صحابہ بلکہ توہین قرآن وحدیث کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس باب میں کثیر سنّی کہلانے والے افراد بھی شیعوں کے شانہ بشانہ ہیں۔ اور بعض اوقات ان دونوں کے درمیان صرف انّیس بیس کا فرق باقی رہ جاتا ہے۔ تا آنکہ مکمل اتصال واتحاد ہو کر وہ بھی مٹ جائے گا۔ وہ اپنی طرف سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی طرفداری کرتے ہیں جو حقیقت میں صحابہ واہل بیت رضی اللہ عنہم کی طرف داری نہیں ہوتی بلکہ ان کے عناد و دشمنی پر

---

[1] اتمام الوفاء، مطبوعہ مصر.

منتج ہوتی ہے۔ کیونکہ حضرت حسین و اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم کا موقف صحابہ رضی اللہ عنہم کا مکمل ادب و احترام تھا۔ ان کے سامنے قرآن وحدیث کا پورا ذخیرہ تھا۔ وہ ہرگز صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف نظریہ وموقف نہیں رکھتے تھے۔ یہ بظاہر ''حسینیت'' ہے مگر بباطن ''رافضیت'' ہے۔ اسی کو کہتے ہیں: كَلِمَةُ حَقٍّ أُرِيْدَ بِهَا الْبَاطِلُ ''کلمہ اچھا ہے مگر ارادہ برا ہے۔'' ہے کوئی انصاف پسند جو ان حقائق کو سمجھے؟

اگر منافقین اور دشمنانِ صحابہ رضی اللہ عنہم ایسا کریں تو تعجب نہیں، مگر افسوس اور تعجب ہے اُن سُنّیوں پر جو ایسا کہہ دیتے ہیں اور خوشی سے ایسے لوگوں کی مجالس میں شرکت کرتے اور یوں بلا سوچے سمجھے مخالف صحابہ ذہن کو شعوری یا لاشعوری طور پر تقویت دیتے ہیں۔ حیرت ہے کہ سنّی کہلا کر، عقائد شیعہ کے سے ہیں، رسومات ان کی سی ہیں، نعرے ان کے سے ہیں۔ اسی طرح تقریر اور تحریر بھی ان کی سی ہے۔ اناللہ۔ حالانکہ جہاں نواسہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا احترام وعقیدت ہمارے لئے ضروری ہے وہاں صحابہ رضی اللہ عنہم کا احترام بھی ہمارے لئے ضروری ہے۔ اگر ہمیں ان کی شان میں کوئی نازیبا یا قرآن وحدیث سے متصادم کوئی روایت، حکایت یا شکایت بھی ملے تو اس کی اچھی ہی تاویل کرنی چاہیے نہ یہ کہ ان کی شان میں کوئی اچھی بات اور بہتر تاویل، صریح آیت یا حدیث ملے تو اس کی تردید وتغلیط کر دینی چاہیے......

مگر وائے حسرتا! ایسا ہی ہو رہا ہے۔ کوئی شخص ان حقائق وشواہد کا انکار نہیں کر سکتا۔

ہمیں کہنے کی اجازت دیجئے کہ یہ باتیں ہمارے بہت سے اپنے ہی بھائیوں سے لاعلمی اور لاشعوری میں سرزد ہو رہی ہیں۔ اور وہ بغض یزید کے نام پر بغض معاویہ رضی اللہ عنہ اور بغض معاویہ رضی اللہ عنہ کے نام پر بغض صحابہ رضی اللہ عنہم تک پہنچ رہے ہیں۔ ان کی اس قسم کی سب تحریریں اور تقریریں قلت مطالعہ اور تنگ نظری کی وجہ سے ہیں، جو حقیقت سے بہت دُور ہیں۔ ایسے سنّیوں کو محترم مفتی احمد یار خان صاحب گجراتی کی مایہ ناز کتاب ''امیر معاویہ رضی اللہ عنہ'' کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ (کاش حضرت مفتی صاحب کی دیگر کتب کا بھی یہی معیار ہوتا۔)

یزید کا طرز عمل

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا بیٹا یزید، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا احترام بجا لاتا تھا، ان کی عظمت کا معترف تھا، اور ان کی اہمیت کو جانتا تھا۔ اور اسے یہ بھی خبر تھی کہ حسین رضی اللہ عنہ میری بیعت سے گریز اختیار کرتے ہیں، اور آپ رضی اللہ عنہ ذہناً میرے مخالف ہیں، چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ کی اہمیت کے پیش نظر جہاں وہ ایک گونہ آپ رضی اللہ عنہ کے بارے میں مشوّش اور غیر مطمئن تھا، وہاں وہ اس قضیے کو خوش اسلوبی سے حل کرنے کا بھی خواہاں تھا۔ اور آپ رضی اللہ عنہ پر کوئی سختی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

یزید اب علی الاطلاق خلیفۃ المسلمین تھا، تقریباً 56 لاکھ مربع میل پر اس کی حکومت کا پرچم لہرا رہا تھا۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی ذہانت، سیاست اور محنت کی بدولت اسلامی قلمرو کو اس قدر وسعت ملی کہ جس کی مثال نہیں ملتی، اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اس میں امن و امان برقرار رہا، اور شورشیں دب گئیں۔ اور یہ امن و امان کی صورت تا حال برقرار تھی، سب لوگ ایک پرچم تلے جمع تھے، البتہ یزید کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی طرف سے خدشہ تھا اور وہ ظاہر ہے کیوں تھا؟ وہ نہیں چاہتا تھا کہ میری مملکت میں کوئی شورش یا ہنگامہ کھڑا ہو، اور یہ خواہش ہر حساس اور ذمہ دار حکمران کی ہوتی ہے اور اس میں کوئی برائی بھی نہیں ہے، تختِ خلافت پر متمکن ہونے کے بعد اسے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی جانب سے برابر تشویش اور پریشانی لاحق تھی۔ کیونکہ آپ رضی اللہ عنہ یزید اور اس کی حکومت کے حق

میں نہ تھے۔ البتہ یہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شرافت، آدابِ سیاست اور قواعد ملی کی پاسداری تھی، جو آپ نے حکومت وقت کے خلاف آوازہ بلند کیا، نہ جماعت سازی کی، نہ کوئی ہنگامہ اور نہ شورش برپا کی، اس کی کچھ بھی وجوہ ہوں بہر حال آپ نے ملکی امن وسکون پر کوئی آنچ نہ آنے دی، وہ لوگ جو آپ کو اکساتے تھے ان کے مشوروں پر کان نہ دھرے۔ اس بنا پر اگر آپ رضی اللہ عنہ کو "شہزادۂ امن" کہہ دیا جائے تو بھی بے جا نہ ہوگا۔ اگر حضرت حسن رضی اللہ عنہ شہزادۂ صلح تھے تو آپ بیشک "شہزادۂ امن" تھے۔ دونوں وحید العصر اور عظیم ولاثانی برادران، امن وصلح کے نقیب اور اخلاق وشرافت کے تاجدار تھے۔ (رضی اللہ عنہما)

مختصر یہ کہ یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بیعت نہ کرنے کی وجہ سے فکر مند تھا اور بڑا فکر مند۔ سارے حالات اس کے سامنے تھے۔ اسے عالی جناب حسین رضی اللہ عنہ کا خطرہ نہ تھا بلکہ پورے ملک کا خطرہ تھا۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ مدینہ میں قیام پذیر تھے، ولید بن عتبہ حاکمِ مدینہ نے یزید کی ہدایت کے بموجب حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بلایا، اور بیعتِ یزید کی بات کی، آپ رضی اللہ عنہ نے اس مسئلہ پر غور وفکر کے لیے مہلت چاہی، ولید نے مہلت دے دی۔[1]

اس سلسلے میں ہمیں ایسی کوئی مستند روایت نہیں ملی کہ جس میں یزید کی حکومت کی طرف سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر بیعت کے سلسلے میں تہدید، توبیخ، تذلیل یا تشدد کا ذکر ہو۔

[1] تاریخ طبری: 347/5.

چند اہم باتیں

یہاں چند باتیں ذہن میں رکھ لینی چاہئیں:

1. بعض واعظین اور ذاکرین نے لوگوں کے رونے رلانے کا سامان فراہم کرنے کے لئے مختلف واقعات گھڑے، کہانیاں تراشی اور مرثیے لکھے ہیں۔ آگاہ رہیں!! ان کہانیوں اور مرثیوں کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

2. اسلام نے شہداء پر رونے رلانے اور گریہ وبکا کی مجالس برپا کرنے کو ناپسند قرار دیا ہے۔ بلکہ ایسے مواقع پر ہمیشہ صبر و برداشت کی تلقین فرمائی ہے، لہٰذا ہمیں بھی صبر کی تلقین کرنی چاہیے اور صبر ہی سے کام لینا چاہیے۔ یہی اسوۂ اہل بیت رضی اللہ عنہم ہے۔ ہاں! اگر کبھی اندوہناک حالات پڑھ اور سن کر دل میں رقت پیدا ہو جائے اور آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئیں تو منع نہیں۔ البتہ ایام کی تعیین کے ساتھ گریہ وبُکا کرنے کے لئے مجالس ومحافل منعقد کرنا شریعت کے منشاء کے خلاف ہے۔ شریعت سے ان کا ثبوت لانا دور کی کوڑی لانے کے مترادف ہے۔

3. خلاف واقعہ باتیں بیان کرنے سے اصل واقعات بھی مشکوک ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا امر واقعہ کے الٹ باتوں کے بیان کرنے سے قطعی پرہیز کرنا ضروری ہے۔ واعظین وذاکرین[1] کرام کی خدمت میں گذارش ہے کہ وہ ہرگز جھوٹی گھڑی ہوئی باتیں بیان

---

[1] قرآن مجید نے تو ''ذاکرین وذاکرات'' کی اصطلاح ان مرد وخواتین کے لئے استعمال کی ہے جو اللہ تعالیٰ کا ذکر کریں مگر ہمارے ہاں یہ اصطلاح ان مرد وخواتین کے لیے استعمال ہونے لگی، جو کربلا والوں کے مرثیے پڑھیں۔

نہ کریں، نہ سنیں، نہ ان کی تشہیر واشاعت کریں۔ جو لوگ اس طرح کی کیسٹیں اور کتابیں پھیلاتے ہیں وہ نیکی کے نام پر گناہ کماتے ہیں۔ کیونکہ وہ سچ کا نام لے کر جھوٹ پھیلاتے ہیں۔ جو دوہرا گناہ ہے۔

4 ہم یزید کو عالی مقام حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے قطعاً بہتر یا برتر یا اشرف نہیں سمجھتے۔ اس بارے میں کسی کو شبہ نہیں ہونا چاہیے۔ ہمارے نزدیک سیدنا حسین رضی اللہ عنہ علم میں، عمل میں، فضل میں، تقویٰ میں، عبادت میں، انابت میں، حسب میں، نسب میں، طہارت میں، خلق میں، سخاوت میں، غرض ہر اعتبار سے یزید سے بہت فائق، بہت برتر اور بہت اعلیٰ تھے۔ یزید کو ان سب باتوں میں ان سے کوئی نسبت ہی نہ تھی۔ اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ یزید کے والد حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے اور سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا یزید کی والدہ میسون رحمہا اللہ سے بہر پہلو ہزار درجہ افضل و اعلیٰ تھیں۔ اگر کوئی شبہ ہو تو ہماری شہرۂ آفاق کتاب، سیرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کا مطالعہ فرمائیں۔

5 ہمارا اپنا موقف چونکہ بہر پہلو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی افضلیت کا ہے، بنا بریں ہم یہ رائے رکھتے ہیں کہ اگر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ ملکی امارت کے لئے بجائے یزید کے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا انتخاب فرما لیتے، اُس وقت کا تو علم نہیں لیکن شاید آئندہ کے لئے بہتر ہوتا۔ اور ہو سکتا ہے پھر امت محمدیہ میں شیعہ سُنّی کے نام سے یہ دراڑ پیدا نہ ہوتی۔ اور دیگر فرقہ بندیاں وجود میں نہ آتیں۔ یہ "شاید" کا لفظ ہم نے اس لئے استعمال کیا ہے کہ حقیقت حال واستقبال (اس وقت اور آئندہ) اللہ ہی صحیح جانتا ہے کہ کیا ہوتی، لیکن اپنی رائے اپنی رائے ہی ہوتی ہے اس میں دونوں پہلو ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے کام بھلے اور مبنی بر حکمت ہوتے ہیں وہ جو حکم جاری و نافذ فرماتا ہے ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ حقیقت میں وہی بہتر ہوتا ہے۔ بہر حال اپنی آزادانہ رائے کا ہر ایک کو حق حاصل ہے اور وہ ہم نے ہر طرح کے فرقے بازی اور دھڑے بندی سے

بالا ہو کر دے دی ہے۔ اسی طرح یزید کو اخلاقی جرأت کا یادگار مظاہرہ کرتے ہوئے اسلامی قلمرو ہم سب کے محبوب اور واجب الاحترام عالی مقام حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی خدمتِ عالیہ میں پیش کر دینا چاہیے تھا۔ مگر اس نے یہ پیش نہ کر کے کشادہ دلی و عالی ظرفی کا ثبوت بہم نہ پہنچایا۔ گمانِ غالب ہے اگر یزید اسلامی قلمرو آپ رضی اللہ عنہ کی خدمت اقدس میں پیش کرتا تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ جیسا بلند حوصلہ، عالی ظرف اور مخدوم المسلمین عبقری اس کی یہ پیشکش قبول نہ فرماتا۔ اور یزید پورے اطمینان سے خلیفہ ہوتا، اس طرح فساد امت ہوتا، نہ مسلمانوں میں اس طرح کا بٹوارہ قائم ہوتا۔ نہ سانحہ کربلا وجود میں آتا۔ نہ منافقین کو اسلام کا لبادہ اوڑھ کر مسلمانوں کی صفوں میں گھسنے کا موقع ملتا۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ اس پر بھی نزاع نہیں کرنی چاہیے۔ کیونکہ اصل اللہ کی مشیت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ بصورت دیگر نہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کو شہادت ملتی۔ نہ مسئلہ توحید نکھرتا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی سی شہادت شاید ہی کسی اور کو نصیب ہوئی ہوگی۔ اور مسئلہ توحید جو دشتِ کربلا میں نکھرا شاید ہی کہیں اور نکھرا ہوگا۔ معرکہ کربلا کا مقصد و فلسفہ بڑا اعلیٰ اور بڑا گہرا ہے اس کا آگے بیان ہوگا۔ بہر حال کسی بات پر اب نزاع نہیں ہونی چاہیے۔ اس سے سوائے دوری اور نفرت کے کچھ حاصل نہیں۔

مختصر یہ کہ اس نزاع کا فی الوقت کوئی فائدہ ہے نہ مقصد۔ اصل اللہ کی مشیئت کارفرما تھی جسے کچھ اور ہی منظور تھا بصورت دیگر نہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کو شہادت کا لازوال شرف ملتا، نہ مسئلہ توحید نکھرتا۔ نہ جھوٹے جانثاروں کی قلعی کھلتی، نہ فلسفہ شہادت کا راز آشکارا ہوتا۔ نہ شہادت حسین رضی اللہ عنہ کے دور رس اسباق و دروس کھلتے۔ نہ وفا کی کلیاں چٹکتیں، نہ محبت کے پھول کھلتے نہ تاریخ اسلام کی فضاؤں میں المناک علَم لہراتا۔ نہ ملکی سیاست کی لہروں میں یہ زیر و بم اور ارتعاش پیدا ہوتا۔ نہ مذہب کے نام پر باہم جھگڑے ہوتے۔

6 واقعات کو دل میں کسی کی دشمنی اور دوستی لے کر نہ پڑھا کریں بلکہ امر واقعہ اور حقیقت کی آنکھ سے پڑھا کریں اور جہاں ادب واحترام اور عقیدے کے تقاضے مجروح ہوتے ہوں وہاں زیادہ احتیاط سے کام لیا کریں۔ ہمیں یہی حکم ہے، ویسے یہ کام ہے بے حد مشکل، مگر اسی سے مطالعہ نتیجہ خیز ہوتا ہے، اور اسی سے دل و دماغ کو جلا ملتی ہے۔ ورنہ سوائے تضییعِ وقت اور نقصانِ بصر کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

7 عقیدہ سب سے اہم چیز ہے۔ اس کا حد سے زیادہ خیال رکھیں۔ لیکن اس میں شرط یہ ہے کہ عقیدہ قرآن وسنت کے عین مطابق ہو۔ جہاں اشکال نظر آئے اپنی عقل اور علم و مطالعہ پر زیادہ اعتماد کرنے کے بجائے فورا راسِخِيْنَ فِي الْعِلْمِ شان کے حامل، محتاط اور عدل گستر علماء وفضلاء سے رابطہ قائم کریں۔ اس طرح آدمی زَیغ اور گمراہی سے بچ جاتا ہے۔ جو ایک بہتر راہ ہے۔ اللہ کی توفیق سے حقائق و اعتدال پسند لوگ ادھر آ بھی رہے ہیں۔ جو لوگ رفض وخروج کا شکار ہو کر دونوں انتہاؤں پر پہنچے ہوئے ہیں انھیں ضدّ، تعصُّب اور فرقہ واریت کے عفریت سے دامن کشاں رہ کر حقیقت و اعتدال پسندی سے کام لینا چاہیے۔ کیونکہ ایک مخلص و قانت مومن کے شایان شان یہی ہے۔ ایسے خوش نصیب لوگ ناپید نہیں ہو گئے اس دور میں بھی موجود ہیں۔

باب 6:

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی مکہ روانگی

حضرت حسین رضی اللہ عنہ جب حاکم مدینہ ولید کی مجلس سے فارغ ہو کر واپس گھر تشریف لائے تو رات ہو چکی تھی۔ اگلے روز صبح ہونے سے قبل اندھیرے ہی میں آپ رضی اللہ عنہ مدینہ چھوڑ کر سوئے مکہ روانہ ہو گئے، مگر حاکمِ مدینہ نے اس بات کا خاص نوٹس نہ لیا۔[1]

یزید کو آپ رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ تمام خبریں پہنچ رہی تھیں۔ وہ آپ رضی اللہ عنہ کے احترام کی بنا پر آپ رضی اللہ عنہ پر ہاتھ ڈالنا نہیں چاہتا تھا، یزید کو آپ رضی اللہ عنہ کی بیعت کی بھی بے شک فکر تھی مگر اسے اس سے بڑھ کر یہ فکر تھی کہ کہیں میری حکومت میں آپ رضی اللہ عنہ کی وجہ سے کوئی خوفناک ہنگامہ نہ کھڑا ہو جائے جس سے ملک کا بٹوارا ہو جائے، اور بیعت پر وہ اسی لیے زور دیتا تھا کہ آپ رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لینے کے بعد یہ خطرہ باقی نہیں رہے گا۔ پھر ملکی پُر امن فضا میں بگولہ اٹھے گا، نہ کوئی ارتعاش پیدا ہو گا۔ نہ آندھی چلے گی، نہ جھکڑ اٹھے گا۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ مکہ پہنچ گئے۔ وہاں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کو کافی قوت حاصل تھی۔ مگر وہاں پہنچ کر بھی آپ قطعی فیصلہ نہ کر پائے کہ یہاں رہوں یا کہیں اور جاؤں۔ دوسری طرف آپ فتنہ وفساد سے بھی بچتے تھے اور ارشاد قرآنی آپ کے سامنے تھا:

﴿وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ﴾

---

[1] تاریخ طبری: 347/5.

"اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا۔"[1]

ادھر حکومت وقت اور اس کی طاقت اور اس کی طرف سے اپنی راہ میں رکاوٹ حائل ہو جانے کا بھی خیال تھا کہ اس سے کوئی محاذ آرائی کی صورت نہ نکل آئے۔ چونکہ آپ رضی اللہ عنہ نے اپنے پروگرام سے کسی قابل ذکر شخص کو آگاہ نہیں فرمایا تھا، اور نہ کسی اہم بزرگ یا بھائی سے مشورہ لیا تھا، اس لئے کسی کو کچھ بتاتے بھی نہ تھے کہ کوئی مجھے سوئے کوفہ جانے سے روک نہ دے۔ بہت سے اجلّہ اعیان وانصار اور آپ کے خاندان کے سربرآوردہ بزرگوں نے آپ رضی اللہ عنہ کے ارادۂ سفر کا پتہ چلنے پر آپ کو اس پُر خطر سفر پر نکلنے سے روکا تھا۔ غرض آپ عجیب شش و پنج میں مبتلا تھے کہ کیا کیا جائے، کیا نہ کیا جائے۔

① البقرة: 205.

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے عزائم

جیسا کہ پیچھے بتایا جا چکا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ یزید کی بیعت کرنا نہیں چاہتے تھے، کیونکہ آپ رضی اللہ عنہ اپنے آپ کو خلافت کا زیادہ حقدار سمجھتے تھے۔ ہر شخص کا ایک مؤقف ہوتا ہے، یہ آپ کا ایک مؤقف تھا۔ لیکن فضا آپ کے لیے ناساز گار اور ناموافق تھی، اس لیے کہ یہ آپ کی اپنی ذاتی رائے تھی یہ اسلامی اور شرعی نکتہ نگاہ نہ تھا۔ اور اس وقت آپ متفرد الرائے تھے۔[1] کیونکہ خواص وعوام سب ادلہ شرعیہ اور رائے عامہ کی بنا پر یزید کو حاکم مان چکے تھے، اور ان میں کوئی بھی اس حکومت کے اندر کسی نئی حکومت کے حق میں نہ تھا، وہ ایک حکومت کے اندر ایک اور حکومت قائم کرنے کو شرعاً جائز نہیں سمجھتے تھے، اور ایسی حکومت کو امت کی سالمیت کے منافی جانتے تھے، بلکہ وہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو سمجھاتے تھے کہ آپ یزید کی بیعت کر لیں، کیونکہ اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ اور نئی حکومت بنانے کے بجائے اسی حکومت کے قیام و اجراء میں بھلائی ہے، مگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ برابر اپنے مؤقف پر قائم رہے۔ آپ کے عزائم میں کوئی تبدیلی یا لچک واقع نہ ہوئی۔

---

[1] مطلب یہ کہ کسی ایک ہی خاندان میں خلافت کا اجراء ضروری جاننا۔ اسلامی طریقِ انتخاب کے لیے ہماری مایہ ناز کتاب ''خلافت راشدہ'' کا مطالعہ فرمائیں۔ معلوم ہے صحابہ رضی اللہ عنہم میں بھی اِکّا دُکا مختلف مسائل میں تفردات پائے جاتے تھے مثلاً: حضرت ابو ذر غِفاری، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت مقداد رضی اللہ عنہم وغیرھم۔ اس سے کسی بزرگ کی عظمت میں فرق نہیں آتا۔

صحابہ وتابعین جنھوں نے یزید کی بیعت کی ان کے ایمان پر بحث کرنا اور انھیں ہدف تنقید بنانا ہرگز روا نہیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ وہ پکے مومن تھے، وہ اللہ کے فضل سے جھک سکتے تھے نہ بِک سکتے تھے، انھوں نے اگر یزید کی حکومت کو تسلیم کیا تھا تو شریعت کے مطابق تسلیم کیا تھا، کیونکہ ان کے سامنے ارشادات نبوی تھے، مثلاً:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

«إِنِّي سَمِعْتُ النَّبِيَّ يَقُولُ: يُنْصَبُ لِكُلِّ غَادِرٍ لِوَاءٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَإِنَّا قَدْ بَايَعْنَا هٰذَا الرَّجُلَ عَلٰى بَيْعِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ......»

''میں نے حضرت رسولِ کریم ﷺ سے سُنا کہ قیامت کے روز غدر (دھوکا) کرنے والے کے لیے ایک جھنڈا کھڑا کیا جائے گا، بلاشبہ ہم نے اس شخص (یزید) کی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لیے بیعت کی ہے۔ اور میں بیعت کر لینے کے بعد اس شخص کے ساتھ برسرِ پیکار ہو جانے کو سب سے بڑا غدر (دھوکا) سمجھتا ہوں اور اگر کسی نے بیعت کر کے توڑ دی، میرا اس سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔''[1]

آنحضرت ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے، حضرت ابوعبدالرحمٰن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں:

«سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ: مَنْ خَلَعَ يَدًا مِنْ طَاعَةٍ لَقِيَ اللّٰهَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ، لَا حُجَّةَ لَهُ، وَمَنْ مَاتَ وَلَيْسَ فِي عُنُقِهِ بَيْعَةٌ مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً»

''میں نے آنحضرت ﷺ سے سُنا ہے کہ جس شخص نے اطاعت کا عہد کر کے

[1] صحیح البخاری، الفتن، باب إذا قال عند قوم شيئاً ثم خرج فقال بخلافه، حديث: 7111

توڑا (یعنی بیعت کر کے توڑی) وہ روزِ محشر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یوں حاضر ہو گا کہ اس کے پاس کوئی حجت نہ ہوگی، اور جو اس حال پر دنیا چھوڑ گیا اور کسی کی بیعت نہ کی تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔''[1]

جن کثیر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور لاتعداد تابعین عظام رحمہم اللہ نے خلیفۂ وقت یزید کی بیعت کی، انھوں نے صحیح اور صریح احکام شریعہ کے مطابق بیعت کی، انھوں نے کسی خوف یا کسی لالچ کی وجہ سے بیعت نہیں کی، جیسا کہ بعض کم علم لوگ کہہ دیتے ہیں۔ ان کے متعلق نعوذ باللہ بزدل، لالچی، منافق یا فاسق وغیرہ ہونے کا گمان صحابہ رضی اللہ عنہم اور اولیائے امت رحمہم اللہ کی توہین پر مبنی ہونے کے علاوہ امر واقع کے بھی سراسر خلاف اور حد درجہ گمراہی ہے۔ اور ان کی شان میں ہلکے سے ہلکا ناروا جملہ استعمال کرنا بھی براہِ راست ان کے اخلاص ووفا اور ایمان وایقان پر حملہ کرنے کے ہم معنی ہے اور ان کے تقویٰ وطہارت پر شک کرنے کے مترادف، جو بہت بڑا گناہ اور صریح کفر وارتداد کے مترادف ہے۔ کوئی اہل سنت ان باتوں کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

باقی رہا یہ سوال کہ کیا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے سامنے یہ ارشادات نبوی نہ تھے جو دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے سامنے تھے؟ اگر تھے تو انھوں نے ان پر کیوں عمل نہ فرمایا؟...... تو گزارش ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اس وقت آپ رضی اللہ عنہ کے ذہن میں اس قسم کے ارشاداتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہوں، یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص کو ہر مسئلہ ہر وقت مستحضر رہے۔ حدیث کے مطابق بڑے بڑے صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی کئی مسئلے اوجھل رہے، جو بعد میں انھیں معلوم ہوئے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کو یہ ارشادات معلوم ہوں، مگر آپ کے نزدیک ان کی توجیہ کوئی اور ہو، اور آپ رضی اللہ عنہ نے از طریق اجتہاد اُس توجیہ کو بہتر خیال کیا ہو، جس کو اختیار کیے ہوئے تھے، بہر حال یہ صحابہ رضی اللہ عنہم اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے

[1] صحیح مسلم، الإمارة، باب وجوب ملازمة جماعة المسلمین ......، حدیث: 1851.

مابین اجتہادی اختلاف تھا۔ اس میں اکابرین میں سے کسی کو مطعون قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگر غلطیوں کی بنا پر ان پر الزام دھریں گے تو پھر کوئی صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے بچے گا نہ اہل بیت رضی اللہ عنہم میں سے محفوظ رہے گا، سب ہی نعوذ باللہ مطعون قرار پائیں گے۔ جس کا سوائے اختلاف وانتشار اور سر پھٹول وفساد کے کوئی حل نہ نکل سکے گا۔ اور مسئلہ بڑی گھمبیر شکل اختیار کر کے لے ڈوبے گا۔

بعض لوگوں نے کچھ راہیں نکالنے کی کوشش کی ہے مگر ان سے اور راہیں نکل آتی ہیں جیسے ''امام پاک اور یزید پلید'' اور ''یزید کا کردار'' اور ان کے ہمنوا اور ان کے برعکس دوسرے مصنّفین کی متعدد کتب ہیں جنہیں پڑھ کر فَرَّمِنَ الْمَطَرِ وَقَامَ تَحْتَ الْمِيْزَابِ (بارش سے بھاگا کہ محفوظ ہو جاؤں مگر پر نالے کے نیچے جا کھڑا ہوا) کی مثل یاد آ جاتی ہے۔ اور مسئلہ جہاں تھا وہیں رہا۔ بلکہ ون وے گاڑی چلانے سے اور بگڑ گیا۔ اس لئے بہتر مؤقف یہی ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایسی فکر کو ان کے اجتہاد پر موقوف کیا جائے تاکہ مسئلہ بھی حل ہو جائے، اور ان کا مقام رفیع بھی متأثر نہ ہو۔ جوش میں آ کر ہرگز جلدی نہ کی جائے، ورنہ نقصان ہی نقصان ہے۔ جس سے دین تباہ و برباد اور عقیدہ خراب ہو کر انجام کار خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ کے سوا کچھ نہ ملے گا۔

یہاں ایک اور سوال بار بار اُٹھتا ہے کہ اگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے نزدیک یزید کی حکومت باطل تھی تو آپ نے اس کا برملا اعلان کیوں نہ فرمایا؟ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اس کے خلاف جہاد کیوں نہ کیا؟ اور یزید کے خلاف مجاہدینِ اسلام کی جماعت کیوں نہ تیار کی؟ جو لوگ آپ کو سفر کوفہ پر جانے کا مشورہ دے رہے تھے آپ نے انھیں حکومت یزید کا مقابلہ کرنے کا مشورہ کیوں نہ دیا؟ ہر بات ان سے کیوں چھپاتے رہے؟ یہ سوالات شاید بعض کے نزدیک وزنی نہ ہوں۔ مگر پھر بھی ان پر غور کر لینے میں کوئی نقصان نہیں۔

جہاں تک غور کیا ہے معلوم یہ ہوتا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کوئی ایسی جگہ چاہتے تھے، جو اُن کے مزاج اور خواہش کے مطابق ہو، کیونکہ موجودہ حکومت سے ٹکر لینا اور جملہ اہل اسلام کے موقف کے خلاف قدم اٹھانا خصوصاً جبکہ وہ اپنے پاس محکم دلائل بھی رکھتے ہوں جائز تھا نہ مناسب۔ حالات دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اوّل آپ یہ چاہتے تھے کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے بعد بجائے یزید کے خود سریر آرائے خلافت ہوں کیونکہ آپ خلافت کو اپنا استحقاق سمجھتے تھے۔ جیسا کہ قبل ازاں ہم بتا چکے ہیں۔ اور اگر یہ کسی طرح ممکن نہ ہو، تو پھر آپ یہ چاہتے تھے کہ کسی ایسی جگہ کو تلاش کروں کہ جہاں کا ماحول میرا زیادہ سے زیادہ ہمنوا اور ہم خیال ہو، اور وہاں اس موجودہ حکومت سے بہتر اور اپنی خواہش کے مطابق علیٰ منہاج النبوّۃ حکومت قائم کروں، اور بظاہر اس میں کوئی برائی بھی نہ تھی، بلکہ نیّت اور جذبات کے اعتبار سے قابل قدر بات تھی۔ لیکن حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے لیے پریشان کُن بات یہ تھی کہ وہ جگہ ہو تو کونسی ہو، کیونکہ ہر جگہ یزید کی حکومت قائم ہو چکی تھی، جدھر جاتے بنو امیہ کا پرچم لہراتا ہوا نظر آتا تھا۔ آ جا کر ایک کوفہ ہی تھا جہاں آپ کی نظر پڑتی تھی۔ مگر وہ بھی غدّاروں اور بے وفاؤں کی بستی دکھائی دے رہا تھا۔ آپ کو ان کی وفا پر اعتماد نہ تھا۔ جب ہی تو پہلے برادرِ عم زاد مسلم بن عقیل رحمہ اللہ کو بھیجا۔ اور کوفہ والوں نے آپ سے قبل آپ کے والد گرامی اور برادرِ محترم سے جو رویہ برتا وہ بھی آپ کے سامنے تھا۔ مختصر یہ کہ آپ گومگو کی کیفیت سے دوچار تھے۔

سُفرائے یزید

اُدھر یزید اپنی جگہ پریشان تھا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو کس طرح سمجھایا جائے کہ آپ رضی اللہ عنہ اپنے موقف میں تبدیلی پیدا کرلیں تا کہ مجھے کسی الجھن اور دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ وہ آپ رضی اللہ عنہ کی عظمت و جلالت کے پیشِ نظر آپ رضی اللہ عنہ سے سخت رویہ اختیار کرنا نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی بھی ہدایت تھی کہ ''حسین رضی اللہ عنہ کا احترام بجا لانا، یہ نہ صرف حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے ہیں بلکہ ہمارے قریبی بھی ہیں۔'' خود امیر معاویہ رضی اللہ عنہ حسن و حسین رضی اللہ عنہما کو بے حد عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے...... یہ تو والد گرامی کی ہدایت تھی مگر یزید خود بھی انھیں احترام کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور ان پر ہرگز ہاتھ ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ کے علاوہ کوئی اور ہوتا تو موجودہ حکومت کی طرف سے شاید کوئی سختی روا رکھی جاتی۔ بہر کیف یزید نے تدبر سے کام لیا اور آپ رضی اللہ عنہ پر کوئی سختی روا نہ رکھی، البتہ اپنے سفیروں اور نمائندوں کو یہ ہدایت دے کر روانہ کیا کہ وہ آپ رضی اللہ عنہ پر نظر رکھیں کہ آپ کیا کر رہے ہیں اور آپ کے کیا عزائم ہیں۔ اور جہاں تک ہو سکے آپ رضی اللہ عنہ کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کریں تا کہ معاملہ افہام و تفہیم ہی سے سُلجھ جائے اور حکومت کے لیے کوئی مسئلہ کھڑا نہ ہو۔

اہلِ کوفہ کے خطوط

کوفہ عراق کا اہم شہر تھا۔ سرسبز و شاداب اور خوبصورت علاقہ تھا، یہاں رونق بھی کافی تھی، معمور و آباد تھا۔ خلیفۂ رابع حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دَور میں دارالخلافہ رہ چکا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تینوں خلفائے راشدہ رضی اللہ عنہم کے ادوار میں مدینہ منوّرہ دارالخلافہ تھا مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے کوفے منتقل فرمادیا۔ اہل علم نے اس کی جو وجوہات بیان کی ہیں ان میں ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ یہاں عقیدت کیشانِ اہلِ بیت رضی اللہ عنہم کی بھاری اکثریت تھی۔ دلدادگانِ خانوادۂ رسول اور محبانِ حسین رضی اللہ عنہ کثیر تعداد میں تھے۔ علاوہ ازیں یہاں کے لوگ دین پسند، عبادت گزار اور علم دوست تھے لیکن دل خراش پہلو یہ تھا کہ ان کے خمیر میں تلوّن مزاجی، قدر ناشناسی اور بے وفائی بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی، جس کی بدولت ساکنانِ کوفہ کی شہرت اچھی خاصی متاثر تھی۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جس قدر فتنے سرزمین کوفہ سے اٹھے، اتنے فتنے اور کسی جگہ سے نہ اُٹھے۔ کوفہ وہی نجدِ عراق ہے جس کی بابت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا:

«هُنَاكَ الزَّلَازِلُ وَالْفِتَنُ»

''یہاں روح فرسا حوادث اور بھیانک فتنے جنم لیں گے۔''[1]

---

[1] صحيح البخاري، الفتن، باب قول النبي ﷺ «الفتنة من قبل المشرق» حديث: 7094.

حضورِ اکرم ﷺ کی پیشگوئی حرف بحرف پوری ہوئی، چنانچہ کوفہ باوجود علمی اور دینی مرکز قرار پانے کے فتنوں کی آماجگاہ بن گیا۔ اور یہاں حضرت علی کرم اللہ وجھہ کی المناک شہادت سے ایسی داستان خونچکاں شروع ہوئی جو ختم نہ ہوئی۔ خوب یاد رہے کہ نجد یہی کوفہ کا علاقہ ہے، حجاز کا علاقہ نہیں۔ حدیث مبارکہ میں اسی نجد عراق کی پیش گوئی وارد ہوئی ہے۔[1]

آپ پیچھے پڑھ چکے ہیں کہ کوفہ والوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو پیغامات بھیجے کہ آپ رضی اللہ عنہ یہاں تشریف لے آئیں، ہمارا کوئی امام نہیں، ہم آپ رضی اللہ عنہ کے عقیدت مند اور غلام ہیں، ہم آپ رضی اللہ عنہ کو امام بنالیں گے، ہم آپ رضی اللہ عنہ کی امامت پر متفق ہیں۔ انھوں نے خطوط اور وفود بھیج کر ہر ذریعے سے آپ رضی اللہ عنہ کو پُر زور دعوت دی۔ شیعہ مجتہد ملّا باقر مجلسی تحریر کرتا ہے:

''جب اہلِ کوفہ کو یہ خبر پہنچی کہ حضرت حسین علیہ السلام مکہ معظّمہ میں تشریف فرما ہیں، تو شیعانِ کوفہ سلیمان بن صرد خزاعی رضی اللہ عنہ کے گھر میں جمع ہوئے۔ اور دوبارہ معاویہ رضی اللہ عنہ کے انتقال اور یزید کی بیعت پر بات چیت کی...... سلیمان نے کہا۔ کہ حضرت حسین بیعت یزید سے انکار کر گئے ہیں، اور تم ان کے اور ان کے پدر بزرگوار کے شیعہ ہو، اگر ان کی مال و جان سے مدد کر سکو تو بذریعہ خطوط انھیں یہاں آنے کی دعوت دے دو، شیعوں نے کہا: جب امام حسین علیہ السلام اس شہر کوفہ میں قدوم میمنت لزوم فرمائیں گے، تو ہم سب اخلاص و وفا سے بیعت کریں گے۔''[2]

---

[1] جو لوگ امام محمد بن عبدالوہاب نجدی کے بغض و عناد اور خواہ مخواہ کی دشمنی کی بنا پر حجاز یا حوالیٔ حجاز، الریاض سے لے کر مکہ و مدینہ کو نجد کہتے ہیں وہ صحیح نہیں کہتے۔ اس کی تائید حدیث نبوی کرتی ہے نہ تاریخ اسلام۔ اس سلسلے میں ہماری معتبر مستند اور ضخیم زیر ترتیب کتاب ''تحریک وہابیت'' کا مطالعہ بڑا مفید رہے گا۔ [2] جلاء العیون: 340.

چنانچہ ان عقیدت گزارانِ حسین رضی اللہ عنہ نے بمطابق ''جلاء العیون'' حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بارہ ہزار خطوط لکھے۔ اور بعض نے 18 ہزار بھی بتائے ہیں۔ اور وفود اس کے علاوہ ہیں۔ اہلِ کوفہ کا جو آخری خط حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پہنچا اس کا مضمون یہ تھا:

''جمیع شیعان مومنین و مسلمین اہلِ کوفہ کی طرف سے بخدمت حضرت حسینؑ بن علیؑ بن ابی طالبؑ[1] ہے،...... واضح ہو کہ اس وقت ہمارا کوئی امام و پیشوا نہیں، پس آپ ہماری طرف توجہ فرمائیے اور ہمارے شہر میں قدم رنجہ فرمائیے، ہم سب آپ کے مطیع ہیں، اور نعمان بن بشیر حاکم کوفہ نہایت ذلیل و خوار دار الامارت میں بیٹھا ہے اور ہم جمعہ اور عیدین کی نماز وہاں پڑھنے نہیں جاتے۔''[2]

یہ نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما صحابی رسول رضی اللہ عنہ تھے جنھیں شیعہ مجتہد ''ذلیل و خوار'' کہہ رہا ہے۔ العیاذ منہ۔ یہی وہ شیعی فکر ہے جس سے ہمیں حد درجہ اختلاف ہے۔

ادھر حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی یہاں سے دل برداشتہ تھے اور آپ رضی اللہ عنہ بھی ایسی ہی جگہ کے آرزو مند تھے کہ جہاں خواہش اور طبیعت کے مطابق پُر امن و پُرسکون ماحول ہو، البتہ یہ بات ہماری سمجھ سے بالا ہے کہ عالی مقام حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اہلِ کوفہ کی پوری تاریخ کو جاننے اور سب دوستوں اور عزیزوں کے روکنے کے باوجود کوفہ جانے کا کیوں ارادہ فرما لیا؟ تجربہ، مشاہدہ، مشورہ کوئی بھی آپ رضی اللہ عنہ کے اس سفر کو صحیح نہیں سمجھتا تھا، مگر حیرت ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ جیسے دُور اندیش جہاں دیدہ اور زیرک نے اسے کیسے صحیح سمجھ لیا؟ آہ سچ ہے:

---

① ابوطالب، حضور ﷺ کے غمگسار چچا تھا۔ لیکن آنحضور ﷺ کی بڑی خواہش کے باوجود اسلام قبول نہ کیا۔ حضور اکرم ﷺ اور آپ کے دین کو سچا جاننے کے باوجود حلقہ بگوش اسلام نہ ہو سکے۔

② جلاء العیون، ص: 430.

؎ بزور بازوئے تقدیر، تدبیریں نہیں چلتیں

یہ تقدیر ہی تھی جو آپ رضی اللہ عنہ کو جوار رسول مدینہ منورہ اور شہر امن مکہ معظمہ اور اس کے قابلِ قدر باشندوں کو داغ مفارقت دے کر کربلا جیسے تیرہ و تاریک اور اداس و ویران میدان میں کھینچ کر لے جا رہی تھی۔ سچ کہا قرآن مجید نے:

﴿وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾

''اللہ تعالیٰ اپنے امر پر غالب ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔''[1]

اگر گہرائی میں اتر کر دیکھیں تو نظر آئے گا کہ اس میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا کوئی قصور نہیں تھا، اللہ کا حکم اور نوشتۂ تقدیر ہی یہی تھا، نوشتۂ تقدیر کو بھلا کون بدل سکتا تھا؟

مختصر یہ کہ آپ رضی اللہ عنہ کو پیغامات اور دعوت نامے برابر وصول ہوتے رہے، کہ جن میں قسمیں کھا کھا کر آپ رضی اللہ عنہ کو وفاداری اور جاں نثاری کا یقین دلایا گیا۔

کہا جاتا ہے کہ کئی تھیلے ایسے خطوط سے بھر گئے اور ان کی تعداد بھی سینکڑوں ہزاروں تک پہنچتی تھی جن کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے محفوظ فرما لیا تھا۔ تاکہ بوقت ضرورت انھیں دکھائے جا سکیں۔ اور اس سے یہ بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو ان پر کتنا اعتماد تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے ان کے خطوط بطور ثبوت سنبھال رکھے تھے کہ خبر نہیں یہ بے وفا اور جھوٹے کب منحرف ہو جائیں۔

[1] یوسف 12:21۔

مسلم بن عقیل کی روانگی

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اہلِ کوفہ کے خطوط پڑھے تو آپ رضی اللہ عنہ نے فی الحال خود جانا بہتر نہ سمجھا۔ اور یہ مناسب خیال کیا کہ تحقیق حال اور حصولِ معلومات کے لیے کسی اور شخص کو بھیجا جائے، اور یہ آپ رضی اللہ عنہ نے بہت اچھا کیا۔ چنانچہ جو آدمی کوفہ سے خطوط اور پیغامات لے کر آئے تھے ان کے ہمراہ آپ رضی اللہ عنہ نے اپنے برادرِ عم زاد جناب مسلم بن عقیل کو ایک مکتوب دے کر بھیج دیا۔ خط میں آپ رضی اللہ عنہ نے لکھا کہ:

"آپ لوگوں کے خطوط مجھے مل گئے ہیں۔ میں آپ کے پاس اپنے چچیرے بھائی مسلم بن عقیل کو بھیج رہا ہوں۔ یہ میرے خاص آدمی ہیں۔ میں نے ان سے فہمائش کی ہے کہ کوفہ اور اہلِ کوفہ کے موجودہ درست حالات سے مجھے اطلاع دیتے رہیں، اگر فی الواقع وہاں کے عوام و خواص کے وہی عزائم اور وہی خیالات ہیں جو خطوں میں تحریر کیے گئے ہیں، تو مجھے کسی وقت حاضر ہونے میں کوئی عذر نہ ہوگا۔ اور میں امید رکھتا ہوں کہ آپ لوگوں نے یہ فیصلہ غور و پرداخت سے سوچ سمجھ کر کیا ہوگا، لیکن پھر بھی آپ لوگ اس نازک اور اہم مسئلہ پر مزید غور کر لیں اور میرے فرستادہ بھائی مسلم بن عقیل سے تعاون کر کے ان کو ہر قسم کی معلومات حاصل کرنے میں مدد دیں۔"[1]

---

(1) تاریخ الطبري: 347/5، والبداية والنهاية: 154/8 مختصراً، والكامل لابن الأثير: 267/3

حضرت مسلم بن عقیل رحمہ اللہ کا ورودِ کوفہ

مسلم بن عقیل مکہ سے روانہ ہو کر مدینہ منورہ پہنچے۔ مسجد نبوی میں نماز ادا کی۔ چونکہ راستہ سے ناواقف تھے اس لیے بڑی مشکل اور مصیبت سے کوفہ پہنچے۔ اہلِ کوفہ کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا خط پڑھ کر سنایا اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے لئے بیعت لینے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ خبر سنتے ہی لوگ جوق در جوق بیعت کے لیے آنے لگے۔ ایک آدھ روز میں اٹھارہ ہزار آدمیوں نے بیعت کر لی۔ اور چند روز میں بیعت کنندگان کی تعداد تیس ہزار سے بھی زائد ہو گئی۔ تمام لوگوں نے اپنے اُس عہد و پیان کو دُہرایا جو انھوں نے خطوط میں کیا تھا اور حضرت مسلم بن عقیل کو ہر طرح کی وفاداری کا یقین دلایا۔[1]

کوفہ کے امیر ان دنوں نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ صحابیِ رسول تھے جو بہت متحمل مزاج اور عاملِ قرآن و سنت تھے۔ انھوں نے مسلم بن عقیل کو بیعت لیتے دیکھا اور اہلِ کوفہ کی رائے عامہ معلوم کی تو سختی سے مزاحمت نہ کی۔ اور نرمی سے لوگوں کو سمجھا دیا کہ اس طرح فتنہ و فساد پیدا ہونے اور مسلمانوں کا خون بہنے کا اندیشہ ہے اور احتیاط سے کام لینے کی تلقین کی۔ لیکن عبداللہ نامی ایک شخص جو بنو امیہ کا بڑا حامی اور خیر خواہ تھا، اس نے فوراً امیر یزید کو مطلع کیا کہ مسلم بن عقیل یہاں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے لیے بیعت

---

① تاریخ الطبري: 5/347-348، و البداية والنهاية: 8/154.

لے رہے ہیں اور تمھارے خلاف بڑا پروپیگنڈا کر رہے ہیں۔ اور یہاں کے سربرآوردہ اشخاص بھی ان کے ہمراہ سرگرم عمل ہیں۔ اور نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کسی قسم کی مزاحمت نہیں کرتے۔ وہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور اہلِ بیت کے معتقد و ہمنوا معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں فوراً کسی جابر اور زبردست آدمی کو متعین کیا جائے، ورنہ حالات قابو سے باہر ہو جائیں گے۔[1]

یہاں ابنِ اثیر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اس وقت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ نے تھوڑا سخت حکم نامہ جاری کیا اور کہا کہ جس نے یزید کی بیعت توڑی، میں تلوار سے اسے سیدھا کر دوں گا، لیکن کچھ اور لوگوں نے بھی یزید کو لکھا کہ یہاں کے حالات بگڑ رہے ہیں اور نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی مداہنت کی وجہ سے اختلافات بڑھنے اور شیرازہ منتشر ہونے کا اندیشہ ہے، نیز یہ تفصیلات بھی لکھیں کہ مسلم بن عقیل کی سرگرمیاں تیز تر ہو رہی ہیں، حالات پر اس وقت قابو پایا جا سکتا ہے، ورنہ خطرہ ہے کہ حالات دگرگوں ہو جائیں۔[2]

---

① الكامل لابن الأثير: 267/3، وتاريخ الطبري: 348/5، البداية والنهاية: 154/8. ② الكامل لابن الأثير: 267/3.

عبیداللہ بن زیاد کا تقرر

جب یزید کو یہ خطوط موصول ہوئے تو اسے تشویش ہوئی کہیں شورش اُٹھ کھڑی نہ ہو اور پوری اسلامی مملکت کا نظام تہ و بالا نہ ہو جائے۔

اسی خدشے کے پیشِ نظر قبل ازاں وہ مختلف ذرائع سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو تشدد کے بغیر سمجھاتا رہا، مگر اب یزید نے جب دیکھا کہ معاملہ دگرگوں ہو رہا ہے اور حسین رضی اللہ عنہ کے نمائندے نے سرگرمی سے منفی تحریک شروع کر رکھی ہے۔ تو اس نے نسبتاً سخت اقدام کیا اور کوفے کے انتظامات کسی اعلیٰ اور سخت گیر منتظم کے حوالے کرنے کا سوچا، چنانچہ اس نے کوفہ کی گورنری کے لیے عبیداللہ بن زیاد کو، باوجود اس سے ملال رکھنے کے موزوں سمجھا۔ اور نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی جگہ عبیداللہ بن زیاد کو بصرہ کے علاوہ کوفہ کا گورنر بھی مقرر کر دیا اور ہدایت کی کہ کوئی شورش اُٹھنے نہ پائے، اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو کوفہ نہ آنے دیا جائے اور ان کی سرگرمیوں پر نگاہ رکھی جائے۔[1]

اُدھر کوفہ والے حضرت مسلم بن عقیل کے ہاتھ پر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے لیے دھڑا دھڑ بیعت کر رہے تھے، چنانچہ بقول مؤرخین مسلم کے ہاتھ پر کوفہ سے تیس ہزار بلکہ اس سے بھی زائد محبانِ حسین رضی اللہ عنہ نے بیعت کر لی تھی اور یہ سلسلہ روز افزوں تھا۔

عبیداللہ بن زیاد بصرہ کا بھی گورنر تھا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اہلِ بصرہ کو ایک خفیہ خط لکھا تھا۔ جس کا مفہوم تھا کہ یزید کی بجائے کسی افضل آدمی کو زمامِ حکومت سونپنے کا

---

[1] الكامل لابن الأثير: 268/3، وتاريخ الطبري: 348/5، والبداية والنهاية: 155/8

وقت ہے، آپ لوگ اس کام کے لیے آگے بڑھیں۔ اس خط میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے احتیاط فرمائی کہ یزید کا یا اپنا نام نہ لیا، مگر اس سے یہی مفہوم مستفاد ہوتا تھا کہ آپ رضی اللہ عنہ یزید کے مقابلے میں حکومت قائم کرنا چاہتے تھے، مگر حالات قطعاً ناموافق تھے۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا یہ موقف مجتہدانہ نوعیت کا تھا، اور بے شک آپ رضی اللہ عنہ اِخلاص نیت سے سرگرم عمل تھے۔ اندازہ ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کے ذہن میں نظم کوفہ چلانے کے لئے بڑے اچھے خاکے اور بڑی اچھی پلاننگز ہوں گی، مگر دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ایک حکومت جو قائم ہو چکی ہو اور جسے مسلمانوں کی بھاری اکثریت نے تسلیم کرلیا ہو، جس کی تائید و ہمنوائی کثیر صحابہ رضی اللہ عنہم اور بے شمار تابعین اور عام مسلمان کر چکے ہوں، جس کے امیر کی باقاعدہ بیعت کی جا چکی ہو، جس کا امیر اس وقت کا بیشک افضل ترین نہ سہی، ایک مسلمان اور بہت بھاری تعداد اور نمایاں اکثریت کا انتخاب کردہ ہو، جس کے اِنقیاد و اطاعت پر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو آپ کے پرانے رفیق، معتمد ساتھی اور قرابتدار آمادہ کر رہے ہوں، اس کے خلاف جھنڈا بلند کرنا کیسا تھا؟ اس مسئلہ میں شرع شریف کی کیا رائے ہے؟ قارئین کا اپنا آزادانہ فیصلہ کیا ہوسکتا ہے؟...... اور اگر حکومت عین خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی طرز کی نہ بھی ہو اور فرق ہو، تو اس کی اصلاح کرنی چاہیے یا اس میں الگ حکومت بنانی چاہیے؟ اور خود ہی بتائیں بھلا کون سی حکومت اپنے خلاف اس قسم کی تند و تیز سرگرمیاں برداشت کرسکتی ہے؟ ہم نے تو ایسی کوئی حکومت دیکھی یا سنی نہیں، جو منفی سرگرمیوں کو برداشت کرے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی رائے کتنی بہتر اور اجتہاد کتنا اچھا ہو لیکن آپ خود کہیے، کیا سیاسی و شرعی نکتہ نظر سے آپ رضی اللہ عنہ کا یہ اقدام محل نظر تو نہیں ٹھہرتا؟ ہماری حُبّ حسین رضی اللہ عنہ بالکل بجا، لیکن ماحول اور دلائل کی دنیا کو بھی دیکھ لینے میں کوئی حرج نہیں۔

سوئے اتفاق گورنر عبیداللہ بن زیاد کے ہاتھ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا یہ مذکورہ خفیہ خط

بھی لگ گیا۔ ابن زیاد کے ذہن میں کوفہ والوں کی عہد شکنی، مسلم بن عقیل کی تگ و تاز اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی منصوبہ بندی ایک ایک بات تھی۔ جب وہ بحیثیت گورنر کوفہ کے دارالخلافہ میں پہنچا تو یہ تمام باتیں اور دوسری طرف حکومت کی ہدایات اس کے پیشِ نظر تھیں، اس نے اپنے اختیارات کو بروئے کار لاتے ہوئے سخت انتظامات کیے، اور حکومت کی نگاہ میں اپنے آپ کو لائق اور کامیاب منتظم ثابت کرنے کی امکان بھر سعی کی۔ ہر گورنر ایسے کرتا ہے، آخر اس نے کریڈٹ جو لینا ہوتا ہے۔

عبیداللہ بن زیاد جری، ستمگار اور سخت دل انسان تھا، یہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دَور میں خراسان کا حاکم رہ چکا تھا، یہ اس وقت تقریباً پچیس بہاریں گزار چکا تھا بالکل جوان تھا۔ اس نے خراسان میں بڑی جرأت، بہادری اور دلیری کا ثبوت دیا، اور ترکوں سے برابر کامیاب لڑائیاں جاری رکھیں، پھر اسے خراسان سے بصرہ تبدیل کر دیا گیا، وہاں پہنچتے ہی اس نے فتنہ خوارج کا قلع قمع کر دیا۔ یہ بہت سخت گیر، ہوشیار اور کائیں (یعنی گھاک اور شاطر) تھا[1] کاش یہ زیرک، دانا اور متحمل مزاج بھی ہوتا۔ جو عالی مقام نواسۂ رسول حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے صحیح مقام کو سمجھتا اور سابق گورنر نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی طرح آپ رضی اللہ عنہ کا زیادہ سے زیادہ احترام روا رکھتا اور آپ رضی اللہ عنہ سے تعرض نہ کرتا۔ اور دانائی اور نرمی سے انہیں سمجھا بجھا کر معاملہ رفع دفع کرتا اور ایسی تدبیر اختیار کرتا جس سے کوئی سانحہ رونما نہ ہوتا۔ لیکن اس نے فرزانگی کا ثبوت نہ دیا اور اچھا طریقہ اختیار نہ کیا۔ بلکہ اپنی لاٹھی سے خانوادۂ اہل بیت رضی اللہ عنہم کو ہانکنا شروع کر دیا۔ اور دانش و بینش کا کوئی ثبوت نہ پیش کیا۔

اس نے سادات کرام کے اس عظیم خاندان کی مظلومانہ اور بے کسانہ شہادت کا باعث بننے کے علاوہ امت محمدیہ کو جنگ و جدل اور فتنہ و فساد کی جھلسا دینے والی آگ

[1] سیر أعلام النبلاء: 3/545-548.

کے بھاڑ میں جھونک دیا۔ جس کے شعلے آج تک اٹھ رہے ہیں۔ اور پتہ نہیں کب تک اٹھتے رہیں گے۔

تاریخ پڑھنے والے جانتے ہیں کہ اس حادثہ کربلا کے نتیجے میں مسلمان مستقلاً دو فرقوں میں بَٹ گئے۔ اور دشمنان اسلام کو کھل کر گُل کِھلانے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ اگر ابن زیاد حکومت سے کریڈٹ لینے کے بجائے اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے کریڈٹ لیتا تو اس کے لئے بہت بہتر ہوتا۔ خصوصاً جبکہ حاکم اعلیٰ (امیر یزید) نے (بمطابق روایات صحیحہ) اسے قتل حسین رضی اللہ عنہ کا حکم بھی نہیں دیا تھا۔ صحیح سیاست محض طاقت کا استعمال نہیں ہوتا بلکہ اپنے ناخن تدبیر سے حالات کو سنوارنا، الجھی ہوئی گتھیاں سلجھانا، گھمبیر مسائل پر قابو پانا اور تاریخ ساز کردار ادا کرنا ہوتا ہے۔ لیکن اس نے تشدد کی راہ کو ترجیح دے کر حالات کو آئندہ کے لئے قابو سے باہر کر دیا۔ اور اپنے لئے ہمیشہ کی بدنامی اور ذلت اور اپنی حکومت کے لئے دنیا جہاں کی بددعاؤں اور پھٹکاروں کا موجب بن گیا۔

کاش! وہ اس مظلوم قافلے کا خیال کرتا...... اور مسئلے کا کوئی بہترین حل نکالتا۔ بھلا کون سا مسئلہ ہے جس کا اچھا حل نہیں نکل سکتا ہے؟...... لیکن برا ہو ضدّ اور تکبرُ کا۔ اس نے اخلاص، ایمان، ہمدردی سے کام لینے کے بجائے ظلم وستم اور جفا کی تیغ سے کام لیا۔ جس کا بوجھ خود اس پر پڑا۔ یہ ٹولہ جس قدر ذلیل ہوا، حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کا خانوادہ رضی اللہ عنہم اسی قدر مزید اونچا اور سر بلند ہوا۔ مزید اونچا اس لیے کہا ہے کہ یہ خانوادہ شروع ہی سے اونچا اور سر بلند تھا۔ کہاں یزید اور ابن زیاد قسم کے لوگ؟ اور کہاں خاندانِ نبوت؟ اور سادات کا گلِ سر سبد حسین ابن علی رضی اللہ عنہما؟

ابن زیاد کی پہلی فریب کاری

اہلِ کوفہ کو ابنِ زیاد کے آنے کی کوئی اطلاع نہ تھی۔ وہ تو سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ

کی آمد کے منتظر تھے۔ پس ابنِ زیاد نے اہل کوفہ سے پہلا فریب یہ کیا کہ جب وہ کوفہ میں داخل ہوا تو اس نے بالکل حضرت حسین رضی اللہ عنہ جیسی وضع قطع بنا لی۔ اور آپ رضی اللہ عنہ جیسا لباس پہن لیا۔ اور اپنا چہرہ چھپا کر کوفہ میں داخل ہوا۔ کوفہ کے لوگ اسے دیکھ کر یہ سمجھے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ تشریف لائے ہیں۔ انھوں نے اَھلًا وَسَھْلًا وَ مَرْحَباً کے نعرے لگانا شروع کر دیے۔ اور انبوہ کثیر اس کے استقبال کے لئے جمع ہو گیا۔ جب اس نے دیکھا کہ تمام لوگ اکٹھے ہو گئے ہیں تو اس نے نقاب اُلٹ کر اپنے آپ کو ظاہر کر دیا۔ اسے دیکھ کر تمام لوگ حیرت سے ٹھٹھاک گئے۔ اس نے پہلا کام یہ کیا کہ نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کو امارت سے معزول کر کے کوفہ سے نکال دیا۔ پھر تحقیقات، حصولِ معلومات اور مسلم بن عقیل رحمہ اللہ کی حرکات وسکنات اور دیگر امور کی پوری مخبری کے لیے جاسوس اور سُراغ رساں مقرر کر کے ہر طرف پھیلا دیئے۔ بعد ازاں ایک غضب ناک تقریر کی اور کہا:

> ''اے کوفیو! اب امیر یزید کے حکم سے کوفہ کا حاکم میں ہوں۔ میں ظالموں کو سزا دینے اور مظلوموں کی داد رسی کرنے کے لئے آیا ہوں۔ جو باغی اور شریر ہیں ان کے سروں پر تلوار گرے گی۔ اور جو فرمانبردار اور اطاعت گزار ہیں ان کو انعامات سے نوازا جائے گا۔ سب لوگوں کو چاہیے کہ باغیوں اور دشمنوں کی رپورٹ مجھے پہنچائیں۔ جو باغی کہیں رُوپوش ہو اس کو میرے حوالے کریں۔ جو شخص ایسا نہ کرے گا اس کو سولی پر لٹکایا جائے گا۔''[1]

جب مسلم بن عقیل رحمہ اللہ نے ابن زیاد کی آمد کی خبر سُنی اور اس کے اعلانات بھی سُنے تو خفیہ طور پر اپنے رفیقوں سے مشورے کرنے لگے کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ انھوں نے

[1] الکامل لابن الأثیر: 3/268-269، وتاریخ الطبری: 5/384، والبدایة والنهایة: 8/155.

اپنے آپ کو بھی خفیہ رکھا۔ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو پوشیدہ طور پر خط لکھ دیا کہ ہزار ہا لوگ آپ رضی اللہ عنہ کے لیے میرے ہاتھ پر بیعت کر چکے ہیں۔ تمام اہلِ کوفہ آپ رضی اللہ عنہ کے وفادار اور چشم براہ ہیں۔ آپ تاخیر نہ فرمائیں اور فوراً کوفہ تشریف لے آئیں۔[1]

مسلم بن عقیل رحمہ اللہ کا خیال تھا کہ آپ کی آمد سے موجودہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ مگر موصوف کا یہ خط اور زیادہ پریشان کن ثابت ہوا۔

ابن زیاد کی دوسری عیاری

ابنِ زیاد اور اس کے کارندوں نے حضرت مسلم بن عقیل رحمہ اللہ کے سراغ لگانے کی بہت کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اس نے سوچا کہ وہ بہت محتاط طریقہ سے کسی جگہ روپوش ہیں اور آسانی سے ان کا پتہ چلنا مشکل ہے، پس اس نے یہ چال چلی کہ ایک ہوشیار اور مکار شخص کو جاسوس بنایا۔ اور اس کو یہ تربیت دی کہ لوگوں میں اپنا تعارف یوں کرائے کہ وہ فلاں جگہ سے مسلم بن عقیل سے ملنے، ان کی بیعت کرنے اور ان کو معقول نذرانہ دینے آیا ہے اور اہلِ بیت کا بڑا معتقد ہے، چنانچہ اس نے اسی طرح کیا۔ جب لوگوں میں یہ مشہور ہوا تو کسی طریق سے اس کو مسلم بن عقیل کی جائے رہائش کا پتہ چل گیا۔ وہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انھیں اپنا سچا عقیدت مند ظاہر کیا۔ بڑے احترام سے ملا۔ اور ان کی خدمت میں تین ہزار درہم بطور نذرانہ پیش کیے، ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور ارادت مند بن کر ان کے تمام حالات اور تمام راز معلوم کر لیے۔ یہ شخص ہر روز ان کے پاس آتا، معلومات حاصل کرتا اور پھر ابنِ زیاد کو آگاہ کرتا کہ یہ یہ ہو رہا ہے اور یوں یوں ہونے والا ہے۔ اور مسلم فلاں مکان میں پوشیدہ ہیں۔ اور ان کے ساتھ ایک کثیر جماعت بھی ہے، جو ہزار ہا بیعت کنندگان افراد پر

---

[1] تاریخ الطبری: 348/5

مشتمل ہے۔[1]

ابنِ زیاد کی تیسری مکاری

اب ابنِ زیاد کو سمجھ آ گئی کہ مسلم بن عقیل کو اس وقت تک گرفتار نہیں کیا جا سکتا، جب تک ان کی جماعت میں نفاق و انتشار نہ ڈالا جائے۔ اس نے اس کے لیے چند ماہر آدمی چُنے جنھوں نے شہر میں پھیل کر اپنے مخصوص ہتھکنڈے استعمال کیے۔ لوگوں کو طرح طرح کی ترغیبیں دیں۔ انعام و اکرام کے لالچ دیے۔ ڈرایا دھمکایا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ بہت سے لوگ حضرت مسلم بن عقیل رحمہ اللہ کا ساتھ چھوڑ کر یزید کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے اور ابنِ زیاد کے طرف دار بن گئے۔ یعنی جن لوگوں نے قسمیں کھا کھا کر اور حلف اٹھا اٹھا کر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی وفاداری کے عہد باندھے تھے، ان کو ہزاروں خطوط لکھے تھے اور کوفہ آنے کی دعوت دی تھی اور ان کے نام پر بیعت کی تھی، اب وہ اپنے وعدوں سے پھر گئے، اور یزید کے حامی بن گئے۔ اور جو بے وفائی اہل کوفہ کے خمیر میں داخل ہو چکی تھی، ظاہر ہونا شروع ہو گئی۔ حکماء نے سچ کہا کہ جس طرح کسی فرد کی خاص عادت ہوتی ہے جسے بدلنا مشکل ہوتا ہے۔ اسی طرح خاندانوں اور قوموں کی بھی خاص عادت ہوتی ہے جنہیں بدلنا کٹھن ہوتا ہے۔ یہی حال کوفیوں کا تھا۔ ان میں خوبیاں بھی ہوں گی مگر ساتھ بے وفائی بھی تھی۔ بے وفا کبھی بھی سچا اور مخلص دوست نہیں ہوسکتا۔ بچھو اور سنپولیے سے ہزار دفعہ پیار کریں مگر اخیر میں ڈنک مار ہی دیتا ہے۔ یہی حال طوطا چشم اور بے وفا لوگوں کا ہوتا ہے، وہ اخیر نقصان پہنچا کر ہی رہتے ہیں۔

حضرت مسلم بن عقیل رحمہ اللہ پر یہ وقت بڑا نازک تھا، آپ نہ واپس جا سکتے تھے

---

[1] تاريخ الطبري: 348/5، والكامل لابن الأثير: 269/3.

کیونکہ شہر کے چاروں طرف کڑے پہرے لگے ہوئے تھے، نہ ظاہر ہو سکتے تھے، نہ کہیں چھپ سکتے تھے، نہ اپنے مشن کو چھوڑ سکتے تھے، اور نہ ہی کوفہ میں رہ سکتے تھے۔ کیونکہ اب بیعت کرنے والے ہی ان کے مخالف ہو گئے تھے اور ان کو گرفتار کرانا چاہتے تھے۔ حضرت مسلم بن عقیل رحمہ اللہ زبانِ حال سے یہ کہہ رہے ہوں گے۔

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

حضرت مسلم بن عقیل رحمہ اللہ کی گرفتاری وشہادت

ابنِ زیاد نے حضرت مسلم رحمہ اللہ کی گرفتاری کے لیے اعلان کرایا، اور گرفتار کرنے والوں سے بھاری انعام کا وعدہ کیا۔ جن لوگوں نے ان کو چھپا رکھا تھا، انہیں دردناک سزا دینے کا اعلان کیا۔ آخر کار ابن زیاد کے آدمی اس مکان میں داخل ہو گئے جہاں مسلم بن عقیل رحمہ اللہ چھپے ہوئے تھے اور ان کا پوری طرح محاصرہ کرلیا گیا۔ آپ کا شبہ ہی دور ہو چکا تھا۔ مگر اب انھیں کوفیوں کی سو فیصد بے وفائی کا یقین ہو چلا تھا کہ یہ بالکل نکمے لوگ اور کھوٹے سکّے ہیں۔ بہرحال مسلم بن عقیل رحمہ اللہ نے اپنے چند گنے چنے ساتھیوں کے ساتھ مدافعت کی اور ابنِ زیاد کے آدمیوں کے حملے کا جواب دیا۔ جناب مسلم رحمہ اللہ خود بے جگری سے لڑ رہے تھے اور کئی اشقیاء کو ٹھنڈا کر چکے تھے۔ جب آپ زخموں سے چور ہو گئے اور بہت سا خون بہنے سے لڑنے کی ہمت نہ رہی تو ایک شخص جو ابنِ زیاد کا معتمد خاص تھا اُن سے امان دینے کا وعدہ کرنے لگا مگر یہ ایک دھوکا تھا۔ بہرحال آپ کو گرفتار کر کے زِندان میں ڈال دیا گیا۔ جس جگہ ان کو رکھا گیا وہاں ٹھنڈے پانی کا گھڑا پڑا ہوا تھا۔ حضرت مسلم نے پانی پینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اشقیاء نے روک لیا اور پانی نہ پینے دیا، پھر کسی نے پانی منگوا کر دیا تو آپ رحمہ اللہ پی نہ سکے، کیونکہ ہونٹ اور مسوڑھے زیادہ زخمی ہو چکے تھے۔

اس کے بعد آپ کو ابنِ زیاد کے پاس لایا گیا۔ حضرت مسلم رحمہ اللہ اور ابنِ زیاد کے

درمیان تھوڑی سی جھڑپ ہوئی۔ ابن زیاد پہلے ہی غصے میں تھا وہ اور غضبناک ہو گیا۔ چنانچہ اُس نے آپ کے قتل کا حکم دے دیا۔

حضرت مسلم رحمہ اللہ نے آخری وقت میں چند باتوں کی وصیت فرمائی جس میں یہ بھی کہا:

''حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو تمام حالات اور میرے قتل کے متعلق لکھ دیا جائے کہ اب وہ کوفہ کا رُخ نہ کریں۔''

ابن زیاد نے وعدہ کیا کہ اگر وہ ہم سے جنگ نہ کریں گے تو ہم بھی ان سے نہیں لڑیں گے۔ بعدازاں حضرت مسلم کو قلعہ کی بلندی پر لے جایا گیا۔

آپ تکبیر و تحمید کرتے، درود و صلوٰۃ پڑھتے اور مغفرت کی دعائیں مانگتے جا رہے تھے۔ آپ کو قلعہ کی چھت پر لے جا کر ایک جلاد بکیر بن حمران نے شہید کر کے آپ کے جسدِ اطہر کو محل کی بلندی سے چوراہے میں گرا دیا۔ یہ 9 ذوالحجہ 60 ھ بدھ کا دن تھا۔ اور جس شخص یعنی ہانی بن عروہ نے حضرت مسلم کو پناہ دے رکھی تھی ابن زیاد نے اسے بھی قتل کرا دیا اور حضرت مسلم رحمہ اللہ کے جسدِ مبارک کو برسرعام سولی پر لٹکا دیا تاکہ لوگوں میں خوف و ہراس پھیلے۔ ﴿إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾ [1]

یہاں پہنچ کر ایک قاری کے ذہن میں سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ ابن زیاد نے انسانیت کی حدود و قیود کو بھی توڑ دیا، اس نے ایسا کیوں کیا؟ دوسری طرف محبانِ اہلِ بیت رضی اللہ عنہم جنھوں نے جوق در جوق مسلم بن عقیل کی بیعت کی تھی آناً فاناً کیوں طوطا چشم بن گئے؟ اور سو پچاس تو دور کی بات ہے دس بیس آدمی بھی ایسے نہ نکلے جو آپ کی خاطر جان کی بازی لگا دیتے، شیعان کوفہ کی اتنی بے وفائی؟ اس قدر طوطا چشمی؟ اللہ کی پناہ! جو کوئی ان حالات میں حضرت مسلم بن عقیل رحمہ اللہ کی وفا نہ کر سکے وہ اِن سے ابتر

[1] البقرة 2: 156. تاريخ الطبري: 5/350، والكامل لابن الأثير: 3/273,274، والبداية والنهاية: 8/158,159.

حالات میں حضرت حسین ابن حیدر رضی اللہ عنہما سے کیونکر وفا کرتے ......؟

ہمارے خیال میں ابنِ زیاد نے بھرپور انتقامی کارروائی کا مظاہرہ کیا اور یہ کوئی نئی بات نہیں، جنونِ انتقام میں بہت کم حکمران قابو میں رہتے ہیں، اور ابن زیاد جیسا متشدد، تُند مزاج، سخت گیر اور منتقم مزاج حکمران بھلا کیسے ظلم و انتقام میں کمی اٹھا رکھتا؟ چنانچہ اس نے بھی کوئی کمی نہ اٹھا رکھی۔ اس نے زیادہ تر یہ کارروائی حکومت سے کریڈٹ حاصل کرنے کے لیے کی۔ ابنِ زیاد کا یہ اقدام بحیثیت حکمران کسی کے نزدیک شاید لائق تحسین ہو، مگر بحیثیت مسلمان یقیناً قابل ستائش نہیں تھا......۔ اسے کم از کم فرستادۂ حسین رضی اللہ عنہ ہی سمجھ کر دانشمندانہ و مدبرانہ اقدام کرنا چاہیے تھا۔ اسی طرح اہلِ کوفہ جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی عقیدت و محبت کے دعویدار تھے، انھیں مخلص نہیں کہا جا سکتا، انھوں نے حضرت مسلم رحمہ اللہ کو جو دھوکا اور فریب دیا اس کی مثال تاریخ میں کم ہی نظر آئے گی۔

حضرت مسلم رحمہ اللہ کا قاتل بیشک ابنِ زیاد تھا، لیکن اس جرم سے اہل کوفہ کو بھی بری قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یقیناً بالواسطہ وہ بھی اس قتل میں برابر کے شریک تھے، کیونکہ ایک طرح سے انھوں نے سیدنا مسلم رحمہ اللہ کو گھیر کر موت کے منہ میں دھکیلا۔

حضرت مسلم رحمہ اللہ کا کوفے میں آنا، لوگوں کو اپنا ہمنوا بنانا، یزید کی بیعت تڑوا کر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی بیعت لینا، اپنے ساتھیوں کے ساتھ گورنر کوفہ کے محل پر دھاوا بولنا، پھر اندر خانہ لوگوں کو حکومت وقت کے خلاف اکسانا اور اپنی گرفتاری کے وقت پولیس کا مقابلہ کرنا اور ابنِ زیاد کے دربار میں اسے ترکی بہ ترکی جواب دینا، بیشک قانون کی نگاہ میں درست نہ تھا۔ مگر چونکہ حضرت مسلم رحمہ اللہ اخلاص نیت کے ساتھ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے موقف کو درست جانتے تھے اور آپ رضی اللہ عنہ کی پوری نیابت و جانشینی کر رہے تھے، بنابریں آپ کو مطعون قرار نہیں دیا جا سکتا، البتہ ابن زیاد کا رویہ

اگر معتدل اور نرم ہوتا جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں تو بہت اچھا تھا۔مگر اس نے تدبیر کے بجائے شمشیر سے کام لیا۔اور ظلم واستبداد کی چکّی چلانے میں کوئی کمی نہ اٹھارکھی۔

حضرت مسلم بن عقیل کے حالات کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ نے آپ کو جرأت وقوت اور شجاعت و مردانگی کا بے نظیر ملکہ ودیعت فرما رکھا تھا۔آپ نے ابن زیاد کے دربار میں جو دوٹوک اور صاف باتیں کیں وہ آپ کی بلند حوصلگی، ایمانی قوت اور جرأت ومردانگی کی مظہر ہیں...... اور آپ کی جرأت اورحق گوئی کی یہ بھی دلیل ہے کہ آپ نے گرفتاری کے بعد سب کے سامنے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو یہ پیغام بھیجا:

''اہل کوفہ غدّار اور بے وفا ہیں، یہ قطعاً اعتبار کے قابل نہیں ہیں، یہ سب بیعت توڑ کر ابنِ زیاد کے ساتھ مل چکے ہیں، اس لیے حضرت حسین رضی اللہ عنہ یہاں آنے کا قصد نہ کریں ورنہ آپ رضی اللہ عنہ کے معصوم قافلے کے ساتھ وہی سلوک ہوگا جو میرے ساتھ ہوا ہے۔''

یہ تازہ ترین صورت حال حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو ابھی معلوم نہ ہوسکی تھی، آپ رضی اللہ عنہ کو مسلم کے وہی خطوط ملے تھے جن میں کوفیوں کے جوش وجذبے کی تعریف کی گئی تھی اور بلاتاخیر کوفہ آنے کی دعوت دی گئی تھی۔

اس واقعہ شہادت سے جہاں حضرت مسلم کی جرأت ودلیری کا اندازہ ہوتا ہے وہاں ان کے اخلاص ووفا کا بھی پتہ چلتا ہے کہ آپ نے جان دے دی مگر جنہیں اپنا امیر اور قائد بنا لیا تھا ایک ثانیہ کے لیے بھی ان سے بے وفائی نہیں کی، اور وفا کا ایسا حق ادا کیا جو تاریخ میں ہمیشہ روشن رہے گا۔

تاریخ کے صفحات میں جہاں کوفیوں کی ریکارڈ بے وفائی محفوظ ہوئی وہاں مسلم بن عقیل کی ریکارڈ وفا بھی محفوظ ہوگئی۔

دوسرا توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ حضرت مسلم کی اس ابتلاء میں مدد کے لیے حضرت

حسین رضی اللہ عنہ تشریف لائے نہ کوئی اور زندہ یا فوت شدہ بزرگ، جس سے صاف پتہ چلا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو گرفتارِ بلا کر لے تو پھر کوئی انسان، وہ اپنی جگہ کتنا ہی عظیم کیوں نہ ہو، مدد نہیں کر سکتا۔ قرآن مجید کے بتلائے ہوئے نظریۂ توحید کا بھی یہی خلاصہ ہے۔ اور مسلم بن عقیل کا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو خطوط لکھ کر حالات سے آگاہ کرنا بھی اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے نزدیک امام حسین رضی اللہ عنہ کو علم غیب نہیں تھا۔ گویا ان کے نزدیک امام مختارِ کل ہوتا ہے نہ عالم الغیب۔ لہٰذا شیعہ دوستوں کو قرآن مجید کا نہ سہی، حضرت مسلم رحمہ اللہ بلکہ خود حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا عقیدہ ہی اپنا لینا چاہیے کہ مشکل کشا، اور عالم الغیب صرف اللہ تعالیٰ ہے اور کوئی نہیں۔ حادثہ کربلا کے یہ حقیقی، دوررس اور قابل توجہ نکات ہیں جنہیں کبھی بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ یہ تفصیل اپنی جگہ آ رہی ہے۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی کوفہ روانگی

حضرت مسلم بن عقیل رحمہ اللہ کے خط لکھنے اور پیغام بھیجنے پر کہ اٹھارہ ہزار یا بقول بعض تیس ہزار کوفی بیعت کر چکے ہیں اور سب لوگ آپ رضی اللہ عنہ کی خلافت و امامت کے طلب گار، بے حد وفا شعار اور جاں نثار ہیں، حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے کوفہ جانے کا پختہ عزم فرما لیا۔ وہاں کے واقعات اور مسلم بن عقیل رحمہ اللہ کی شہادت کا آپ رضی اللہ عنہ کو علم نہیں تھا۔ ظاہر ہے اگر علم ہوتا تو آپ رضی اللہ عنہ کسی صورت کوفہ جانے کا عزم نہ فرماتے، چنانچہ اپنے پروگرام کے مطابق سفر کوفہ کے لیے ارادہ فرما لیا۔

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما اور چند ایک اہم دوستوں نے آپ رضی اللہ عنہ کو اس کٹھن اور خطرناک سفر پر جانے سے روکا مگر نوشتۂ تقدیر بدل نہیں سکتا۔ آپ رضی اللہ عنہ برابر اپنے ارادے پر قائم رہے۔ اور 8 ذوالحجہ 60ھ منگل کے دن آپ رضی اللہ عنہ اپنے اہل و عیال اور دوسرے رفقاء سمیت جانب عراق روانہ ہو گئے۔ روانگی سے پیشتر آپ رضی اللہ عنہ نے عمرہ کیا اور طواف کعبہ اور صفا و مروہ کی سعی سے فارغ ہو کر احرام اتار دیا۔[1]

یہ بتایا جا چکا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا شروع سے میلان الگ حکومت قائم کرنے کی جانب تھا اور آپ رضی اللہ عنہ کے ذہن میں جس حکومت کا خاکہ تھا وہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے دورِ حکومت کے عین مطابق تھا۔ بیشک وہ بہت بہترین خاکہ تھا۔ مگر وہ عہد پلٹ کر نہ آ سکتا تھا۔ ایسے حالات تھے نہ ماحول ایسا تھا۔ اُس وقت سب کے

---

[1] البداية والنهاية: 160/8، والكامل لابن الأثير: 275/3، وتاريخ الطبري: 381/5

سب کوئی بے مثال مؤمن نہ تھے بیشک کافی تعداد اصحاب رسول ﷺ کی بھی تھی لیکن اِس دور میں بے شک صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ بھی تھے، مگر جو عامۃ المسلمین تھے، وہ بہرحال پہلوں جیسے نہ تھے اور نہ ہو سکتے تھے، ان کا ایمان صحابہ رضی اللہ عنہم کے ایمان جیسا نہ تھا۔ اور پھر صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد عام طور پر مسلمان تین طرح کے رہے۔ بہترین، متوسط، اور کمزور۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ دورِ نبوت سے جس قدر بُعد ہوتا گیا، تقویٰ و پرہیزگاری، للّٰہیت، اور عبادت و اطاعت میں فرق آتا گیا۔ اس فرق کا اس وقت ظاہر ہونا فطری اور قدرتی امر تھا۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ برابر اپنے نظریے پر قائم تھے۔ اس میں کوئی لچک نہ تھی، آپ رضی اللہ عنہ اپنے مقصد کے حصول میں کافی حد تک پُر امید تھے، اور حضرت مسلم رحمہ اللہ کی دعوت سے آپ رضی اللہ عنہ کا نخلِ آرزو اور زیادہ سرسبز وشاداب ہو گیا، البتہ یہ باتیں آپ رضی اللہ عنہ کے ذہن میں نہ تھیں کہ حالات کا پانسہ یکسر پلٹ بھی سکتا ہے۔ اور نوبت مسلم بن عقیل کی یا ہماری شہادت کی بھی آ سکتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ آپ رضی اللہ عنہ کو معمولی مزاحمت کا خطرہ تھا، اور آپ رضی اللہ عنہ یہ سمجھتے تھے کہ عورتوں اور بچوں سے بھلا کون مزاحمت کرے گا، اور یہ ذہن آپ رضی اللہ عنہ کا اس لیے تھا کہ اب تک حکومتِ یزید نے آپ رضی اللہ عنہ کے احترام کے پیشِ نظر آپ سے کوئی تعرض کیا تھا نہ کسی قسم کے تشدّد کا روادار تھا۔

دراصل حکومت آپ کو سمجھا بجھا کر حُسن تدبیر اور مروت وخوش اسلوبی سے مسئلہ حل کرنا چاہتی تھی، مگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے حکومت کے اس رویے کو اہمیت نہ دی۔ اِدھر توجہ نہ فرمائی۔ یا آپ رضی اللہ عنہ کی عنان توجہ ادھر منعطف نہ ہوئی، اور کسی کے مشورے پر اعتناء فرمانے اور کوفیوں کے حالات کا مزید جائزہ لینے یا کوئی انتظار کرنے کے بجائے آپ نے سفر پر نکلنا ضروری خیال فرمایا۔ چنانچہ اپنے ساتھ اپنے خاندان کے بچوں اور عورتوں کو لے جانے کی عملاً تیاریاں شروع کر دیں۔ حج بالکل شروع تھا، اس لئے

آپ رضی اللہ عنہ نے ایک دن کی بھی تاخیر مناسب نہ سمجھی اور جس قدر جلدی ہو سکا کوفہ کے لیے نکل پڑے۔ عقل کہتی ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کو حج کر لینا چاہیے تھا، مگر تقدیر آپ رضی اللہ عنہ کو کہیں اور لے جانا چاہتی تھی، تقدیر الٰہی کے سامنے کوئی تدبیر کام نہیں کرتی۔ بہر حال آپ رضی اللہ عنہ اپنے پروگرام کے مطابق اپنے راستے پر چل پڑے۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے دوستوں اور ساتھیوں کو جب یہ علم ہوا تو انھوں نے آپ رضی اللہ عنہ کو اس سفر سے روکا۔ امام ابنِ کثیر اور ابن اثیر رحمہ اللہ نے یہ ساری تفصیل دی ہے۔[1]

حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما، حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ، حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما، حضرت ابو واقد لیثی رضی اللہ عنہ اور دیگر احباب نے آپ رضی اللہ عنہ کو نہ جانے کا مشورہ دیا، اور ابنِ عباس رضی اللہ عنہما عمر بن عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما، اور متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم نے تو آپ کو اس مخدوش و پُر خطر سفر سے بہ اصرار روکا، (چونکہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے مشورے کا پیچھے ذکر ہو چکا ہے اس لئے اس کے تفصیلی اعادے کی ضرورت نہیں)۔ البتہ آپ رضی اللہ عنہ کے منصوبے کی اطلاع ہونے پر کچھ اور احباب نے بھی نہ جانے کے مشورے دیے۔ اور اس مہیب و پُر خطر سفر پر نکلنے کو ناپسند جانا۔

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کے بارے میں آتا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ دو بارہ، سہ بارہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور بہ منت و سماجت اور اللہ کے واسطے دے دے کر اس ارادے سے باز رہنے کا مشورہ دیا اور کہا: ''میں آپ کو اللہ کا واسطہ دیتا ہوں کہ آپ اس ارادے سے باز آئیں اور اپنے آپ کو جان بُوجھ کر ہلاکت میں نہ ڈالیں۔ کوفے والے صحیح لوگ نہیں ہیں، فریب کار ہیں، وہ آپ رضی اللہ عنہ کو جنگ میں جھونک کر خود ایک طرف ہو جائیں گے۔''

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''بیشک آپ کا مشورہ ناصحانہ اور ہمدردانہ ہے مگر میں

---

[1] البداية والنهاية: 8/161-165، والكامل لابن الأثير: 3/275-276.

نے روانگیٔ کوفہ کا عزم کر لیا ہے۔'' ابن عباس رضی اللہ عنہما نے صاف کہہ دیا: ''پھر ان عورتوں اور بچوں کو تو ساتھ نہ لے جائیں، مجھے ڈر ہے کہ مبادا آپ رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرح بچوں اور عورتوں کے سامنے شہید کر دیا جائے!!'' مگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے دوسروں کی طرح ان کا بھی مشورہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حالات و مشاہدات کی روشنی میں اپنی خداداد بصیرت سے یہ بات کہی تھی، ورنہ یہ بات نہیں کہ آپ رضی اللہ عنہ کو کوئی غیب کا علم تھا یا وہ رتبے میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر تھے۔ دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے مشورے بھی موجودہ حکومت کے نظم وضبط اور کوفیوں کے سابقہ منافقانہ ریکارڈ کو دیکھ کر ہی تھے جو اپنی جگہ بڑے صائب اور درست تھے۔

حضرت عمر بن عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آپ رضی اللہ عنہ ایسی جگہ جا رہے ہیں کہ جہاں کے لوگ درہم و دینار کے پرستار ہیں، مجھے خطرہ ہے کہ کہیں وہ لوگ آپ کے مقابلے پر نہ آ جائیں۔

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما باوجود یہ کہ یزید کے مخالف تھے، انھوں نے بھی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے اس سفر کو غیر تسلی بخش قرار دیا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے بڑا اچھا مشورہ دیا۔ اور کہا: ''اے حسین رضی اللہ عنہ! آپ حجاز میں قیام کیجیے۔ اسی کو اپنا مسکن بنایئے۔ یہاں رہ کر لوگوں کو اپنی خلافت کی دعوت دیجیے اور اہلِ عراق سے کہیے کہ وہ یہاں آ کر آپ رضی اللہ عنہ کی مدد کریں، ہم لوگ بھی آپ کی ہر طرح سے مدد کریں گے۔''[1] مگر آپ رضی اللہ عنہ نے ان کی کسی بات پر توجہ نہ فرمائی......۔

بالآخر آپ رضی اللہ عنہ اپنے اہل و عیال سمیت مکہ سے روانہ ہوئے۔ آپ رضی اللہ عنہ جب مکے آئے تو تاریخ 3 شعبان 60ھ تھی۔ اور جب مکہ چھوڑ رہے تھے تو قمری تاریخ 8 ذوالحجہ 60ھ تھی، آپ رضی اللہ عنہ شعبان تا ذوالقعدہ مکہ ہی میں رہے، جب آپ رضی اللہ عنہ عازمِ کوفہ

[1] الكامل لابن الأثير: 275/3، وتاريخ الطبري: 384/5.

ہوئے تو انگریزی تاریخ 9 ستمبر 680ء تھی۔

بہر حال آپ رضی اللہ عنہ نے سب دوستوں اور بزرگوں کے مشوروں کو سن لیا، مگر بدستور اپنے ارادے پر قائم رہے۔ اور اپنے سفر پر نکل پڑے۔ جب یہ پاکیزہ قافلہ مقام فاح پر پہنچا تو مشہور شاعر فرزدق جو محبّ اہلِ بیت رضی اللہ عنہم تھا، آپ رضی اللہ عنہ سے ملا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اس سے عراق کے حالات دریافت کیے، اس نے کہا: "عالی جاہ! ان لوگوں کے دل آپ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہیں، لیکن تلواریں بنی امیہ کے ساتھ ہیں۔ آپ اگر اپنا ارادہ ملتوی کر دیں تو بہتر ہے۔"

آپ رضی اللہ عنہ نے اس کی بات پر بھی توجہ نہ فرمائی۔ اور اللہ کے نام پر اپنا سفر جاری رکھا، کچھ اور آگے پہنچے، تو عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ کا خاص خط آپ رضی اللہ عنہ کو ملا جس کا متن یہ تھا: "میں آپ کو اللہ کا واسطہ دیتا ہوں، جونہی میرا خط آپ کو ملے، آپ واپس لوٹ آئیں۔ جہاں آپ جا رہے ہیں وہاں اہلِ بیت کی بربادی ہے، آپ رضی اللہ عنہ سفر میں جلدی نہ کیجیے۔ میں آپ کے پاس پہنچ رہا ہوں۔"

چنانچہ عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ پہنچ گئے مگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے ان کی بات نہ مانی اور سفر کے لئے چل پڑے۔ ابن جعفر رضی اللہ عنہ نے اپنے دونوں لڑکوں عون اور محمد کو برائے مدد اور خدمت آپ رضی اللہ عنہ کے ہمراہ کر دیا اور دل پکڑ کر واپس چلے گئے۔ عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ گورنر مدینہ کا خط بھی اپنے ساتھ لائے تھے کہ آپ واپس تشریف لے آئیں، آپ رضی اللہ عنہ سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا، آپ رضی اللہ عنہ کو عزت کی جگہ دی جائے گی، مگر آپ رضی اللہ عنہ نے اس خط کو بھی کوئی اہمیت نہ دی۔[1]

ابنِ اثیر نے یہاں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا ایک خواب بھی نقل کیا ہے، جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے ابنِ جعفر رضی اللہ عنہ کو بتایا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں حکم دیا ہے، میں اس کی بجا آوری کے لیے جا رہا ہوں لیکن ابنِ اثیر نے

---

[1] البداية والنهاية: 169/8، والكامل لابن الأثير: 276/3-277، وتاريخ الطبري: 388/5.

اس کا کوئی حوالہ یا سند نہیں بتائی، اس لیے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔[1]
بہر حال قافلے نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے زیر قیادت اپنا سفر شروع کر دیا۔

اُدھر ابن زیاد کو جب آپ رضی اللہ عنہ کے آنے کا علم ہوا تو اس نے پولیس کے اعلیٰ افسر حُصَین بن نُمیر کو آپ رضی اللہ عنہ کا راستہ روکنے پر مامور کر دیا۔ اس نے قادسیہ، قطعطانہ اور جبل لعل تک پورا کنٹرول سنبھال لیا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ جب حاجز کے مقام پر پہنچے تو آپ رضی اللہ عنہ نے قیس کے ہاتھ اہل کوفہ کو ایک خط بھیجا جس میں انہیں اپنے آنے کی اطلاع دی۔ لیکن پولیس نے قیس کو گرفتار کر کے ابن زیاد کے پاس پہنچا دیا، ابن زیاد نے اسے محل کی چھت سے گرا کر شہید کرا دیا۔[2]

حضرت حسین رضی اللہ عنہ جب بطن رملہ سے آگے بڑھے تو عبیداللہ بن مطیعؒ ملے جو عراق سے واپس آ رہے تھے، انھوں نے کہا: ''اے ابنِ رسول! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں! آپ اپنے جد امجد صلی اللہ علیہ وسلم کے حرم سے باہر کیوں نکلے؟'' آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اہل کوفہ نے ہمیں بلایا ہے۔'' عبیداللہ نے کہا: میں اسلام اور قریش کی حرمت کے لیے آپ رضی اللہ عنہ کو اللہ کی قسم دیتا ہوں کہ آپ رضی اللہ عنہ اپنے اس ارادے سے باز آ جائیں۔ اگر آپ رضی اللہ عنہ نے خلافت کا دعویٰ کیا تو ضرور شہید کر دیے جائیں گے۔'' آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''جو کچھ اللہ نے لکھ دیا ہے اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے!''[3]

عراق جاتے ہوئے جو شخص کوفہ کی طرف سے آپ رضی اللہ عنہ کو آتا نظر پڑتا آپ رضی اللہ عنہ اس سے اہلِ کوفہ اور مسلم بن عقیل رحمہ اللہ کے حالات دریافت کرتے۔ آخر کوفیوں کے متعلق یہ پتہ چل گیا کہ ان کے سرکردہ آدمی تو ابن زیاد سے مل گئے ہیں اور عوام

---

[1] البداية والنهاية : 169/8، والكامل لابن الأثير: 3/276-277. وتاريخ الطبري : 5/388.
[2] الكامل لابن الأثير: 277/3. والبداية والنهاية: 8/169-170. [3] الكامل لابن الأثير: 277/3.

کے دل ہمارے ساتھ ہیں جبکہ ان کی تلواریں بنی امیہ یعنی گروہ ابن زیاد کے ساتھ ہیں۔ پھر بمقام ثعلبیہ پہنچ کر آپ رضی اللہ عنہ کو مسلم بن عقیل رحمہ اللہ کی شہادت اور اہلِ کوفہ کی غداری اور اسی طرح کی دیگر تفصیلات معلوم ہوئیں۔ حضرت مسلم رحمہ اللہ اور ان کے عزیزان کی شہادت کا سن کر آپ رضی اللہ عنہ کو بہت رنج ہوا اور آہ سرد بھر کر ﴿إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّآ إِلَيْهِ رَٰجِعُونَ﴾ [1] پڑھا۔ [2] اس موقع پر آپ رضی اللہ عنہ کو شدید دھچکا لگا۔ اور آپ رضی اللہ عنہ کچھ اور سوچنے لگے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«لَمَّا بَلَغَهُ مَا فُعِلَ بِابْنِ عَمِّهِ مُسْلِمِ بْنِ عَقِيلٍ تَرَكَ طَلَبَ الْأَمْرِ»

''جب آپ رضی اللہ عنہ کو مسلم بن عقیل کی شہادت کی خبر ملی تو آپ رضی اللہ عنہ نے (خلافت وحکومت کا) ارادہ ترک کر دیا۔'' [3]

مختصر یہ کہ اس وقت آپ رضی اللہ عنہ کے سامنے پورے حقائق آ گئے اور اہل کوفہ کی بے وفائی اچھی طرح کھل گئی اور ایک فیصد بھی شبہ نہ رہا۔ اس سے آپ کے جذبات ماند پڑ گئے اور آگے اٹھنے والے قدم سست پڑ گئے۔ کیونکہ بات آپ رضی اللہ عنہ کی توقع کے خلاف کچھ اور بن گئی۔ اور یہ کس قدر حرماں نصیبی تھی کوفیوں کی۔ جس کا صدمہ انہیں مسلم بن عقیل رحمہ اللہ اور سیدنا حسین اور دیگر اہل بیت رضی اللہ عنہم کی شہادت کے بعد بھی ہوا اور آج تک ہو رہا ہے۔

① البقرة 2:156. ② تاريخ الطبري: 386/5، والكامل لابن الأثير: 278/3، والبداية والنهاية: 170/8. ③ منهاج السنة: 248/2 .

اہلِ کوفہ کی غداری

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی دوران سفر کچھ اور لوگوں سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ انھوں نے قریب قریب یہی کہا:

''حضرت! آپ کوفہ کا ارادہ ترک فرما دیجیے۔ وہاں مسلم بن عقیل اور ان کے چند ساتھی جو رہ گئے تھے، انھیں بے دردی سے قتل کر دیا گیا ہے۔ اور ابن زیاد کی حکومت قائم ہو گئی ہے اور وہ اہل بیت کا بدترین دشمن اور نہایت شقی حکمران ہے۔ ہم حیران ہیں کہ آپ رضی اللہ عنہ پہلے دن ہی سے اہلِ کوفہ پر کیسے یقین کر گئے؟ وہ تو شروع سے بے وفائی اور غداری کرتے چلے آئے ہیں۔ انھوں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے غداری کی۔ عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ سے بغاوت کر کے انھیں شہید کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شہید کرایا، یہی وہ بے وفا لوگ تھے کہ جنھوں نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو نیزہ مار کر شدید زخمی کیا۔ اور ان کے نیچے سے مصلّٰی کھینچنے کی کوشش کی، یہ لوگ حد درجہ بے ادب، شاطر، گستاخ اور بے وفا ہیں۔ اور اب آپ رضی اللہ عنہ سے بھی عہد و پیمان کرنے کے باوصف عہد شکنی اور وعدہ خلافی کر چکے ہیں۔ وہ آپ رضی اللہ عنہ کو چھوڑ کر یزید کے طرفدار بن گئے۔'' اور کہا: ''اس وقت کوفہ کے حالات سخت مخدوش اور نازک ہیں۔ شہر اور اطراف میں فوجیں ہی فوجیں نظر آتی ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ کے خلاف جنگی تیاریاں ہو رہی ہیں، موجودہ حالات نہایت تشویش ناک اور لرزہ خیز ہیں۔ ہمارا مشورہ قبول کیجیے اور آپ اپنا ارادۂ سفر یکسر ملتوی فرما دیجیے، اور ایک قدم بھی آگے نہ بڑھائیے۔''

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے عزائم

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے رُوبرو جب اہلِ کوفہ کی غداری اور بے وفائی کے حالات بیان کیے گئے، اور جب آپ رضی اللہ عنہ نے مسلم بن عقیل رحمہ اللہ اور ان کے دو معصوم صاحبزادوں محمد رحمہ اللہ اور ابراہیم رحمہ اللہ کی شہادت اور چند دیگر محبانِ اہلِ بیت رضی اللہ عنہم کے دردناک قتل کی خبریں سنیں تو کوفہ جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ آپ رضی اللہ عنہ کا خیال یہ تھا کہ واپس چلے جائیں یا کسی اور جگہ قیام کر لیں۔ لیکن آپ رضی اللہ عنہ کے ہمراہیوں اور بعض راہرو ملاقاتیوں میں سے بعض لوگوں نے آپ رضی اللہ عنہ کو جنگ پر مشتعل کیا اور مسلم بن عقیل، ان کے بچوں اور دوسرے لوگوں کے قتل کا انتقام لینے پر اُبھارا۔ لیکن حضرت حسین رضی اللہ عنہ بار بار یہی فرماتے کہ میں ہرگز جنگ کرنا اور اہلِ اسلام کا خون بہانا نہیں چاہتا، میں اُمت میں فتنہ وفساد برپا ہونے سے خوف کھاتا ہوں۔ اور اگر، اللہ نہ کرے، ایسی صورت پیدا ہو بھی جائے تو میں جنگ کی ابتدا ہرگز نہ کروں گا۔[1]

آپ رضی اللہ عنہ مشکلات میں محصور ہو گئے۔ حالات نے نازک ترین صورت اختیار کر لی تھی۔ ابھی آپ رضی اللہ عنہ غور ہی فرما رہے تھے کہ کیا کرنا چاہیے اور کہاں جانا چاہیے کہ آپ رضی اللہ عنہ کو ابنِ زیاد کی تدبیروں، سازشوں اور منصوبوں کے متعلق کئی قسم کی اطلاعات ملنے لگیں۔ اور یہ خبر بھی پہنچی کہ ابنِ زیاد نے آپ رضی اللہ عنہ کے ایلچی قیس بن مسہر اور آپ رضی اللہ عنہ کے رضاعی بھائی عبداللہ بن یقطر رحمہ اللہ کو بھی قتل کروادیا ہے۔ یہ وہ نوجوان

---

[1] تاریخ الطبري: 386/5، والکامل لابن الأثیر: 278/3، والبدایة والنهایة: 170/8.

تھے جنھیں آپ رضی اللہ عنہ نے مسلم بن عقیل رحمہ اللہ کے پاس بھیجا تھا۔

عبداللہ بن یقطر رحمہ اللہ کو محل کی چھت سے گرایا گیا، آپ رحمہ اللہ کے انجر پنجر ٹوٹ چکے تھے۔ اور سڑک پر چوراہے میں پڑے سسک رہے تھے کہ انھی کے گروپ کا ایک شخص عبدالمؤمن بن عمیر آگے بڑھا اور خنجر سے آپ رحمہ اللہ کو ذبح کر دیا، لوگوں نے اسے برا بھلا کہا تو اس نے کہا: ''میں نے یہ کام عبداللہ کو آرام وسکون پہنچانے کی خاطر کیا ہے کیونکہ میں ان کے سسکنے کو برداشت نہ کر سکتا تھا۔''[1]

یہ ہے نمونہ ان لوگوں کی اہل بیت رضی اللہ عنہم سے جھوٹی محبت کا۔ اِنَّا لِلّٰہِ.

اور یہ تھے وہ لوگ جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے لیے بے تاب رہتے تھے کہ کب ہمارے درمیان رونق افروز ہوں۔ اور ہم آپ کی خدمت سے شادکام ہوں۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو جب قیس اور عبداللہ رحمہما اللہ کی شہادت کی خبر ملی تو آپ رضی اللہ عنہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں، اور آپ نے یہ آیت پڑھی:

﴿ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴾[2]

''ان میں سے بعض نے اپنا عہد پورا کر دیا اور بعض ان میں سے نذرانہ شہادت پیش کرنے کا انتظار کر رہے ہیں اور ان میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔''[3]

[1] تاریخ الطبري: 386/5، والکامل لابن الأثیر: 278/3، والبدایة والنهایة: 170/8. [2] الأحزاب 33: 23. [3] البدایة والنهایة: 8/175-176، وتاریخ الطبري: 405/5.

راستے مسدود، پہرے ہیں کڑے

اثنائے سفر سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو یہ خبر ملی کہ ابنِ زیاد نے اُن تمام راستوں اور سڑکوں پر کڑے پہرے بٹھا دیے ہیں جن پر آپ رضی اللہ عنہ نے سفر کرنا ہے یا کر رہے ہیں۔ اور تمام مقامات پر سخت احکامات پہنچا دیے ہیں کہ جہاں حضرت حسین رضی اللہ عنہ ملیں انھیں گرفتار کر لیا جائے۔ کیونکہ ابن زیاد کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی مکہ سے روانگی کی خبر پہنچ چکی تھی۔ اس نے اُن راستوں پر لوگوں کی آمد و رفت بند کر دی۔ اور اس طرح حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو محصور کر لیا گیا تاکہ یہ لوگ واپس جا سکیں نہ آگے بڑھ سکیں۔ اور مقصد اس سے یہ تھا کہ اس طریق سے آپ رضی اللہ عنہ کو گھیر کر یزید کی اطاعت اور بیعت کے لیے مجبور کیا جائے۔

جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے یہ حالات سُنے تو آپ رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں کو واپسی کی اجازت دے دی کہ جو لوگ واپس جانا چاہیں، واپس چلے جائیں۔ جو میرے ساتھ رہنا چاہیں، وہ میرے ساتھ رہیں یہ اُن کی مرضی پر موقوف ہے۔[1]

کوفیوں کی پہلی فوج

حضرت حسین رضی اللہ عنہ شراف کے مقام سے روانہ ہوئے تو ٹھیک دوپہر کے وقت، جبکہ گرمی اور دھوپ اپنے جوبن پر تھی، ابنِ زیاد کا ایک کوفی لشکر جو ایک ہزار سپاہیوں پر

---

[1] الکامل لابن الأثیر: 278/3، والبدایة والنهایة: 170/8۔

مشتمل تھا، حُر کی کمان میں آ پہنچا۔ اسے دیکھ کر حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے ایک موزوں جگہ پر قبضہ کر کے پڑاؤ ڈال دیا اور ابنِ زیاد کی فوج بھی آپ رضی اللہ عنہ کے بالمقابل اُتر پڑی۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ حُر کے لشکر کے آدمی اور سواری کے جانور پیاس سے نڈھال ہو رہے ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ جس قدر پانی موجود ہے ان کو پلا دو۔ چنانچہ انسانوں اور حیوانوں کو سیراب کیا گیا۔[1]

اللہ اکبر! یہ ہے خُلقِ حسین رضی اللہ عنہ جو آپ رضی اللہ عنہ کو نانا جان صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ملا تھا کہ جانی دشمن پر بھی لطف و کرم ہو رہا ہے۔

اتنے میں ظہر کا وقت ہو گیا، آپ رضی اللہ عنہ نے اپنے مؤذن سے اذان دلوائی۔ خود کپڑے تبدیل کیے اور نماز پڑھانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ حُر اور لشکرِ ابنِ زیاد نے بھی آپ رضی اللہ عنہ کی اقتدا میں نماز ادا کی۔ پھر عصر کی نماز بھی اسی طرح مل کر پڑھی گئی۔[2] اس کے بعد آپ رضی اللہ عنہ حُر کے لشکر میں تشریف لائے۔ اور ایک بلیغ تقریر فرمائی جس کا خلاصہ یہ ہے:

''اے کوفہ والو! کیا تم وہی لوگ نہیں ہو جنھوں نے متواتر اور متعدد خطوط لکھ کر اور پیغامات بھیج کر مجھے بُلایا؟ اور اپنی وفاداری اور جان نثاری کا یقین دلایا؟ بیعت کر کے بڑے بڑے عہدو پیمان باندھے؟ اگر تمھارے دلوں میں اللہ تعالیٰ کا خوف ہے تو اپنے وعدوں کو یاد کرو۔ اگر تم مجھے ناپسند جانتے ہو تو میں یہیں سے واپس ہو جاتا ہوں۔''

کوفیوں نے آپ رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ سُنے تو خطوط کے لکھنے اور بھیجنے سے منکر ہو گئے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اُسی وقت خطوں سے بھرے ہوئے دو تھیلے ان کے سامنے کھول دیئے اور فرمانے لگے:

---

[1] الكامل لابن الأثير: 279/3، وتاريخ الطبري: 401/5. [2] المنتظم لابن الجوزي: 335/5، والكامل لابن الأثير: 280/3.

''تم لوگوں کو اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے تھا اور اس طرح مجھے دھوکا نہیں دینا چاہیے تھا۔ میں اسی لیے تمھیں بار بار غور وفکر کی دعوت دیتا رہا تا کہ ایسا نہ ہو کہ تم اپنے قولوں، اپنی قسموں، اپنے عہدوں سے پھر جاؤ، سو وہی ہوا کہ تم بے وفا' بدعہد اور غدّار ثابت ہوئے۔ اور مجھے ایسا فریب دیا جس کی مثال نہیں ملتی۔ تم نے یہ بھی نہ سوچا کہ میں کون ہوں؟ اور کیا چاہتا ہوں؟ سنو! مجھے موت کا ڈر نہیں ہے۔ اگر ڈر ہے تو یہی کہ ملت میں فتنہ نہ پھیلے اور خونریزی نہ ہو۔ لو اب میں واپس جاتا ہوں کہ میرے لیے یہی بہتر ہے۔''[1]

حُر کی مزاحمت

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی تقریر سُن کر حُر نے کہا...... ''آپ رضی اللہ عنہ واپس نہیں جا سکتے۔ ابنِ زیاد کا حکم ہے کہ ہم آپ کو کوفہ لے چلیں۔''

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''اللہ کی پناہ! کوفہ جانے سے تو مر جانا اور قتل ہو جانا بہتر ہے۔''

اس پر حُر اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ میں تکرار شروع ہو گئی۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ واپس جانے پر اصرار کرتے تھے اور حُر کوفہ جانے پر زور دیتا تھا۔ آخر حُر نے کہا: ''مجھے یہ حکم نہیں ہے کہ آپ سے جنگ کروں۔ مجھے صرف یہ حکم ہے کہ آپ کو کوفہ لے جاؤں۔ اگر آپ کوفہ جانے کے لیے نہیں مانتے تو پھر آپ حجاز اور کوفہ کے درمیان کوئی ایسا راستہ اختیار کریں جو قابلِ اعتراض نہ ہو۔''[2]

یہ باتیں ابھی ہو ہی رہی تھیں کہ ابنِ زیاد کا ایک کوفی قاصد اُونٹ کو سرپٹ بھگاتا

---

[1] تاریخ الطبري: 402,401/5. [2] البداية والنهاية: 174/8-175، والكامل لابن الأثير: 280/3، وتاريخ الطبري: 402/5.

ہوا آ پہنچا۔ اور حُر کو ابنِ زیاد کا ایک خط دے کر زبانی پیغام بھی دیا کہ ابنِ زیاد نے حکم دیا ہے کہ حسین رضی اللہ عنہ کو فوراً ایسے مقام پر محصور اور نظر بند کر دیا جائے جہاں نہ پانی ہو نہ پناہ لینے کی جگہ، اُنہیں زیادہ سے زیادہ اذیت پہنچائی جائے اور اس حکم کی فی الفور تعمیل کی جائے۔ خط میں بھی یہی مضمون تھا۔ اور یہ بھی درج تھا کہ جو ایلچی خط لے کر آ رہا ہے۔ اسے اپنا نگران سمجھو اور اس کے سامنے میرے حکم کی تعمیل کرو۔

حُر نے خط پڑھ کر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بھی سُنایا اور کہا کہ مجھے آپ کے محاصرے کا حکم ملا ہے۔ اور میں نے قاصد کے سامنے ابنِ زیاد کے فرمان پر عمل کرنا ہے۔ پس آپ رضی اللہ عنہ فوراً کسی ایسی جگہ قیام کر لیں جہاں نہ پانی ہو نہ آبادی، نہ کنواں، نہ چشمہ، نہ کوئی جائے پناہ ہو۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے تین مقامات بتائے۔ مگر حُر نے اجازت نہ دی اور کہا کہ اگر میں ایسی جگہ آپ رضی اللہ عنہ کو ٹھہرنے بھی دُوں تو میرا نگران فوراً ابنِ زیاد کو اطلاع دے کر مجھے کڑی سزا دلوائے گا۔[1]

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بعض رفیقوں نے آپ رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا کہ موجودہ صورتِ حال بہت نازک ہے۔ بہتر ہے کہ حُر کے لشکر سے جنگ کی جائے۔ ورنہ بعد میں اور فوج آ گئی تو پھر مقابلہ کرنا مشکل ہو جائے گا۔ مگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے انکار کیا اور فرمایا: ''میں ہرگز نہیں چاہتا کہ لڑائی کا آغاز ہماری طرف سے ہو۔ ہمیں صبر کرنا اور اطمینان سے حالات کا انتظار کرنا چاہیے۔'' آپ رضی اللہ عنہ نے یہ بھی فرمایا: ''یہ سب کچھ مجھے جھکانے کے لیے ہو رہا ہے، جو ناممکن العمل ہے اور اس سے جان دے دینا بہتر ہے۔''

دشت کربلا

گرامی منزلت حضرت حسین رضی اللہ عنہ جب تھوڑی دُور جا کر علاقہ ''نینوا'' کے میدانِ

[1] تاريخ الطبري: 408/5، والكامل لابن الأثير: 282/3.

کربلا میں پہنچے تو حُر اور اس کے لشکر نے آگے بڑھ کر آپ رضی اللہ عنہ کو روک لیا اور وہیں قیام کرنے پر مجبور کیا۔ چنانچہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ بدھ کے روز یکم محرم الحرام 61ھ کو کربلا میں اقامت گزیں ہوئے۔ یہ میدان نہر فرات کے قریب ہے اور یہ جگہ ایک طویل ریگ زار ہے جہاں درخت تو کجا گھاس تک نہ تھی۔ نہ دانہ، نہ پانی، نہ سایہ، نہ اَوٹ۔ اور گرمی اس شدت کی کہ الامان![1]

زمین کا رنگ سیاہ ہو چکا تھا۔ چرند و پرند ''العطش، العطش'' پکار رہے تھے۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ آفتاب کی شعاعوں سے ریت اس طرح چمکتی تھی جیسے آگ کے شعلے بلند ہوتے ہوں۔ بہت بھیانک اور خوفناک مناظر تھے، ہر طرف اُداسی، گھبراہٹ اور حسرت طاری تھی، اس جہنم زار کی آتشیں لُوئیں اور سموم وصرصر کی آگ میں پلی ہوئی لپٹیں ہر شے کو جھلس کر بے جان بنا رہی تھیں۔ اسی میدان کربلا کو ''دشتِ طُف'' بھی کہتے ہیں، حضرت حسین مظلوم رضی اللہ عنہ کا خون یہیں بہنا تھا۔ انا للہ۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے کربلا میں آکر خیمے نصب کرائے جن کی ترتیب یہ رکھی گئی کہ سب سے پیچھے اہلِ بیت رضی اللہ عنہم اور خواتین کے خیمے تھے۔ اس سے آگے اعزہ و اقارب کے۔ پھر خدام و انصار کے، پھر مجاہدین و جان نثارانِ خاص کے۔ علاوہ بریں دوسری ضروریات کے لیے کچھ چھولداریاں بھی کھڑی کی گئیں۔ اور چاروں طرف خندق کھود کر ایک جگہ آمد و رفت کے لیے رکھ لی گئی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ دشمن کی سمت آگ روشن کی گئی تا کہ وہ آسانی سے اس طرف نہ آسکے، یہ صرف حفاظتی تدابیر اور دفاعی طریق کار تھا جو موجودہ حالات کے پیش نظر عین موقع پر اختیار کرنا پڑا۔ ورنہ آپ رضی اللہ عنہ نہ جنگ کا ارادہ لے کر آئے تھے اور نہ جنگ کرنا چاہتے تھے۔ نہ اس حادثۂ فاجعہ کو جنگ کا نام دینا چاہیے۔

[1] تاریخ الطبري: 408/5، والكامل لابن الأثير: 282/3.

ابنِ سعد کا لشکر

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے کربلا میں آنے کے دوسرے دن عمرو بن سعد بھی چار ہزار کا لشکر لے کر کوفہ سے آ گیا۔ لکھا ہے کہ جب ابنِ زیاد نے اس کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے خلاف لشکر کشی کرنے اور ان سے لڑنے کا حکم دیا، تو اس نے ہر چند انکار کیا۔ لیکن ابنِ زیاد نے اس کو بہت دھمکیاں دیں اور اس سے ''رَے'' کی گورنری واپس لے لینے اور آئندہ ہر قسم کے عہدوں اور وظیفوں سے محروم کر دینے کا ڈراوا دیا۔ اس سے خائف ہو کر ابنِ سعد رضا مند ہو گیا اور چار ہزار فوج کا کمانڈر بن کر کربلا میں پہنچ گیا۔[1] اب حُر کا لشکر بھی عمرو بن سعد کے لشکر سے مل گیا اور فوج کی کل تعداد پانچ ہزار ہو گئی۔

بہتّر (72) بے یار و مددگار، بے کس و بے بس، بے ہتھیار اور نہتے مظلومین کے مقابلے میں پانچ ہزار اشقیاء کی مسلح اور تازہ دم فوج! اللہ اکبر کسی نے انقلابِ چرخِ گردُوں یوں بھی دیکھا ہے؟

عمرو بن سعد نے ارضِ طف میں پہنچ کر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی خدمت میں اپنا سفیر روانہ کیا۔ اور پوچھا کہ آپ رضی اللہ عنہ کا یہاں آنے کا کیا مقصد ہے؟

آپ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا:

''میں یہاں خود نہیں آیا ہوں، بلکہ مجھے بلایا گیا ہے۔ یہی اہلِ کوفہ جو ہزاروں کی تعداد میں تمھارے ساتھ ہیں انھوں نے خط پر خط لکھ کر مجھے دعوت دی ہے۔ اب اگر ان کے ارادے اور دِل بدل گئے ہیں تو کوئی بات نہیں۔ میرا ارادہ یہی ہے کہ جہاں سے آیا ہوں وہیں واپس چلا جاؤں۔''[2]

---

① تاريخ الطبري:409/5، والكامل لابن الأثير: 283/3. ② تاريخ الطبري: 410/5، والكامل لابن الأثير: 283/3.

حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے یہ جواب پا کر ابنِ سعد نے آپ رضی اللہ عنہ کے ارادے سے ابنِ زیاد کو آگاہ کیا۔ اور لکھا کہ حسین ابنِ علی رضی اللہ عنہما واپس مکہ معظّمہ جانا چاہتے ہیں۔ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟ عبید اللہ بن زیاد نے خط پڑھا تو بڑے چٹخارے لیکر یہ شعر گنگنایا۔

اَلْآنَ إِذْ عَلَقَتْ مَخَالِبُنَا بِهٖ

يَرْجُوا النَّجَاةَ وَلَاتَ حِينَ مَنَاصٍ

"اب وہ ہم سے چھٹکارا پانے کے متمنی ہیں حالانکہ خلاصی حاصل کرنے کا وقت گذر گیا ہے اور وہ ہمارے دام میں جکڑے جا چکے ہیں۔"[1]

پھر ابنِ زیاد نے ابنِ سعد کو لکھا: "حسین سے کہہ دو کہ وہ جس قدر جلد ممکن ہو اپنے تمام ساتھیوں، دوستوں اور رشتہ داروں سمیت یزید کی بیعت کر لیں۔ اور اس کی اطاعت قبول کر لیں۔ اس کے بعد غور کیا جائے گا کہ ہمیں ان کے معاملے میں کیا کرنا چاہیے۔"

اس خط سے ابنِ سعد کو تشویش لاحق ہوئی۔ اور اس نے تعمیل حکم میں تأمّل کیا۔ لیکن ایک مخبر خولی نامی نے، جو نہایت شقی وقسی اور دشمن اہلِ بیت رضی اللہ عنہم تھا، ابنِ زیاد کو عمرو بن سعد کی کوتاہیوں اور غفلتوں کی اطلاع دے دی۔ جس سے ابنِ زیاد سخت برہم اور مشتعل ہوا۔ اس نے فوراً ایک عتاب نامہ ابن سعد کے نام روانہ کیا کہ "اگر حسین فوراً یزید کی بیعت کو تیار ہو جائیں اور ہماری اطاعت قبول کر لیں تو بہتر ہے۔ ورنہ فرات کا پانی آج ہی ان پر بند کر دیا جائے۔ اور ان کو یا ان کے ہمراہیوں کو ایک قطرۂ آب نہ لینے دیا جائے۔ یہودی، کافر، منافق، مشرک، پرندے اور حیوان تو فرات

[1] تاريخ الطبري: 410/5، والكامل لابن الأثير: 283/3.

کا پانی پی سکتے ہیں لیکن حسین اسے چھو بھی نہیں سکتے۔"[1]

واضح رہے کہ خلیفۂ ثالث حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ پر بھی باغیوں نے تین روز اور بقول بعض 45 یوم تک آب و دانہ بند کیے رکھا۔ یہاں تک کہ آپ رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا۔[2] إِنَّا لِلّٰهِ! دراصل یہ سلسلۂ ظلم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر ظلم ہی سے شروع ہو چکا تھا۔

بندشِ آب

جس وقت ابنِ زیاد کا نامۂ غضب عمرو بن سعد کو پہنچا اُس نے تعمیل حکم میں ذرا دیر نہ کی۔ پانچ سو سواروں کا دستہ فرات پر جا بجا متعین کر دیا۔ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور آپ رضی اللہ عنہ کے رفقاء و متعلقین پر کامل طور پر پانی بند کر دیا گیا۔ جو ظلم و شقاوت کی انتہاء تھی۔ اور اس سے بھی اشقیاء کا یہی مقصد تھا کہ جب حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی پیاس سے جاں بہ لب ہوں گے تو اطاعت قبول کر لیں گے اور فوراً جھک جائیں گے......۔ تہذیب و ترقی کے موجودہ دور میں بھی یہی ہوتا ہے کہ حکومتیں جب آپس میں ٹکراتی اور نبرد آزما ہوتی ہیں تو ان کی سب سے پہلی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ایک دوسرے کے راشن اور پانی کے ذخائر یا تو تباہ کر دیئے جائیں یا ان پر قبضہ کر لیا جائے تاکہ دشمن تنگ آ کر گھٹنے ٹیک دے۔ لیکن اسلام نے ایسے ظلم و ستم سے منع کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ دشمن بے رحمی کرے تو الگ بات ہے مگر مسلمانوں کو ظلم سے باز رہنا چاہیے۔ حسین رضی اللہ عنہ چونکہ عامل کتاب و سنت تھے اور سینے میں نرم دل رکھتے تھے۔ انھوں نے حُر کی کمان میں آنے والے ابنِ زیاد کے ایک ہزار سپاہیوں کو پیاس سے نڈھال دیکھ کر پانی سے شاداب کیا جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے لیکن ابنِ زیاد شقی نے اس کا بدلہ آپ رضی اللہ عنہ کو یہ دیا

[1] تاريخ الطبري: 410/5، والكامل لابن الأثير: 283/3. [2] تاريخ الطبري: 385/4 وما بعده، والمنتظم لابن جوزي: 15/ 55,54.

کہ آپ رضی اللہ عنہ کو قطرۂ آب تک سے محروم کر دیا۔ کس قدر فرق ہے نواسۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور دشمنانِ اہلِ بیت رضی اللہ عنہم میں۔ ایک سراپا سعادت ہے اور دوسرا سراپا شقاوت۔ ایک مجسم محبت ہے دوسرا سراسر بغض۔ ایک پیدائشی ایثار پیشہ ہے دوسرا فطرتی ستمگار۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ابن سعد کی ملاقاتیں

اس اثناء میں عمرو بن سعد اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے درمیان ملاقاتیں ہوتی رہیں کبھی امام موصوف اس کے پاس جاتے، کبھی وہ آپ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ حالاتِ حاضرہ پر گفت و شنید ہوا کرتی۔ عمرو بن سعد نے کہا: ''ابن علی! آپ نے دیکھ لیا کہ اہلِ کوفہ نے آپ سے کیسی دغا کی۔ اور کس طرح طوطے کی طرح آپ رضی اللہ عنہ سے آنکھیں پھیر لیں۔ اب حالت یہ ہے کہ جنگ اٹل ہو گئی ہے۔ ابن زیاد آپ رضی اللہ عنہ کو یونہی نہیں چھوڑے گا۔ آپ اپنی آخری اور انتہائی خواہش کا اظہار کریں۔ شاید مصالحت کی کوئی صورت نکل آئے۔ اور جنگ کی تباہ کاریوں سے فریقین بچ جائیں۔''

سیّدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے کچھ اضافے کے ساتھ پھر اپنے الفاظ دُہرائے اور فرمایا: ''میں جنگ نہیں چاہتا۔ میں ہمیشہ سے مسلمانوں کے افتراق اور ان کی خونریزی کے خلاف ہوں۔ اور اب بھی میری یہی خواہش ہے کہ لڑائی سے بہرصورت احتراز کیا جائے۔ مجھے مکے یا مدینے جانے دیا جائے۔ اگر یہ نہیں تو میں کسی دُور دراز ملک میں چلا جاؤں گا اور یہ بھی منظور نہیں تو پھر مجھے یزید کے پاس جانے کا موقع دیا جائے۔ تاکہ اس سے بالمشافہ گفتگو کروں۔''[1]

عمرو بن سعد جو لشکر ابنِ زیاد کا کمانڈر تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ماموں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا بیٹا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا بہت احترام فرمایا کرتے

---

① الکامل لابن الأثیر: 284/3. اس کی وضاحت آگے آ رہی ہے۔

تھے۔ حضور ﷺ سے ان کے بارے میں کتب حدیث میں یہ الفاظ بھی ملتے ہیں:

«فِدَاكَ أَبِي وَأُمِّي» ”آپ پر میرے ماں باپ قربان ہوں۔“ حضرت سعد رضی اللہ عنہ بڑے اعلیٰ پائے کے تیرانداز تھے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ حضورِ اکرم ﷺ نے ان کی تیراندازی دیکھ کر فرمایا تھا:

«هٰذَا خَالِي فَلْيُرِنِي امْرُءٌ خَالَهُ»

”یہ میرے ماموں ہیں۔ کوئی شخص میرے ماموں جیسا اپنا ماموں تو دکھائے؟“[1]

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا شمار عشرہ مبشرہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں بھی ہوتا ہے، مختصر یہ کہ عمرو ان کا بیٹا تھا۔ (لوگ عموماً اسے عُمر و بن سعد پڑھتے اور بولتے ہیں لیکن یہ عَمر و بن سعد ہے، عربی کا قاعدہ ہے کہ عُمر کے بعد جب ”و“ آئے تو بجائے عُمر کے عَمر و پڑھا جاتا ہے۔)

ویسے یہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا احترام کرتا تھا۔ شروع میں بمطابق ”ناسخ التواریخ“ اس نے آپ کے مقابلے میں آنے سے انکار کر دیا تھا، مگر مجبوراً آپ کے سامنے آ گیا اور ”مجبوری“ کا پیچھے ذکر ہو چکا ہے۔ بہر حال مقابلے میں آ گیا۔ اس نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے جو بات چیت کی، وہ آپ پیچھے پڑھ چکے ہیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے جب تین شرائط پیش کیں تو عمرو بن سعد بہت مسرور اور مطمئن ہوا کیونکہ یہ ذاتی طور پر صلح چاہتا تھا، اس نے ابنِ زیاد کو لکھا کہ ”اللہ تعالیٰ نے جنگ کے شعلوں کو بجھا دیا ہے، اور رنجیدہ باتوں کو دُور کر دیا ہے۔ اُمید ہے کہ اصلاح امت کی کوئی صورت نکل آئے گی۔ حسین رضی اللہ عنہ نے مجھ سے عہد کیا ہے کہ یا تو انھیں جہاں سے آئے ہیں وہیں بھیج دیا جائے، یا انھیں کسی دوسری سرحد کی جانب جانے کی اجازت دی جائے، اور یا انہیں امیر یزید کے پاس بھیج دیا جائے تا کہ وہ خود اس سے بات چیت کر لیں۔ اور جو

---

[1] صحيح البخاري، المغازي، باب ﴿اذهمت طائفتان منكم ان تفشلا﴾، حديث: 4055-4059، وصحيح مسلم، فضائل الصحابة، باب في فضل سعد بن أبي وقاص، حديث: 2411.

کچھ ان کے درمیان فیصلہ ہو، اس پر فریقین عمل کریں، میرا خیال ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کا مطالبہ اُمید افزا اور باعثِ مسرت ہے۔ اسے تسلیم کرنے سے سب کا بھلا ہوگا۔''[1]

شمر کی شیطنت

ابنِ زیاد بھی یہ خط پڑھ کر ذرا مطمئن ہوا، اور مناسب تدبیر سوچنے لگا۔ لیکن جب شمر ذی الجوشن سے رائے لی، تو اُس نے سخت ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا: ''ابنِ سعد کو مصالحت یا عہد معاہدہ کرانے کا کیا اختیار ہے......؟ اگر حسین اس وقت ہاتھ سے نکل گئے تو پھر قابو میں نہ آئیں گے۔ اور اپنی طاقت بڑھا کر ہمیں تباہ کر دیں گے، اب صرف ایک صورت ہے کہ یا تو حسین ہماری اطاعت کریں اور یزید کی بیعت کرلیں یا ان سے جنگ کی جائے۔''

ابنِ زیاد نے شمر کی رائے سُن کر اسے پسند کیا۔ اور اس کی تعریف کی اور کہا: اب میں تمھیں روانہ کرتا ہوں، اس (ابن زیاد) نے اسی وقت عمرو بن سعد کے نام ایک حکم نامہ لکھا:

''اگر حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی اطاعت کرلیں تو اُن کو پُر امن طور پر میرے پاس بھیج دو۔ اگر انکار کریں تو فوج کی کمان شمر کو دے دو اور حسین سے لڑائی کر کے ان کا سرتن سے جُدا کر کے یہاں روانہ کرو اور ان کی لاشوں کا مُثلہ کرو، یا گھوڑوں سے رندواؤ اور شمر کے تابع رہو، وہ جو مشورہ دے اسے قبول کرو، کام میں تاخیر نہ ہونے دو، اپنی رائے کو صحیح اور صائب (درست) نہ سمجھو اور اپنے آپ کو خود مختار اور مطلق العنان مت خیال کرو۔''[2]

شمر کی کمان داری

شقی القلب شمر، ابن زیاد کا حکم نامہ لے کر ابنِ سعد کے پاس پہنچا جسے پڑھ کر

---

① تاريخ الطبري: 411/5. ② الكامل لابن الأثير: 284/3، وتاريخ الطبري: 414/5 .

ابنِ سعد مبہوت رہ گیا کہ یہاں تو مصلحت کی سبیل بن رہی تھی اور توقع تھی کہ بھڑکتی ہوئی آگ ٹھنڈی ہو جائے گی مگر یہ کیا بن گیا کہ سارا کام ہی بگڑ گیا۔ یہاں تک اس کی سوچ اچھی تھی۔ کاش! وہ بھی حُر کی طرح ایمانی جرأت سے کام لیتا اور عزت و منصب پر لات مار دیتا اور پیکر حلم و شرافت نواسۂ رسول، جگر گوشہ بتول حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں نہ آتا۔

شمر نے فوج کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ سوار فوج کی کمان عمرو بن سعد کو دے دی اور پیدل لشکر کا کمانڈر خود بن گیا۔ پھر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو کہلا بھیجا کہ اگر اطاعت کر لیں تو بہتر، ورنہ جنگ کے لیے تیار ہو جائیں۔ لیکن حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے ابنِ زیاد کی اطاعت پر شہادت کو ترجیح دی اور کہا: اگر تم مجھے یزید کے پاس جانے دو تو بہت مناسب ہے۔ جو صورت بہتر ہوئی میں اختیار کر لوں گا۔ شمر نے کہا: یوں نہیں ہو سکتا۔ آپ رضی اللہ عنہ کو ابنِ زیاد کی بیعت کرنا ہوگی، اور گورنر کوفہ کی بیعت امیر یزید ہی کی بیعت متصور ہوگی۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''میں سر کٹا تو سکتا ہوں مگر تمھارے یا ابنِ زیاد کے آگے جھکا نہیں سکتا۔''[1] دشمن کے سامنے ایسا جواب کوئی معمولی بات نہ تھی، بہت بڑی بات تھی۔ آپ رضی اللہ عنہ شیر تھے۔ شیر خدا کے لخت جگر تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ میں جرأت و غیرت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اور پھر یہ جرأتمندانہ جواب مد مقابل کو اس وقت دیا جبکہ آپ نہتے تھے۔ ساتھ چند جوان...... باقی خواتین اور بچے تھے، اسلحہ بھی برائے نام تھا۔ ادھر ٹھاٹھیں مارتا ہوا کوفی سپاہ پر مشتمل مہیب لشکر سامنے تھا، اللہ اکبر۔ سلام ہے سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ایمان و ایقان، شجاعت و بسالت اور جرأت و دلیری پر۔ آپ رضی اللہ عنہ بے دین اور ظالم گروہ کے سامنے دبے، نہ جھکے، نہ بکے۔ ہمارے زمانے کے اصحاب جبہ و دستار، عقیدت کیشانِ اہل بیت رضی اللہ عنہم، اہل سیاست، سادات کرام اور ارباب

---

[1] الكامل لابن الأثير: 284/3، وتاريخ الطبري: 414/5.

علم و فضل کو بھی اسوۂ حسین رضی اللہ عنہ اپنے سامنے رکھنا چاہیے۔ اللہ توفیق دے۔ آمین!

شمر وہ سفاک اور درندہ خصلت شخص تھا کہ جس نے طاقت کے بل بوتے پر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو دبانا چاہا۔ اور حالات کو خراب کرنے میں بھر پور کردار ادا کیا۔ کاش! یہ تیرہ باطن، عقل کے ناخن لیتا۔ اپنے رشتے اور آپ رضی اللہ عنہ کے عظیم و رفیع مقام کو پہچانتا اور مفاہمت کی کوشش کرتا۔ لیکن اس نے کام سنوارنے کے بجائے اور بگاڑ دیا۔ اور تاریخ کا رُخ ہی موڑ دیا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دنیا جہاں کی پھٹکاریں مول لے لیں۔ سب لوگ شمر کو سفاک لوگوں میں شمار کرتے ہیں۔ کوئی شخص اپنے بچے کا نام شمر رکھنے پر تیار نہیں۔ لیکن اس کے برعکس حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو ہر شخص عزت و قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ جب بھی صبر و حلم، مردانگی و شجاعت، حیاء و وفا، شرافت و عدالت، تزکیہ و طہارت اور علم و جلالت جیسے اوصاف جلیلہ کا ذکر آتا ہے تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا نام آنکھوں کے سامنے ضرور آتا ہے۔ لوگوں کو ان خوبیوں پر فخر ہے مگر ان خوبیوں کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر فخر تھا۔ ہر شخص آپ رضی اللہ عنہ سے محبت اور عقیدت سے اپنے بچوں کے نام آپ رضی اللہ عنہ کے نام مبارک پر رکھتا ہے کہ شاید اس میں بھی وہ جوہر پیدا ہو جائیں جو آپ میں تھے۔ اور کچھ نہیں تو ایک گونہ حضرت موصوف رضی اللہ عنہ سے نسبت و محبت کا مظاہرہ ہو جائے۔ عالی مقام حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر اللہ تعالیٰ کی کروڑوں اربوں رضائیں ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اور اہل بیت رضی اللہ عنہم کی محبت و عقیدت میں اور بڑھا دے۔ (آمین ثم آمین!)

حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے محبت دراصل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت حقیقت میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے محبت ہے۔

چند اہم نکات

❁ ربّ تعالیٰ کی شان دیکھیے کہ ایک وہ وقت تھا جبکہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے سب دوست احباب، اعزہ اور بہی خواہ آپ رضی اللہ عنہ کو اس سفر سے روک رہے تھے، مگر آپ رضی اللہ عنہ کسی کی بات پر کان دھرنے اور اپنا پروگرام ملتوی کرنے کے لیے تیار نہ تھے، اور ایک یہ وقت ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ واپس جانا چاہتے ہیں، مگر حُر مان رہا ہے نہ عمرو بن سعد۔ اور اگر ان کے ارادے میں کوئی لچک پیدا ہوتی ہے، تو ابنِ زیاد نہیں مانتا، اور اگر ابنِ زیاد قدرے مائل ہوتا نظر آتا ہے، تو تیرہ بخت شمر ذی الجوشن حائل ہو جاتا ہے، سچ کہا قرآنِ حکیم نے: ﴿ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ ''اور تم وہی چاہتے ہو جو اللہ رب العالمین چاہتا ہے، (مطلب یہ کہ) اللہ کی چاہت کے بغیر کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔''[1] اللہ کرے، ہماری سمجھ میں بھی یہ بات آ جائے۔

❁ درحقیقت یہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا اپنا پروگرام نہ تھا، یہ نوشتۂ تقدیر تھا جس کے سامنے آپ رضی اللہ عنہ بے بس تھے۔ کیا خوب کہا اقبال رحمہ اللہ نے ؎

بزور بازوئے تقدیر تدبیریں نہیں چلتیں

❁ یہاں سے دو ایک باتیں اور بھی معلوم ہوئیں اور وہ موعظت کی باتیں ہیں جو عقیدے سے تعلق رکھتی ہیں، جنہیں دبانے کے بجائے بتانا چاہیے۔ شاید کسی کا بھلا ہو

---

① التکویر 81: 29.

جائے، مثلاً یہ کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ عالم الغیب نہ تھے، کیونکہ اگر آپ رضی اللہ عنہ عالم الغیب ہوتے تو حالات معلوم کرنے کے لیے مسلم بن عقیل رحمہ اللہ کو پیشگی روانہ نہ کرتے اور اس پُر خطر سفر کا عزم نہ فرماتے۔ راہگیروں سے وہاں کے حالات دریافت نہ کرتے عورتوں اور بچوں کو ساتھ نہ لاتے۔ مسلم بن عقیل پر ہونے والے مظالم اور ان کی شہادت سے پوری طرح باخبر ہوتے، اور قیس بن مسہر اور عبداللہ بن یقطر کو کوفے نہ بھیجتے۔ اس مسئلے کو قرآن مجید نے خوب حل کر دیا ہے۔ فرمایا:

﴿ قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ﴾

"اے محمد (مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم)! کہہ دیجیے: آسمانوں اور زمین میں اللہ کے سوا کوئی غیب نہیں جانتا۔"[1]

✽ جیسا کہ دوست سمجھتے ہیں کہ امام، عالِم مَا كَانَ وَمَا يَكُونُ ہوتا ہے، یہ عقیدہ صحیح نہیں۔ قرآن مجید برملا کہتا ہے کہ یہ منصب صرف اللہ کا ہے، امام تو رہا الگ کوئی نبی ولی بھی اللہ تعالیٰ کی صفت خاصہ میں شریک ہے نہ شریک ہو سکتا ہے۔ جو شخص ایسا دعویٰ کرتا ہے وہ قرآن مجید کے خلاف دعویٰ کرتا ہے۔

✽ یہاں سے دوسری یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ مشکل کشا اور مالک و مختار نہیں تھے۔ یہ منصب بھی محض اللہ تعالیٰ کا ہے، اور جو لوگ عقیدت و محبت میں آپ رضی اللہ عنہ کو مشکل کشا اور مالک و مختار کہہ دیتے ہیں، بہت بڑی غلطی کا شکار ہیں۔ آپ غور فرمائیے کہ جو خود مشکل میں گرفتار رہا ہو، وہ بھلا مشکل کشا کیسے ہو سکتا ہے؟ اور جو اتنا عاجز و درماندہ ہو کہ نہ واپس جانے کی قدرت رکھتا ہو اور نہ اپنے آپ کو اور اپنے قافلے کو دشمن سے بچا سکتا ہو، وہ بھلا مالک و مختار کیونکر ہو سکتا ہے؟ اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ اور سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے بارے میں اسی طرح کے گمان رکھنا صحیح

---

[1] النمل 27: 65.

نہیں۔ جب وہ عظیم ہستیاں اپنی اولاد کو (جو محبوب ترین ہوتی ہے) دشمن کے چنگل سے نہیں بچا سکیں تو ہمیں مصائب سے کیسے چھڑا سکتی ہیں؟...... یہ سب خوش فہمیاں اور سراسر خود تراشیدہ نظریات و توہمات ہیں، جن کا حقیقت سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ ایسی سوچ اور فکر قرآن وحدیث سے متصادم ہے۔اس لیے اسے بلا تاخیر بدلنا چاہیے۔

✽ اس جگہ ہم ایک بہت اہم بات بیان کرنا چاہتے ہیں، اور وہ اس مشہور خیال یا نظریے کی تردید ہے کہ حسین رضی اللہ عنہ اور یزید کے مابین جو معرکہ ہوا، وہ حق و باطل کا معرکہ تھا۔ اسے حق و باطل کا معرکہ کہنا درست نہیں۔ یہ دلخراش اور المناک حادثہ ایک نوشتۂ تقدیر تھا جو پیش آ گیا، ورنہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے جذبات اور خیالات اپنی جگہ کتنے ہی پاکیزہ کیوں نہ ہوں، بہر حال یہ ماننا پڑے گا کہ آپ رضی اللہ عنہ جہاد و قتال کا ارادہ لے کر نہیں نکلے تھے، اگر آپ رضی اللہ عنہ جہاد و قتال کا ارادہ لے کر نکلتے تو طاقتور اور آزمودہ کار جنگجوؤں کا ایک لشکر اپنے ساتھ لاتے، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ آپ کے ساتھ صرف بہتر (72) افراد پر مشتمل ایک ننھا منا سا قافلہ تھا، جس میں اکثریت مستورات اور معصوم بچوں کی تھی اور گنتی کے چند نوجوان تھے، جو فنون حرب وضرب سے بہت زیادہ واقف نہ تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ حکومت بنی امیہ کو کافر حکومت نہیں سمجھتے تھے جس کے خلاف جہاد و قتال ضروری ہو۔ اور پیچھے بتایا جا چکا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ بس کوفہ کے گوشہ امن و راحت میں جا کر سکون و طمانیت کی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے یا زیادہ سے زیادہ وہاں خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے مطابق خلافت وحکومت کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ موجودہ حکومت پر آپ رضی اللہ عنہ کشادِ دل سے دلشاد و مطمئن نہ تھے۔ آخر یہ حکومت خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی حکومت جیسی تو تھی نہیں۔ بڑا فرق آ چکا تھا جیسا کہ تفصیل آپ پڑھ چکے ہیں۔

جملہ مؤرخین نے لکھا ہے، جس کا خلاصہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ

جب مکے سے عازم کوفہ ہوئے تو اجلہ اصحاب رضی اللہ عنہم نے آپ رضی اللہ عنہ کو جانے سے بہ اصرار روکنے کی کوشش کی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ باطل کے خلاف معرکہ تھا تو اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ رضی اللہ عنہ کو کیوں روکا؟ اگر بات ایسی ہی ہوتی تو کبار صحابہ رضی اللہ عنہم اس سفر سے منع کرنے کے بجائے آپ رضی اللہ عنہ کے ہمسفر ہوتے اور آپ رضی اللہ عنہ کی زیر قیادت جہاد کے لئے نکلتے۔

اگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا کوفہ کے لیے نکلنا واقعی باطل کے خلاف جہاد تھا تو آپ رضی اللہ عنہ نے جہاد جیسے اہم امر میں دعوت عام کیوں نہ دی؟ اور اپنے سفر میں رکاوٹ ڈالنے والوں کو مجرم اور گناہگار کیوں نہ کہا؟ کیونکہ باطل کے خلاف نکلنا جہاد ہے اور جہاد سے روکنا گناہ کبیرہ ہے۔ خیر القرون اور بعد خیر القرون کے دور میں بیشک بہت فرق تھا مگر پھر بھی یہ فاسق، فاجر اور کافر حکومت نہ تھی۔ آپ رضی اللہ عنہ اس کے خلاف علم جہاد بلند کرتے تو کیوں کرتے؟

اگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ باطل کے خلاف نکلے تھے تو آپ رضی اللہ عنہ نے بدلتے ہوئے حالات کو دیکھ کر اپنے قافلے سے یہ کیوں فرمایا تھا:

''اب جس کا جی چاہے واپس ہو جائے میں کسی کی ذمہ داری اپنے سر لینا نہیں چاہتا۔''[1]

یعنی جب جہاد جیسے عظیم عمل کا وقت آیا تو شرکائے قافلہ کو بجائے باطل کے خلاف ابھارنے اور حکومت وقت سے ٹکر لینے کی ترغیب دینے کے آپ نے انھیں واپس جانے کی اجازت کیوں مرحمت فرما دی؟

اگر یہ باطل کے خلاف ٹکر تھی تو ثعلبیہ کے مقام پر حضرت مسلم بن عقیل کی شہادت کی خبر پا کر آپ رضی اللہ عنہ کے قافلے کے ساتھیوں نے بہ منت وسماجت آپ رضی اللہ عنہ کو واپس

---

① الکامل لابن أثیر 278/3، البدایة والنهایة: 170/8.

جانے کا مشورہ کیوں دیا؟ اور یہ سن کر برادرانِ مسلم بن عقیل نے یہ اصرار کیوں کہا: واللہ! ہم اس وقت تک پیچھے نہ ہٹیں گے جب تک کہ اپنے بھائی کا بدلہ نہ لے لیں گے۔'' اگر یہ کفر کے خلاف جہاد تھا تو اس وقت حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا ذاتی رجحان بھی واپسی کا کس لیے ہوا تھا؟ کیا برادرانِ مسلم کے پاسِ خاطر کے لیے آپ رضی اللہ عنہ آگے نہ بڑھے تھے؟

اب یہ قارئین کرام ہی فیصلہ کریں کہ اس قافلے کا مجموعی طور پر آگے جانا بہ نیت جہاد تھا یا بہ نیتِ انتقام؟ اتنا ہم ضرور کہیں گے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی اپنی نیت انتقام کی نہ تھی۔ آپ رضی اللہ عنہ محض برادرانِ مسلم کی دلجوئی کے لیے ساتھ چلے کیونکہ باوفا ساتھیوں کا ساتھ دینا بجائے خود بڑی عزیمت ہے۔ اور یہ ہر کہ ومہ کا کام بھی نہیں۔ یہ آپ رضی اللہ عنہ کی انفرادی خصوصیات میں شامل ہے۔ بہت سے صحابہ و اہلبیت رضی اللہ عنہم کی بھی انفرادی خصوصیات تھیں ان میں ایک یہ وفا کی خصوصیت بھی تھی۔ حسین رضی اللہ عنہ کا برادرانِ مسلم کے ساتھ آگے بڑھنے میں یہی قیمتی جذبہ جلوہ فرما تھا۔ اس کے برعکس اگر کربلا کی جنگ کو باطل کے خلاف جنگ اور جہاد سے تعبیر کیا جائے تو بہت سے سوالات ابھریں گے جیسا کہ ان کی طرف اشارات کیے گئے ہیں اور ان کے جوابات دینا آسان نہیں ہے۔ اور جو جوابات پیش کیے جاتے ہیں ان سے آپ رضی اللہ عنہ کی پوزیشن بجائے صاف ہونے کے اور مخدوش و مشکوک ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ لیکن امر واقع یہ ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کی پوزیشن کوثر و تسنیم کی طرح صاف و شفاف تھی۔ چونکہ آپ رضی اللہ عنہ کی نیت میں مطلق تکدُّر تھا نہ دورنگی۔ لہٰذا آپ رضی اللہ عنہ کا طرز عمل بھی تکدُّر و دورنگی سے پاک اور صاف تھا۔ اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو۔

مختصر یہ کہ مسلم بن عقیل رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر سن کر حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے کوفہ کے بے وفاؤں سے اپنی عنانِ توجہ موڑ لی اور ساتھیوں کو واپس جانے کا مشورہ دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ نہ مانے۔ اور آگے جانے پر مُصرّ ہوئے۔ آپ رضی اللہ عنہ بھی حق وفا ادا کرنے

کے لیے ان کے ساتھ آگے بڑھے۔ مگر اس میں آپ رضی اللہ عنہ کی مجبوری کی سی کیفیت تھی۔

اگر یہ واقعی باطل کے خلاف جہاد تھا تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے حُر بن یزید اور اس کے لشکر سے یہ کیوں فرمایا تھا: ''اگر تم (کوفیوں) کو میرا آنا ناگوار ہے تو میں جہاں سے آیا ہوں وہیں لوٹ جاؤں گا؟'' ...... سب جانتے ہیں باطل سے ٹکر لی جاتی ہے، اس کے سامنے آکر واپسی کا ارادہ تو نہیں کیا جاتا۔ خصوصاً دشمن اسلام کے مقابل آکر پیٹھ پھیر کر نکل جانا ممنوع اور حرام ہے۔ قرآن مجید کا یہی حکم ہے۔[1]

بعد ازاں عمرو بن سعد کا بھاری بھرکم، یعنی چار ہزار سپاہ پر مشتمل لشکر بمقام کربلا آپ رضی اللہ عنہ کو اور آپ رضی اللہ عنہ کے قافلے کو آ لیتا ہے اور آپ رضی اللہ عنہ کے سب راستے مسدود کر دیتا ہے۔ اور پوچھتا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ یہاں کیوں آئے ہیں؟ تو آپ رضی اللہ عنہ جواب دیتے ہیں: ''تمھارے شہر والوں نے مجھے پے در پے خطوط لکھ کر بُلایا ہے، اب اگر تمھیں میرا آنا ناپسند ہے تو میں واپس چلا جاتا ہوں۔''

یہاں بھی ہمارا وہی سوال ہے کہ اگر آپ رضی اللہ عنہ باطل کے ساتھ برسرِ پیکار ہونے کے لئے نکلے تھے، تو پھر باطل کے مقابلے میں آکر واپس پلٹ جانے کا اظہار کیوں فرمایا؟ یہ کیوں نہیں فرمایا؟ تم لوگ فاسق فاجر ہو۔ شراب پیتے ہو۔ بندر پالتے ہو۔ عورتوں کی مجالس اختیار کرتے اور بدعات کا ارتکاب کرتے ہو اس لیے تمھارے خلاف جہاد کرنے اور کلمۂ حق بلند کرنے کے لیے نکلا ہوں۔ آپ رضی اللہ عنہ کو کلمۂ حق بلند کرنے سے کون سا امر مانع تھا؟

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے کربلا کے میدان میں دس (10) محرم سے دو ایک روز قبل عمرو بن سعد سے کہا جیسا کہ آپ پیچھے پڑھ چکے ہیں: ''ہمارے بارے میں آپ تین صورتوں میں سے کوئی اختیار کرلیں:

---

[1] الانفال: 16:8.

1 میں جہاں سے آیا ہوں، وہیں واپس چلا جاؤں۔

2 یا میں یزید کے پاس پہنچ جاؤں اور خود اس سے معاملہ طے کرلوں۔

3 یا مجھے مسلمانوں کی کسی ایسی سرحد پر پہنچا دیں، جہاں کفار ہوں تا کہ ان سے لڑتا ہوا جان دے دوں......"

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا یہاں کربلا میں تشریف لانا اور خیمہ زن ہونا باطل کے مقابلے میں تھا۔ تو اب مقابلے کے وقت پیچھے کیوں ہٹ رہے تھے؟ باطل کے بالمقابل آ کر پیچھے ہٹنا یا واپس جانے کی اجازت چاہنا یہ کہاں جائز ہے؟...... اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ آپ رضی اللہ عنہ موجودہ حکومت کو کافر، فاسق، فاجر اور بدعتی نہیں سمجھتے تھے کہ اس کے ساتھ جہاد وقتال کیا جائے۔

حقیقت یہی ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ یزید کو باطل پرست جانتے تھے نہ اس کی حکومت کو باطل حکومت کہتے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ کا یزید اور حکومتِ یزید سے بیشک اختلاف تھا مگر اختلاف اور سببِ اختلاف اور تھا جس کا پیچھے ہم ذکر کر چکے ہیں، اختلاف اَولویت و افضلیت کا تھا، نہ کہ اسلام اور کفر کا، حق اور باطل کا۔ حد سے حد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ رضی اللہ عنہ کے مبارک ذہن میں نظام حکومت چلانے کا جو خاکہ تھا وہ موجودہ حکومت کے خاکے سے بہتر تھا۔ اور آپ رضی اللہ عنہ اپنی رائے میں حکمرانی کے لیے اصحاب علم وفضل اور اربابِ شرف وتقویٰ کو زیادہ موزوں خیال کرتے تھے اور اپنے خاندان کو فائق سمجھتے تھے۔ علاوہ ازیں آپ رضی اللہ عنہ بجائے رخصت کے عزیمت اختیار کرنا چاہتے تھے۔ ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ آپ رضی اللہ عنہ اختلاف رائے، فتنہ وفساد، جوڑ توڑ، ڈپلومیسی کو حد درجہ ناپسند جانتے تھے۔ اس راستے کو آپ طویل، پُر خطر اور خاص طور پر اپنی شان سے فروتر جانتے ہوئے اس سے گریز فرماتے تھے۔ اگر آپ رضی اللہ عنہ حکومت یزید کے خلاف کھل کر آواز بلند کرتے تو یقیناً آپ رضی اللہ عنہ کے گرد بھی کافی لوگ جمع ہوجاتے، مگر

یہ انداز، شریعت، صحیح سیاست، تقویٰ اور آپ رضی اللہ عنہ کے فضل و شرف سے ہم آہنگ نہ تھا۔
یہ سب نکات غور کرنے کے ہیں، مگر ہماری عنان توجہ اِدھر کبھی منعطف ہی نہیں ہوئی۔
اور ہماری بدقسمتی کہ ایک خاص مذہبی یا سیاسی پروپیگنڈے نے بات کو کچھ سے کچھ بنا دیا، اور داستانِ کربلا کو ایسے غلو، غازہ، رنگ آمیزی، حاشیہ آرائی اور داستان سرائی سے بیان کیا کہ بات کیا سے کیا بن گئی۔ حقیقت اوجھل ہوگئی اور افسانہ باقی رہ گیا۔ اناللہ۔ پہلے اپنا ذہن بنایا پھر کتابوں سے رنگارنگ حوالے اکٹھے کرنا شروع کر دیے۔

❁ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی دوسری شرط ''یا میں یزید کے پاس پہنچ جاؤں'' اس کا پیچھے بر سبیل تذکرہ مختصراً ذکر کیا گیا ہے لیکن اب اس پر تھوڑی بحث کر کے آگے بڑھتے ہیں۔ اور یہ بحث ہمارے پیش کردہ نظریے کو واضح اور مبرہن کرنے میں اچھی خاصی مفید ثابت ہوگی۔ اُمید ہے قارئین تنگ نظری اور آبائی تعصب سے الگ ہو کر آمدہ سطور کا مطالعہ فرمائیں گے۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے یزید کے پاس جانے کی خواہش کا جو اظہار فرمایا تھا اگر ہم بہ نظرِ غائر دیکھیں تو یہ اپنے پہلو میں یقیناً بڑی حکمت رکھتا ہے، اور ہمارے بہت سے مسائل و مشکلات کو حل کرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے باوجود یزید سے اختلاف رکھنے کے اب اس کے پاس جانے کی اجازت چاہی، تاکہ معاملے کے حل کی کوئی صورت نکل آئے اور یہ اچھی بات تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ رضی اللہ عنہ یزید کو معقول، صلح جُو اور بااصول انسان سمجھتے تھے۔ کیونکہ اگر یوں نہ سمجھتے تو یزید کے پاس جانے اور خود اس سے معاملہ طے کرنے کی بات ہرگز نہ فرماتے۔ اکھڑ، تُند خو، ضدّی، اور بدکردار آدمی سے ایسی توقع رکھنا عبث ہی نہیں غیر دانشمندانہ قرار دیا جاتا ہے۔ جو آپ رضی اللہ عنہ جیسے باریک بین اور عظیم معاملہ فہم انسان کی شان سے بعید ہے۔

دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ اگر یزید باطل پرست تھا تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ اسے

ملنے اور اس سے سمجھوتہ کرنے کے خیالات و جذبات کا اظہار کیوں فرماتے رہے؟ باطل پرست سے ''سمجھوتہ'' چہ معنی دارد؟ حضرت حسین رضی اللہ عنہ ان جملہ پیش آمدہ واقعات و حادثات کا اصلی اور بنیادی مجرم اہلِ کوفہ کو سمجھتے تھے، جنھوں نے پہلے عقیدت و محبت کا بھرپور اظہار کیا، سینکڑوں خطوط لکھے اور پُر زور دعوت دی مگر پھر جلد ہی آنکھیں پھیر لیں، چنانچہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا: «قَدْ خَذَلَنَا شِيعَتُنَا» ''ہمارے شیعوں نے ہمیں تنہا چھوڑ دیا۔''[1] نیز فرمایا ''تمھارے ارادوں پر لعنت ہو اے بے وفایان، جفاکاران، غداران، تم پر، تم نے شمشیر کینہ مجھ پر کھینچی۔''[2]

اس میں بھی شک نہیں کہ آپ رضی اللہ عنہ ابنِ زیاد سے بھی بے حد کبیدہ خاطر اور ناراض تھے کیونکہ اس نے مسلم رضی اللہ عنہ اور ان کے بچوں قیس و عبداللہ رحمہ اللہ کو شہید کیا، اور اس نے آپ رضی اللہ عنہ کے راستے مسدود کر دیے۔ مگر ان سب مظالم کے باوجود ان تمام تر گھناؤنے واقعات کا مرکزی کردار آپ رضی اللہ عنہ کوفہ والوں کو جانتے تھے، جیسا کہ ابھی آپ نمونے کے دو حوالے ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ یہاں اصل بات جو ہم بتانا چاہتے ہیں یہ ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے یزید پر کوئی فردِ جرم عائد نہ کی، اور اصل کیس میں اسے نہ رکھا۔ جس سے صاف عیاں ہوتا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ اس کارروائی میں یزید کو ملوث نہیں پاتے تھے۔ اگر آپ رضی اللہ عنہ اس میں یزید کا ہاتھ محسوس کرتے تو اس کے اظہار سے آپ رضی اللہ عنہ کو کون سی بات روک سکتی تھی؟ آپ رضی اللہ عنہ نے عین جنگ کے وقت جو خطاب فرمایا اور اس میں شیعانِ کوفہ کو مجرم کہا۔ وہاں یزید کا بھی نام لے سکتے تھے۔ مگر آپ رضی اللہ عنہ نے کسی موقع پر بھی اس پر کوئی الزام عائد نہیں کیا۔ سب جانتے ہیں کہ آپ رضی اللہ عنہ بڑے جرأتمند، بہادر، حق گو اور صداقت پسند تھے۔

ہم اُن تواریخ سے متفق نہیں جنھوں نے داستان سرائی سے کام لیا، اور ذاتی

---

[1] خلاصة المصائب 49، الكامل لا بن أثير: 278/3، البداية والنهاية: 170/8. [2] جلاء العيون 468.

رجحان، بیرونی پروپیگنڈہ اور ہوا کا رُخ دیکھ کر تمام بوجھ ایک یزید پر ڈال دیا۔ اربابِ تحقیق کی رائے مستند تاریخی استشہاد اور فکر سلیم، اس غیر معتدل اور ناہموار نظریے کو تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہے کہ تمام ہدایات یزید کی تھیں، اور اصل قصوروار وہی تھا۔

یہاں تحقیقات تو کچھ اور بھی بتلاتی ہیں، مثلاً جنھوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کیا وہ یہی ''محبانِ اہلِ بیت'' تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قاتل بھی یہی لوگ تھے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے ذلت آمیز سلوک بھی انھی لوگوں نے کیا تھا، چنانچہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا اپنا ارشاد گرامی ہے، جو آپ رضی اللہ عنہ نے شیعان کوفہ سے فرمایا، اور اس میں کوئی لگی لپٹی نہیں رکھی۔ فرمایا:

«وَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَنَقَضْتُمْ عَهْدَكُمْ وَخَلَعْتُمْ بَيْعَتِيْ مِنْ أَعْنَاقِكُمْ فَلَعَمْرِيْ مَاهِيَ لَكُمْ بِنُكْرٍ لَقَدْ فَعَلْتُمُوْهَا بِأَبِيْ وَأَخِيْ وَ ابْنِ عَمِّي مُسْلِمٍ»

''تم نے اپنے وعدوں کو گلدستہ طاق نسیان بنا دیا، میری بیعت کو توڑ دیا، واللہ! یہ بات کوئی تعجب انگیز نہیں، تم قبل ازاں ایسی عہد شکنی اور بے وفائی میرے والد ماجد اور میرے گرامی قدر بھائی اور میرے برادر عم زاد مسلم رضی اللہ عنہم سے کر چکے ہو۔''[1] یعنی تم لوگ روایتی ہی نہیں نسلی بے وفا، عہد شکن اور ظالم ہو۔

تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو زہر بھی انھوں نے دیا، حضرت مسلم کے علاوہ ان کے دو بچوں حضرت قیس رحمہ اللہ، حضرت عبداللہ رحمہ اللہ اور خود حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور آپ رضی اللہ عنہ کے خانوادہ کی شہادت کا سبب بھی یہی جفا پسند کوفی بنے۔ جن لوگوں کا ایمان بجائے اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے، دولت اور حکومت پر ہو، بھلا وہ ان ابرار واخیار بزرگوں کے وفادار کیسے ہو سکتے تھے؟ یہ بات برسبیل تذکرہ نوک قلم پر آ گئی ورنہ ہم مستند تاریخی استشہادات وواقعات، درایت وفکر کی روشنی میں بتا رہے ہیں کہ اس پورے کیس کے

---

[1] تاریخ الطبري: 403/5، والکامل لابن الأثیر: 280/3۔

اصل مجرم شیعانِ کوفہ تھے نہ کہ یزید تھا۔حقائق وشواہد اور تاریخی واقعات اس پر شاہد ہیں کہ یزید ان مظالم اور قہرمانیوں سے بری تھا۔اصل مجرموں کو نکال کر سارا بوجھ اس اکیلے یزید پر ڈال دینا تاریخی حقائق کے خلاف ہے۔یہ تفصیل آگے آ رہی ہے۔

لاہور کے کوئی ڈاکٹر محمود ساقی صاحب ہیں جنہوں نے ژرف نگاہی سے کام لیے بغیر''امام حسین اور یزید کے وکیل'' نامی کتاب لکھ کر اپنے مخصوص فرقے کے مخصوص خیالات کی ترجمانی کی ہے۔اور کئی صفحات جناب ڈاکٹر کرنل عمر صاحب کی ضخیم کتاب سے نقل کیے ہیں۔جس میں کرنل صاحب نے بڑی عرقریزی سے مختلف نظریات کی ترجمانی کی کوشش فرمائی ہے۔اس میں بعض باتیں بڑی اچھی ہیں، مگر ہمارے بہت سے مفاہیم پر انہوں نے غور نہیں کیا۔

اصل موضوع جو دلائل وشواہد کی روشنی میں ہم پیش کرتے آ رہے ہیں یہ ہے کہ معرکۂ کربلا کو ایک اتفاقی حادثہ اور افسوسناک سانحہ امر ربی اور نوشتۂ تقدیر تو کہا جا سکتا ہے مگر حق و باطل کا معرکہ نہیں کہا جا سکتا۔

اتفاقی حادثہ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ اس کی پیشگی تیاریاں تھیں نہ عزائم۔بلکہ کسی کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں تھی۔اس سلسلے میں گذشتہ صفحات میں متعدد دلائل وشواہد پیش کیے جا چکے ہیں جن کا اللہ کے فضل وکرم سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔اب ذیل میں ایک آخری بھاری اور معقول شہادت پیش کی جاتی ہے جس کے مطالعے کے بعد یہ سمجھنا کوئی مشکل نہیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ یزید کو کیسا خیال کرتے تھے۔یعنی آپ رضی اللہ عنہ کے امیر یزید کے بارے میں کیسے تأثرات تھے۔

عام مؤرخین نے کربلا میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی تین تجاویز کو محض ایک سطحی انداز سے لکھ دیا ہے کہ جس سے آدمی کا ذہن کسی خاص نتیجے تک نہیں پہنچتا۔ہم وہ نکتۂ حقیقت طراز ضروری وضاحت کے ساتھ بیان کرنا چاہتے ہیں جس کو پیشِ نظر رکھنے

سے حقائق سامنے آتے ہیں اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی پوزیشن بالکل صاف ہو جاتی ہے۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ جب کربلا میں محصور ہو گئے تو آپ رضی اللہ عنہ نے عمرو بن سعد کو تین تجاویز پیش کیں جنہیں قریب قریب سب مؤرخین نے بیان کیا ہے۔ ان میں سے ایک تجویز میں جہاں آپ رضی اللہ عنہ نے یزید کے پاس جانے کا ذکر کیا وہاں آپ رضی اللہ عنہ نے یزید کے پاس جانے کا مقصد بھی بیان فرمایا، جس کو نکتہ رس، اور باریک بین حضرات نے نوٹ کیا ہے، وہ مقصد آپ رضی اللہ عنہ کے ہی الفاظ میں ملاحظہ ہو، آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

«فَأَضعُ يَدِيْ عَلٰى يَدِ يَزِيْدَ»

''مجھے یزید کے پاس جانے دو تاکہ میں اس کی بیعت کروں۔''

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا یہ ارشادِ گرامی متعدد شیعہ وسنی کتب میں موجود ہے، آپ رضی اللہ عنہ کا یہ فرمان اگرچہ ہم پیچھے بیان کر چکے ہیں، لیکن معمولی لفظی تغیر کے ساتھ اہلِ تاریخ نے یہ الفاظ بھی بیان کیے ہیں۔ مثلاً: «فَأَضَعُ يَدِيْ فِيْ يَدِهٖ»

''میں اس (یعنی یزید) کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دوں۔''

«حَتّٰى أَضَعَ يَدِيْ فِيْ يَدِ يَزِيْدَ»

''یہاں تک کہ میں یزید کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ رکھ دوں''

«فَأَضَعُ يَدِیْ فِیْ يَدِهٖ فَيَحْكُمُ فِی مَارَأَى»

''پس میں اپنا ہاتھ اس (یعنی یزید) کے ہاتھ میں دے دوں پھر وہ جو مناسب سمجھے گا کر لے گا۔''

«أَضَعُ يَدِیْ فِیْ يَدِ يَزِيْدَ بْنِ مُعَاوِيَةَ»

''میں یزید بن معاویہ کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دوں۔''

«أَوْ أَنْ يَأْتِیَ يَزِيْدَ ابْنَ عَمِّهٖ حَتّٰى يَضَعَ يَدَهٗ فِيْ يَدِهٖ»

''یا وہ (مراد خود حضرت حسین رضی اللہ عنہ ہیں)، اپنے چچا زاد برادر یزید کے پاس جائیں اور اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیں۔''

«أَوْ أَنْ أَضَعَ يَدِي عَلَىٰ يَدِ يَزِيْدَ فَهُوَ ابْنُ عَمِّي لِيَرَىٰ فِي رَأْيِهِ»

''یا میں اپنا ہاتھ یزید کے ہاتھ میں دے دوں اور وہ میرا چچا زاد بھائی ہے تاکہ وہ جو مناسب سمجھے کر لے۔''

ان سب عبارتوں کے حوالے موجود ہیں۔ نام نیچے آ رہے ہیں اور اگر ترجمہ غلط ہو تو ہماری اصلاح کر دی جائے۔ اور اگر دونوں باتیں درست ہوں تو براہ کرم انھیں دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔ کیونکہ آپ رضی اللہ عنہ کے ایسے فیصلہ کن الفاظ پر سانحہ کربلا کی حقیقت اور حیثیت کا فیصلہ منحصر ہے۔[1]

معزز قارئین! یہ الفاظ تلخیص شافی، اعلام الوریٰ، ناسخ التواریخ، الامامۃ والسیاسۃ، تاریخ طبری، کامل ابن اثیر، البدایہ والنہایہ، الاصابہ، تاریخ الخلفاء، تاریخ ابن خلدون وغیرہ متعدد کتب میں مذکور ہیں۔ وہاں آپ ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

فریقین کی معتبر کتب میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے یہ ارشادات مبارکہ روزِ روشن کی طرح چمک رہے ہیں، بحمد اللہ کوئی ذی علم ان کا انکار نہیں کر سکتا لیکن ضد، تعصّب، تقلید و جمود یا لاعلمی کی وجہ سے کسی کو خبر نہ ہو، یا کوئی نہ دیکھے تو اس کی مرضی۔

؎ آنکھیں اگر بند ہیں تو دن بھی رات ہے
بھلا اس میں کیا قصور ہے آفتاب کا؟

بیشک آپ رضی اللہ عنہ یزید کے پاس دمشق جانا چاہتے تھے اور اس قضیہ کو، بجائے طول دینے کے خوش اسلوبی سے حل کرنے کے آرزومند تھے، تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کی وجہ سے اپنے پہلے منصوبہ کو ختم کرنے کے متمنّی تھے، کیونکہ آپ رضی اللہ عنہ کا وہ منصوبہ اہلِ

[1] اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو اس سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر سے ہر الزام ختم ہو جاتا ہے۔

کوفہ کی عیاری وغداری کی وجہ سے پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا، اب شرعاً ضروری تھا کہ آپ رضی اللہ عنہ حاکمِ وقت کی بیعت کرتے، چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ نے اس کا صاف اور صریح الفاظ میں عمرو بن سعد کے سامنے اظہار فرما دیا۔ لیکن شمر آڑے آ گیا اور آپ رضی اللہ عنہ باوجود خواہش کے یزید کے پاس نہ پہنچ سکے۔ اگر ابن زیاد، ستم پیشہ شمر ذی الجوشن کے غلط مشورے پر عمل پیرا نہ ہوتا تو اس وقت تاریخ کا نقشہ کچھ اور ہوتا، حادثہ کربلا رونما ہوتا، نہ اسلام میں کوئی الگ فرقہ جنم لیتا۔ امت کو فساد کی آگ میں جھونکنے اور ملت اسلامیہ کا بٹوارہ کرنے میں جن ورندہ طینت لوگوں کا ہاتھ ہے ان میں شمر کا نام سرِ فہرست آتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا ارشاد ''کہ مجھے چھوڑ دو میں یزید، جو میرا برادر عم زاد ہے، خود اس کے پاس جا کر اس کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں۔'' یہ بتا رہا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ یزید کو باطل پرست یا فاسق وفاجر نہ جانتے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ کا یہ فرما دینا، اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کی نگاہ میں یزید مسلمان تھا اور اس کی حکومت اسلامی تھی، ورنہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ فاسق وفاجر یا کافر کی بیعت کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔

کہاں ہیں وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں: ''کہ آپ رضی اللہ عنہ باطل سے ٹکر لینے کے لیے نکلے تھے، آپ رضی اللہ عنہ نے شہید ہو کر اسلام کو بچا لیا؟ اگر آپ رضی اللہ عنہ شہید نہ ہوتے تو اسلام ختم ہو جاتا؟ آپ رضی اللہ عنہ لا الہ کی بنیاد ہیں، آپ رضی اللہ عنہ سے قبل لا الہ کی بنیاد نہ تھی وغیرہ وغیرہ'' اور جائے حیرت یہ کہ دین وملت کے بڑے بڑے مفکر، بڑے بڑے قائد، اہلِ قلم اور عبقری اس رَو میں بہہ گئے، اور ایسی باتیں کرنے لگے جن کی تائید واقعات وحالات کرتے ہیں نہ دلائل وشواہد۔ یعنی بقول ان کے اسلام کو حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں بچایا، بدر وحنین کے جاں نثاروں نے نہیں بچایا۔ تیر وتلوار کے بے محابا حملوں سے اپنے جسم کو چھلنی کروانے والے سربکف مجاہدین اسلام نے نہیں بچایا، بلکہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے بچایا۔ ایک جانب تعریف کرتے وقت دوسری طرف کا بھی خیال رکھنا

چاہیے کہ بات کا مفہوم کیا بنتا ہے۔ اور دیکھنا چاہیے کہ ہماری اس مبالغہ آمیز تحریر و تقریر سے کسی دوسرے کی تحقیر یا حقائق کی تردید تو نہیں ہو رہی؟...... مگر افسوس! حقائق سے صرفِ نظر کر کے ایک ہی راگ الاپا جا رہا ہے کہ کربلا کی جنگ حق و باطل، کفر و اسلام، توحید و شرک کی جنگ تھی، وغیرہ وغیرہ، کوئی بھی غور نہیں کرتا کہ حقیقت حال اور امر واقعہ کیا تھا۔ ایسے لوگ بظاہر حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے عقیدت و محبت کا اظہار کرتے ہیں، مگر مبنی بر دروغ و کذب ہونے کی وجہ سے آپ رضی اللہ عنہ کی شان کے بھی خلاف باتیں کرتے ہیں۔ جو آپ رضی اللہ عنہ کے مزاج کے بھی خلاف ہیں اور آپ کے حق گویانہ و حق پرستانہ مشن کے بھی منافی۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ جھوٹ موٹ، مبالغہ آمیز اور خلاف واقعہ باتوں کو پسند کرتے تھے نہ ان کی تشہیر گوارا فرماتے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ حق گو اور حق پرست تھے۔ حق، جھوٹ موٹ اور فرضی داستانوں اور افسانوں کو نہیں کہتے بلکہ اصلی، سچی اور سولہ آنے کھری باتوں کو کہتے ہیں۔ اور جس بات میں جھوٹ اور باطل کی آمیزش ہو وہ بات حق نہیں رہتی۔ ذیل کے اشعار جو زبان زد خاص و عام ہیں، بھی اسی طرح کے ہیں، انھیں فقط پروپیگنڈہ یا محض جذبات اور عقیدت کی بنا پر کہہ دیا گیا ہے۔ لیکن یہ امر واقع کے خلاف ہیں۔ مثلاً:

قتلِ حسین رضی اللہ عنہ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

یا

شاہ است حسین پادشاہ است حسین
دین است حسین، دین پناہ است حسین
سرداد نہ داد دست در دستِ یزید
حقا کہ بنائے لا اِلٰہ است حسین

یعنی حضرت حسین رضی اللہ عنہ شاہ ہیں بادشاہ ہیں، آپ دین بھی ہیں اور دین کی

حفاظت بھی ہیں۔ آپ نے اپنا سر تو دے دیا مگر یزید کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ نہیں دیا۔ قسمیہ اور حق سچ بات یہ ہے کہ آپ کلمہ شریف لا اِلٰہ اِلا اللہ کی بنیاد ہیں۔ جس طرح بنیاد کے بغیر عمارت قائم نہیں رہ سکتی اسی طرح آپ کے بغیر کلمہ شریف قائم رہ سکا نہ قائم رہ سکتا ہے۔

یہ اشعار حضرت خواجہ اجمیری رحمہ اللہ کی طرف منسوب ہیں۔ بالفرض ان کے بھی ہوں پھر بھی قابل قبول نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ اشعار حقائق و شواہد کے سراسر خلاف اور پوری طرح شیعیت کے آئینہ دار ہیں۔ آیئے ذرا حقائق کی دنیا میں قدم رکھیے اور سطور ذیل کا توجہ سے مطالعہ کیجئے۔

یہ ایک حقیقت ہے جسے سب لوگ جانتے ہیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کوفیوں کے بلانے پر عازم کوفہ ہوئے تھے، اب سوال پیدا ہوتا ہے، اگر آپ رضی اللہ عنہ بالفرض کوفہ تشریف نہ لے جاتے اور زندہ وسلامت رہتے تو کیا آپ رضی اللہ عنہ کے زندہ وسلامت رہنے سے اسلام زندہ وسلامت نہ رہتا؟...... کتنی عجیب ہے یہ سوچ؟ اور کتنے حیرت زدہ ہیں یہ خیالات؟

اصل بات یہ ہے کہ حبِّ حسین رضی اللہ عنہ کے نام پر قاتلینِ حسین رضی اللہ عنہ کی ایک چال تھی جسے بہت سے سنّی بھائی بھی سمجھ نہیں پائے۔ کتب کھنگالنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت میں کوفی (بالواسطہ اور بلا واسطہ دونوں طرح) شریک تھے، کیونکہ کچھ کوفی تو آپ رضی اللہ عنہ کو اپنے ساتھ لا رہے تھے اور کچھ کوفی اِدھر اُدھر سے آپ رضی اللہ عنہ کے ساتھ آ ملے تھے، چنانچہ شیعہ دوستوں کی معتبر کتاب خلاصۃ المصائب میں لکھا ہے:

«لَیْسَ فِیهِمْ شَامِیٌّ وَلَا حِجَازِیٌّ بَلْ جَمِیْعُهُم مِنْ أَهْلِ الْكُوْفَةِ»

''یعنی قاتلینِ حسین رضی اللہ عنہ صرف کوفی تھے، ان میں نہ کوئی شامی تھا نہ حجازی۔''[1]

اب کوفیوں کو یہ خطرہ لاحق تھا کہ اگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کربلا سے براہِ راست یزید

[1] خلاصة المصائب، ص :201.

تک پہنچ گئے تو ہمارا سب راز خلیفہ یزید کے سامنے آشکار ہو جائے گا، کیونکہ حسین رضی اللہ عنہ کے پاس ہمارے خلاف تحریری ثبوت اور ٹھوس استشہادات موجود ہیں، انھیں اپنی ذلت ہی کا نہیں موت کا خطرہ تھا، چنانچہ انھوں نے فضا کو مسموم بنایا، اور خوفناک حالات پیدا کر کے پیکر حلم وشرافت، مجسمہ حیا و وفا، نمونۂ صبر و رضا حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور قافلہ حسین پر دھاوا بول دیا، جس کے نتیجے میں بھیانک لڑائی ہوئی اور کوفیوں نے آپ رضی اللہ عنہ اور آپ رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں کو ظلم کرتے ہوئے شہید کر دیا۔ انا للہ۔ اور اپنی خفّت مٹانے اور اپنے اوپر سے ذلت کا داغ دور کرنے کے لیے طرح طرح کے ہتھکنڈے اختیار کیے۔ مثلاً روئے، پیٹے، کپڑے پھاڑے، بال نوچے، نالہ وشیون بلند کیا، محفلیں اور مجلسیں منعقد کیں۔ آپ رضی اللہ عنہ کی ذات کے ساتھ پہلے سے بڑھ کر مصنوعی عقیدت کا ڈھنڈورا پیٹا۔ آپ کے نام کو جس قدر ہوسکا اچھالا۔ آپ رضی اللہ عنہ کے نام کے نعرے لگائے۔ شہداء کی شبیہیں بنائیں۔ تابوت وعلم بنا، سجا کر بازاروں میں جلوس نکالے۔ اور دنیا کے سامنے آشکارا کیا کہ خاندانِ اہل بیت اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہم سے بڑھ کر گویا کسی کو محبت نہیں۔ طرح طرح کے مرثیے پڑھے۔ نظمیں لکھیں۔ اور یہ مشہور کرنے کی کوشش کی کہ سانحۂ کربلا سے قبل شجر اسلام پژمردہ تھا۔ سانحہ کربلا کے بعد شاداب ہوا ہے، اس بھرپور اور زوردار پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر شعراء اور ادباء نے بھی یہ کہنا شروع کر دیا ''اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد''

ان کے خیال میں گویا آپ رضی اللہ عنہ کے زندہ رہنے سے اسلام مردہ ہوا جاتا تھا۔ اور آپ رضی اللہ عنہ کو شہید کر دینے سے اسلام زندہ ہو گیا۔ لاحول ولاقوۃ......

قارئین کی خدمت میں عرض ہے اگر ان باتوں پر کبھی پہلے غور نہیں کیا تھا یا وقت نہیں ملا تھا تو اب ہی کر لیں۔ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے نتیجے میں اسلام کو جو زندگی ملی ایک نظر وہ بھی دیکھ لیں۔ اس کے لیے زیادہ بہتر ہے کہ شیعہ احباب ہی کی

کتب ملاحظہ فرمائیں۔ لکھا ہے:

[1] حضرت زین العابدین علیہ السلام سے روایت ہے کہ حضرت حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد پانچ آدمیوں کے سوا باقی سب مرتد ہو گئے، ...... چنانچہ حضرت امام جعفر علیہ السلام کے حوالے سے لکھا ہے آپ فرماتے ہیں کہ ''شہادتِ حسین کے بعد تین آدمیوں کے سوا سب لوگ مرتد ہو گئے۔''[1]

ان دونوں حوالوں میں جو نام بتائے گئے ہیں، ان میں حضرت زینب رضی اللہ عنہا اور حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہ کے اسمائے گرامی نہیں ہیں۔

[2] امام باقر علیہ السلام فرماتے ہیں: «فَلَمَّا أَنْ قُتِلَ الْحُسَيْنُ اِشْتَدَّ غَضَبُ اللّٰهِ» ''جب حسین علیہ السلام شہید کیے گئے تو اللہ کا غضب بڑھ گیا۔''[2]

[3] ''حضرت زین العابدین علیہ السلام ہر وقت روتے رہتے تھے کہ آپ کی شہادت سے اہلِ جہاں گمراہ ہو گئے، خدا کا دین ضائع ہو گیا اور رسولِ خدا کی سنتیں معطل اور بنو امیہ کی بدعات ظاہر ہو گئیں۔''[3]

حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور آپ رضی اللہ عنہ کے گرامی منزلت رفقاء کی مظلومانہ شہادت کے بعد جو اسلام کو زندگی ملی وہ آپ نے ملاحظہ فرما لی کہ عام لوگ مرتد ہو گئے، غضب الٰہی بڑھ گیا، دین ضائع ہو گیا، سنتیں ختم ہو گئیں اور بدعات کو فروغ حاصل ہوا۔

یہاں ہم اتنی بات کی وضاحت کر دیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی نیت پہلے بھی اچھی تھی اور بعد میں بھی اچھی تھی۔ آپ رضی اللہ عنہ «فَأَضَعُ يَدِيْ فِي يَدِهٖ» کا جملہ فرما کر ہر اعتراض سے بری الذمہ ہو گئے اور اللہ کی رحمت سے پاک صاف ہو کر فردوس اعلیٰ میں پہنچ گئے۔ جو لوگ آپ رضی اللہ عنہ پر کوئی قصور یا الزام دھرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ آپ رضی اللہ عنہ

---

[1] مجالس المومنین مجلس پنجم، ص: 35، ورجال کشی: 81. [2] اصول کافی، ص: 232.
[3] جلاء العیون، ص: 453.

نے اس سفر کی بدولت حالات کو ابتر کر دیا۔ حکومت وقت کو پریشانی سے دوچار کر دیا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے غیر شرعی پیش قدمی کی اور یوں آپ رضی اللہ عنہ نے اپنے عمل سے امت کا بٹوارہ کر دیا۔ ایسی باتوں کو اس طرح کے بھونڈے انداز سے پیش کر کے آپ رضی اللہ عنہ پر متعدد فرد ہائے جرم عائد کر کے خاکم بدہن آپ رضی اللہ عنہ کے خلاف لوگوں کا ذہن بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم ان سے متفق نہیں، اور اسی بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ آپ رضی اللہ عنہ پر ظلم وستم ہوا، آپ رضی اللہ عنہ کی شہادت مظلومانہ تھی۔ کیونکہ آپ رضی اللہ عنہ جنگ کے لیے نکلے، نہ جنگ کی خواہش کی۔ نہ کسی سے لڑائی مول لی، نہ کسی کو قتل کیا، نہ کسی کے قتل کا مشورہ دیا۔ بلکہ آپ رضی اللہ عنہ نے اصلاح احوال کی کوشش فرمائی۔ مصالحت کی راہ نکالی، بہترین تجاویز پیش فرمائیں۔ اور مستند تاریخی استشہادات سے یہ ثابت ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کسی کلمہ گو سے (اندر اس کا خواہ کیسا ہو) ہرگز نہیں الجھے۔ نہ الجھنا چاہتے تھے...... اس کے برعکس وہ لوگ شدید خاطی اور مجرم ہیں کہ جنھوں نے آپ رضی اللہ عنہ کی ان پیاری پُر امن، مبنی بردانش اور حکیمانہ تجاویز کو ٹھکرا دیا۔ ہمارا ظنّ ہے وہ عذابِ الٰہی سے دامن نہیں بچا سکتے۔ اور ستم بالائے ستم یہ کہ ان ظالم اور انسان نما بھیڑیوں نے آپ رضی اللہ عنہ پر تیغ جفا چلانے کے علاوہ آپ رضی اللہ عنہ کے معصوم و بے گناہ بچوں پر ہاتھ صاف کرنے سے دریغ نہ کیا۔ شاید اس سے بڑھ کر اس نوعیت کا المناک و کربناک سانحہ چشمِ فلک نے نہ دیکھا ہو۔ مختصر یہ کہ آپ اور آپ کے سب ساتھی حد درجہ نیک، شریف، معزز اور مظلوم تھے۔

یہ داستان خونچکاں تھی، ایک طرف طاقت تھی دوسری طرف شرافت، ایک طرف علم تھا دوسری طرف جہالت، ایک طرف ظلم تھا دوسری طرف عدالت، ہم ان سب باتوں کو تسلیم کرتے ہیں اور تسلیم کرنا چاہیے، مگر اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ ایک سانحہ تھا جو سوئے اتفاق سے پیش آ گیا۔ اور قصد، ارادے اور پیشگی پلاننگ اور تیاری کے بغیر تھا۔ اور اب بھی ہمارا مؤقف یہی ہے کہ یہ جہاد تھا نہ حق و باطل کی جنگ تھی،

لہٰذا اسے معرکۂ حق و باطل کہنا درست نہیں۔ اگر بات یونہی ہوتی تو ہم کہہ چکے ہیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ باقاعدہ جنگجوؤں کی فوج لے کر نکلتے۔ اور پھر یزید کی بیعت کا کبھی دبے الفاظ میں بھی اظہار نہ فرماتے، اور کبھی اقرار نہ کرتے۔

اور یہ بات بھی غلط یا بے وزن نہیں ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے میدانِ کربلا میں پہنچ کر اہلِ کوفہ کی غداری اور فریب کاری دیکھ کر اپنے موقف، منصوبے اور پروگرام میں تبدیلی فرمالی تھی، خود بتایئے اگر آپ رضی اللہ عنہ اسلام کی سربلندی اور کفر کے خاتمے کے خلاف نکلے تھے تو پھر ارادے میں یہ تبدیلی کیسی تھی؟

بات سیدھی سی ہے اور اس میں کوئی اشکال بھی نہیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ اپنے آپ کو خلافت کا حقدار سمجھتے تھے۔ ویسے اگر ہماری رائے پوچھی جائے تو ہم کہیں گے کہ عالی جناب حضرت حسین رضی اللہ عنہ بہر پہلو یزید سے افضل، اشرف، اتقیٰ اور اعلیٰ تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ ہی کو ان کا یہ حق ملنا چاہیے تھا۔ اجتہادی غلطیاں اگر اِدھر سے ہوئیں تو اُدھر سے بھی ہوئیں اور زیادہ ہوئیں۔

یہاں یزید سریر آرائے خلافت ہو چکا تھا، اور اُدھر کوفہ سے پُر زور دعوت نامے آ رہے تھے کہ آپ رضی اللہ عنہ یہاں تشریف لے آئیں، یہاں کوئی امام نہیں، ہم آپ رضی اللہ عنہ کو امام بنا لیں گے، آپ رضی اللہ عنہ نے سوچا، وہاں چلا جاتا ہوں، شاید امن کی کوئی صورت نکل آئے اور سکون کا سانس لینا نصیب ہو اور شاید میرے مجوزہ لائحہ عمل کی تکمیل کے لئے کوئی موزوں صورت سامنے آ جائے۔ مگر آپ رضی اللہ عنہ جب دشتِ کربلا میں پہنچے تو اہلِ کوفہ کی غایت درجہ طوطا چشمی، بے مروّتی، سرد مہری اور بے وفائی دیکھ کر اپنے پہلے خیال میں تبدیلی فرمالی کہ اگر میں یہاں خلیفہ یا امیر نہیں بن سکا تو بغیر بیعت کے تو نہیں رہنا چاہیے، کیونکہ اسلامی حکم بھی یہی ہے کہ امیر ضرور ہونا چاہیے۔ امیر کے بغیر

زندگی گزارنا غیر شرعی امر ہے،[1] چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ نے بیعت یزید کی آمادگی ظاہر کی جیسا کہ شیعہ سنی معتبر کتب کے حوالہ جات آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ اگر ضد اور تعصب سے الگ ہو کر ذرا گہرائی سے دیکھیں تو یہ پتہ چلتا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کی یہ فکر بڑی عالی اور عظیم تھی۔ اور اس توجیہ سے بظاہر کوئی شاندار اور بہتر اور کوئی توجیہ بھی نہیں۔ اس میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی کوئی تحقیر نہیں ہے، اور اگر کوئی اس سے بہتر توجیہ ہو سکتی ہو تو وہ بتا دی جائے۔ ہمیں اس کے قبول کرنے میں مطلق کوئی عذر نہ ہوگا مگر خیال رہے کہ دور از کار اور پھسپھسی توجیہات نہیں ہونی چاہئیں۔

ایک اور ملحوظہ اگر پیش نظر رکھا جائے تو مسئلہ مذکورہ کی توضیح میں مدد مل سکتی ہے، اور وہ یہ کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو جب مسلم بن عقیل رحمہ اللہ کی شہادت اور شیعانِ کوفہ کی غداری و بے وفائی کا علم ہوا تو آپ رضی اللہ عنہ نے واپسی کا ذکر کیا، مگر آپ رضی اللہ عنہ کی واپسی میں چند رکاوٹیں حائل ہوئیں۔ اگر تاریخ کے ساتھ جغرافیہ کا مطالعہ کیا جائے، تو اور اچھی رہنمائی ملتی ہے کہ ابھی آپ رضی اللہ عنہ کوفہ سے تین منازل دُور تھے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے اپنا رُخ کوفہ سے پھیر کر دمشق کی جانب کر لیا، مقام القرعا سے دو راستے نکلتے تھے، ایک کوفہ کی طرف اور دوسرا دمشق کی طرف...... کربلا دمشق کے راستے میں پڑتا ہے، یہاں سے کوفہ تقریباً تیس میل دور تھا، اور وہاں کا میل یہاں سے بڑا ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ کے سفر کو معلوم کرنے کے لیے وہ نقشہ سامنے ملاحظہ کیجیے۔

یہ نقشہ آج بھی اسی طرح ہے، جس کا جی چاہے پتہ کر سکتا ہے۔ حقیقت کی نظر سے دیکھنے سے ہی حقائق سامنے آ سکتے ہیں۔ بصورت دیگر حقائق سامنے نہیں آ سکتے۔

---

[1] دیکھئے الکبائر للذهبی، الکبیرة الاربعون، الغادر بأمیرہ وغیر ذالك، ص: 3، آیات 34:17، 5:1، 16:91، 9. احادیث 244 تا 252 یہ سب احادیث سنداً صحیح ہیں۔ نواصب کا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو کسی بھی پہلو سے مطعون ٹھہرانا صریح ناجائز اور ظلم ہے۔

اس نقشے میں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے کوفے کی جانب سفر کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مقام ''القرعا'' واضح کیا گیا ہے جہاں سے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے مسلم بن عقیل کی شہادت اور اہل کوفہ کی بے وفائی سے آگاہ ہوتے ہی اپنا رخ کوفہ کے بجائے دمشق کی جانب کر لیا تھا مگر دشمن انھیں گھیر کر میدان کربلا میں لے گیا۔ (تیار کنندہ: محسن فارانی)
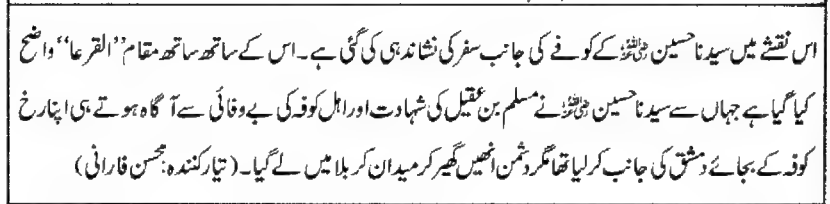
حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے کوفہ جاتے ہوئے حالات کو مخدوش و مشکوک دیکھ کر "القرعا" سے رُخ بدل کر دمشق کی جانب فرما لیا تھا، مگر جب دشت کربلا میں پہنچے تو آپ رضی اللہ عنہ کو روک لیا گیا۔ اور ابن زیاد کی فوجوں نے آپ رضی اللہ عنہ کو گھیرے میں لے لیا۔ جس سے معلوم ہوا کہ آپ رضی اللہ عنہ یزید کے پاس جانا چاہتے تھے، تا کہ اصلاح اور توافق کی کوئی صورت نکالی جا سکے جیسا کہ تفصیلات پیچھے آپ پڑھ چکے ہیں۔ اگر اعتدال اور امعان کی نظر سے دیکھا جائے تو اس میں ایسی کوئی قباحت بھی نہیں۔ بلکہ شرعی اور سیاسی نقطۂ نظر سے ایک مناسب اور بہتر صورت نکلتی تھی جو آپ نے پیش فرمائی۔ آگے پسند اپنی اپنی، نظر اپنی اپنی۔ اور یہ تبدیلی روز روشن کی طرح آپ رضی اللہ عنہ کے مؤقف کی تبدیلی پر دلالت کناں ہے۔ مگر یہاں پہنچ کر ابنِ زیاد کے تازہ حکم نامے نے آپ رضی اللہ عنہ کی مبارک خواہش کو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچنے دیا اور اس کے ساتھ کوفیوں کی ملی بھگت نے آپ رضی اللہ عنہ کی آرزو کے پھول کو کچل مسل کر رکھ دیا۔

آپ پیچھے پڑھ چکے ہیں کہ قریب تھا کہ صلح کی صورت نکل آتی مگر شمر نے سارا معاملہ تلپٹ کر دیا، اور بنتی صورت کو بگاڑ دیا، نہ صرف عمرو بن سعد بلکہ گورنر عبید اللہ بن زیاد بھی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شرائط مان چلا تھا، لیکن اس بدطینت شمر نے بیل منڈھے نہ چڑھنے دی اور خرمن امن کو آگ لگا دی۔

اب ریگزار کربلا میں قافلۂ حسین رضی اللہ عنہ ہے اور لشکر ابن زیاد۔ قافلۂ حسین رضی اللہ عنہ کی قیادت حضرت حسین رضی اللہ عنہ فرما رہے تھے جبکہ لشکر ابن زیاد کی کمان عمرو بن سعد کر رہا تھا۔ دولت اور حکومت سارے کام کرا لیتی ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ عمرو بن سعد منصب، عزت اور جان سب کچھ قربان کر دیتا، لیکن سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں نہ آتا، مگر اس نے ایسے نہ کیا۔ اب صورت حال بگڑنا شروع ہوتی ہے، دشمن کی خون آشام تلواریں خانوادۂ حسین رضی اللہ عنہ پر لہرا رہی ہیں، قریب تھا کہ طبل جنگ بجتا، اور شمر اپنی

آتش غضب فرو کرنے کے لیے مکار کوفیوں کی معیت میں آگے بڑھتا، طرفین کے قائدین نے اپنے اپنے گروہ کو ضروری ہدایات دیں۔

اور یہ بات ذہن میں رکھیں کہ اس لڑائی میں دشمن کا اقدام سراسر ظالمانہ تھا، جبکہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا مدافعانہ تھا۔ اب داستانِ ظلم اور حادثہ خونچکاں کا آغاز ہونے والا ہے۔

فریقین کی تقریریں

رفتہ رفتہ حالات نازک تر اور قابو سے باہر ہوتے گئے اور دونوں طرف سے تقریروں کا سلسلہ شروع ہوا۔ زیادی فوج کے افسر کبھی اپنے سپاہیوں کو ابھارتے اور کبھی حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے رفیقوں کی مذمت کرتے اور ان کی ''برائیاں'' بیان کر کر کے فوج کو ان پر حملے کے لئے اُکساتے۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ پہلے تو زیادی لشکر سے مخاطب ہو کر بار بار جنگ سے گریز کرنے فساد سے بچنے اور اہلِ بیت رضی اللہ عنہم کا مرتبہ جاننے پہچاننے کی تلقین فرماتے رہے۔ اور یہی کہتے رہے کہ ہم لڑنا نہیں چاہتے۔ ہمیں واپس جانے دیا جائے۔ اور حقیقت بھی یہ تھی کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ جنگ کے ارادے سے نہ آئے تھے، لیکن جب پانی سر سے گزر گیا اور جنگ ناگزیر ہو گئی تو پھر آپ رضی اللہ عنہ اپنے ساتھیوں کو مدافعت کے مسائل و فضائل سُنانے، پامردی اور استقلال دکھانے اور جانیں لڑانے کی ہدایت کرتے رہے، پھر اپنے اہل و عیال اور تمام اہلِ بیت کرام رضی اللہ عنہم کو صبر کرنے، رضائے الٰہی پر سر جھکانے، عبادت میں مصروف رہنے اور اللہ تعالیٰ کو ہر حالت میں خوش رکھنے کی تاکید فرماتے اور یہ بھی فرماتے کہ شہداء پر ماتم کرنا، ان پر چیخ چلّا کر رونا پیٹنا، بَین اور نوحہ کرنا ازروئے شریعت سخت منع ہے، یہ سب قبیح اعمال ہیں، انھیں اختیار کرنے والا اسلام سے دُور چلا جاتا ہے۔

کاش کہ ان باتوں کو ثواب جاننے اور سیدھے سادے لوگوں کو غلط راہ پر ڈالنے والے خطباء و ذاکرین کرام بھی کچھ سوچیں۔ اور اپنے حالات پر غور کریں۔ اللہ انھیں عدل و انصاف کی بات کرنے، حق و صداقت کا پرچم لہرانے اور تاریخی رطب و یابس پر گرنے اور اسے جمع کر کے لوگوں کو سنانے کی بجائے قرآن و حدیث کی صاف شفاف اور نتھری ہوئی تعلیمات پر غور و فکر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

شہادت کا حادثہ فاجعہ

آخر اپنے دفاع کے لیے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بھی تلوار اُٹھانا پڑی۔ آپ رضی اللہ عنہ نے بہت کوشش کی کہ جنگ ٹل جائے، اور فساد دب جائے اور مسلمانوں میں قتل وخونریزی کا راستہ نہ کھلے۔ لیکن آپ رضی اللہ عنہ کی تمام کوششیں بیکار اور تمام تدبیریں ناکام ثابت ہوئیں، زیادی فوج مارنے مرنے پر تُل گئی۔ اشقیاء قتل حسین رضی اللہ عنہ کے درپے ہو گئے اور لڑائی کے لیے زور شور سے تیاریاں کرنے لگے۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ مشہور روایت کے مطابق کل 72 آدمی تھے۔ ان میں تیس کے پاس سواریاں تھیں اور چالیس پیدل تھے۔ اور سب کے پاس ہتھیار بھی نہیں تھے۔ اُدھر فوج پانچ ہزار مسلح اور جنگجو سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ جو سب کی سب سلاح جنگ سے لیس تھی۔ راشن پانی کی بھی اسے کمی نہ تھی۔ اور اس کے لیے تازہ دم کمک بھی ہر وقت تیار رہتی تھی۔ لیکن حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی مختصر سی بے کس و بے بس جماعت کے پاس نہ تو کوئی بڑا ذخیرۂ خوراک تھا، نہ پانی۔ اور نہ انہیں دریائے فرات سے پانی کی ایک بوند لینے کی اجازت تھی۔

محرم 61ھ کی 9 تاریخ کو جنگ کا آغاز اس طرح ہوا کہ جس عمرو بن سعد نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے متعدد ملاقاتیں کیں، جس کے ساتھ مصالحت کی گفتگوئیں

---

① البقرۃ 2: 190

ہوئیں، اور جس شخص نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے مطالبات کو بظاہر درست سمجھ کر ابنِ زیاد سے نامہ و پیام کیا۔ اُسی عاقبت نا اندیش نے سب سے پہلا تیر سپاہِ حسینی کی طرف پھینکا۔ اور اپنی فوج سے کہا:

''لوگو! گواہ رہو۔ حسین رضی اللہ عنہ پر پہلا تیر میں نے ہی پھینکا ہے۔'' جیسے اس نے کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہو۔ کم از کم عمرو بن سعد کو اس ظلم میں پہل کرنے کی یہ ذلیل حرکت نہیں کرنی چاہیے تھی۔ لیکن اس نے اپنے اوپر سے ''حب حسین'' کا دھبہ مٹانا اور شمر اور ابن زیاد کو خوش کرنا چاہا۔ کاش کہ یہ شمر اور ابن زیاد کا ساتھ چھوڑ کر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو خوش کرتا۔ اور مظلومینِ کربلا کی دعائیں لیتا۔ مگر یہ مقدر کی بات ہے۔

ابن سعد کا تیر چلانا تھا کہ ابن زیاد کی فوج نے تیروں کا تانتا باندھ دیا۔ جس سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے مجاہدوں کی سواریوں کو کافی نقصان پہنچا۔ اور یوں ظالم کوفیوں نے لڑائی کی ابتدا کر کے اپنی بدفطرتی اور عقربیت کا مظاہرہ کیا۔[1]

جنگ شروع ہونے پر بھی حضرت حسین رضی اللہ عنہ موقع بموقع لشکر کے مقابل جا کھڑے ہوتے اور بلیغ الفاظ میں اس کو جنگ سے باز رہنے اور اہلِ اسلام کا خون محفوظ رکھنے کی تلقین فرماتے۔ لیکن ظالموں پر کچھ اثر نہ ہوا۔ ہاں! اثر ہوا تو صرف یہ کہ ابن سعد کی فوج کا وہ حُر نامی کمانڈر، جو ابن زیاد کے حکم سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو محصور کر کے میدانِ کربلا میں لایا تھا، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا غلام بے دام بن گیا اور اپنی فوج سے نکل کر سپاہِ حسینی میں شامل ہو گیا۔[2] جب ابنِ سعد اور شمر اور دوسرے افسروں نے یہ منظر دیکھا تو بہت غضب ناک ہوئے اور آتش جنگ کے شعلوں کو اور بھی تیز کر دیا۔

اب دونوں طرف سے تیروں کا تبادلہ ہوا۔ زور دار حملے ہونے لگے۔ حضرت

---

① تاريخ الطبري: 429/5، والكامل لابن الأثير: 289/3. ② تاريخ الطبري: 427/5، والكامل لابن الأثير: 288/3، والبداية والنهاية: 182/8.

حسین رضی اللہ عنہ کے اعیان و انصار بھی میدان میں نکل آئے۔ اور ایسی داد شجاعت دینے لگے کہ دشمن ان کی جواں مردی اور بہادری دیکھ دیکھ کر دنگ رہ جاتا جس سے اس پر خوف و ہراس طاری ہوتا تھا۔

دشمنوں کی شقاوت و قساوت اس درجہ شرمناک اور انسانیت سوز تھی کہ مجاہدین میں سے جو شخص پانی کا گھونٹ لینے جاتا وہ اسی پر پل پڑتے اور ایک دم دھاوا بول کر شہید کر دیتے۔

حضرت عباس بن علی پانی لینے گئے تو ان پر حملہ کر دیا۔ اگرچہ اس علمدار حسین رضی اللہ عنہ نے بھی ڈٹ کر مقابلہ کیا اور کئی اشقیاء کو ہمیشہ کی نیند سلایا۔ لیکن ظالموں نے نہایت بے دردی سے ان کے بازو کاٹ دیئے اور پھر انھیں شہادت کا جام پلا دیا۔[1] انا للہ۔

اسی طرح چھ مہینے کا فرزندِ حسین رضی اللہ عنہ علی اصغر رضی اللہ عنہ بھوک پیاس سے نڈھال ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ کیونکہ اس کی والدہ کا دودھ کثرتِ عطش سے سُوکھ چکا تھا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ اپنے اس معصوم نونہال کو بازوؤں پر اُٹھائے لشکر ابنِ سعد کے سامنے آئے۔ اور فرمایا: ''ظالمو! اگر ہمیں پانی کا قطرہ نہیں چھونے دیتے اس ننھی سی جان پر تو ترس کرو جس کا گلا سوکھ کر کانٹا ہو چکا ہے، اس نے تو تمھارا کوئی قصور نہیں کیا ہے۔'' مگر سنگدلوں نے پانی کی اجازت دینے کے بجائے کھینچ کر ایسا تیر مارا جو علی اصغر معصوم کے حلقوم میں پیوست ہو گیا۔ اور وہ بازوئے حسین پر دم توڑ کر فردوسِ بریں میں پہنچ گیا۔[2]

القصہ گھمسان کے رن پڑتے رہے۔ اور حسینی ننھے منے لشکر کے مجاہد سپاہی بے جگری و پامردی سے لڑ لڑ کر اور دشمنوں کو تہہ تیغ کر کر کے جامِ شہادت نوش کرتے رہے۔ ان

① تاریخ الطبري: 446/5. ② تاریخ الطبري: 448/5، والکامل لابن الأثیر: 294/3.

مجاہدین میں کچھ ایسے نابالغ بھی تھے جنھوں نے ابھی دنیا کے نشیب و فراز نہ دیکھے تھے۔ خصوصاً حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے فرزند اور بھتیجے اور بھانجے۔ مگر شوقِ شہادت میں وہ بھی ایسی دلاوری اور بے جگری سے لڑے کہ دشمن کے چھکے چھوٹ گئے۔ اور اسی طرح اس معرکۂ کربلا میں حسین رضی اللہ عنہ کے تمام سپاہی اور تمام فرزندانِ گرامی ایک ایک کر کے شہید ہو گئے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے فرزندوں میں صرف حضرت علی زین العابدین زندہ بچے، جو بیماری یا کسی وجہ سے میدان میں نہ آ سکے۔ کوفیوں نے ان کی جان لینے کی بھی بڑی کوشش کی، لیکن حضرت زینب اور سکینہ رضی اللہ عنہما آڑے آ گئیں اور وہ بچ گئے۔ ان کے علاوہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے غالباً حضرت زید رحمہ اللہ کے سوا کوئی زندہ نہیں بچا۔[1]

---

① الکامل لابن الأثیر: 295/3۔ تاریخ الطبري: 454/5۔ البدایة والنهایة: 188/8

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی المناک شہادت

10 محرم 61ھ جمعہ کے دن جناب حسین رضی اللہ عنہ تنہا رہ گئے، اور آپ رضی اللہ عنہ کے تمام ساتھی شہادت پا گئے، لیکن آپ رضی اللہ عنہ نے اپنی بے کسی اور تنہائی کا کچھ خیال نہ کیا، کوہِ گراں کی طرح حوصلہ مضبوط رکھا، استقامت اور استقلال میں ذرا فرق نہ آنے دیا، اور نہایت سکون و اطمینان سے اعداء کے مقابلے کے لیے تیار رہے۔ اگر اہلِ بیت رضی اللہ عنہم میں کوئی بی بی بے صبری کا اظہار کرتی یا آہ و بکا میں مصروف ہوتی تو آپ رضی اللہ عنہ فوراً خیمے میں تشریف لے جاتے، تلقین صبر کرتے۔ رونے چلانے اور چیخنے پیٹنے سے منع فرماتے اور راضی برضاء اور تقدیر الٰہی پر صابر و شاکر رہنے کی ہدایت کرتے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اپنی ازواج، اپنی ہمشیرہ زینب، اپنی دختر سکینہ رحمہا اللہ کو وصیت فرمائی کہ ان حالات میں میرا بچنا محال ہے۔ مگر میرے جانے کے بعد کوئی ایسی بات منہ سے نہ نکالنا اور کوئی ایسا کام نہ کرنا جو حق تعالیٰ کی مرضی اور حکم شریعت کے خلاف ہو۔ مثلاً شین وشیون، نوحہ و مرثیہ، سینہ کوبی، بال نوچنا اور کپڑے پھاڑنا، چیخ چلا کر گریہ و بکا کرنا، دوہتڑیں اور مکے مارنا وغیرہ وغیرہ۔ یہ جملہ حرکات ممنوع ہیں۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ اہل بیت رضی اللہ عنہن کو ہدایت اور نصیحت کرنے کے بعد پھر میدان میں تشریف لے گئے۔ ایک بار پھر دشمن کو اپنی مظلومی، بے کسی، تنہائی اور بے بسی کی جانب توجہ دلائی۔ اپنے نواسۂ رسول اور فرزندِ بتول ہونے سے آگاہ کیا کہ شاید ان کے دل

پسیج جائیں۔ مگر پتھر دل دشمن پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ آخر آپ رضی اللہ عنہ بھی ﴿فَإِنْ قَٰتَلُوكُمْ فَٱقْتُلُوهُمْ﴾ ''اگر وہ تمھارے ساتھ لڑائی کریں تو تم بھی ان کو قتل کرو۔''[1] ﴿وَجَزَٰٓؤُا۟ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ﴾ ''برائی کا بدلہ برائی کے برابر لیا جاسکتا ہے۔''[2] کے حسبِ فرمان یکہ وتنہا لڑنے کو تیار ہو گئے۔ شقی القلب کوفی آپ رضی اللہ عنہ پر پے در پے حملے کرتے۔ اور آپ رضی اللہ عنہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی بدولت نہایت جرأت و ہمت سے ان کے حملے کو ناکام بنا دیتے۔ اور حملہ آوروں کو دُور تک دھکیل دیتے۔ اُس وقت حضرت ممدوح رضی اللہ عنہ کی پامردی، استقامت اور شجاعت دید کے قابل تھی جب دشمن کی فوج یلغار کرتی ہوئی آپ رضی اللہ عنہ تک پہنچتی اور ٹڈی دَل لشکر کی یورش کو ایک ہی وار میں فنا کر دیتے۔ مقابل فوج کے نامی جرنیل اور افسر بڑے بڑے دلیر سُورمے اور قوی بہادر تو آپ رضی اللہ عنہ کی صورت دیکھتے ہی لرزہ براندام ہو جاتے اور آپ رضی اللہ عنہ کی ہیبت سے اُنہیں آپ رضی اللہ عنہ کے نزدیک آنے کی جسارت نہ ہوتی۔

اکثر مؤرخین راوی ہیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے بہت سے ظالموں کو تنہا ٹھکانے لگا دیا۔ آپ رضی اللہ عنہ کی شمشیر جہانگیر جس طرف بڑھتی تھی کشتوں کے پُشتے لگ جاتے تھے۔ اور اشقیاء کٹ کٹ کر گرتے تھے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

آخر ایک اکیلی جان پانچ چھ ہزار سفاکوں کا کب تک مقابلہ کر سکتی تھی؟ اگرچہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے بڑی جرأت و بسالت کا ایمان افروز مظاہرہ کیا اور بے یار و مددگار ہوتے ہوئے بھی دشمنوں سے ڈٹ کر لڑتے، ان کو پسپا کرتے اور ان کے پُرزے اُڑاتے رہے۔ لیکن پایانِ کار زخموں سے چور ہو کر اور اعداء کے تیغ و پیکان کی

[1] البقرۃ:191. [2] الشوریٰ:40.

جراحتیں کھا کھا کر آپ رضی اللہ عنہ بے دم ہو گئے۔ زیادہ خون بہنے کی وجہ سے طاقت جواب دے گئی۔ درندوں نے آپ رضی اللہ عنہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ تیروں کی بارش ہونے لگی۔ تلواروں کی بجلیاں چمکنے لگیں۔ امام مظلوم سب وار اپنے جسم پر لے لے کر کافی خون بہہ نکلنے سے بالآخر گر گئے۔ گرنے پر ستمگروں نے تلواروں اور بھالوں کے اور وار کیے، جن کی تاب نہ لا کر گلستانِ نبوت کا یہ سدا بہار پھول مسل گیا۔ جس ریحانۂ نبی کو دوشِ رسالت کی سواری کا فخر حاصل تھا، جس کو سردار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بوسے دیے تھے اور جس کے ذرا بھر رونے اور معمولی سی تکلیف سے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم بے چین و مضطرب ہو جایا کرتے تھے، کوفی بھیڑیوں نے اس عظیم و بزرگ اور وحید العصر ہستی کو نہایت بے رحمی سے شہید کر دیا۔[1]

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے دس محرم الحرام 61ھ بروز جمعہ، بوقت عصر شہادت پائی، شہادت کے وقت آپ رضی اللہ عنہ کی عمر 57 سال کے قریب تھی۔[2] إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ، أَعْلَى اللّٰهُ مَقَامَهٗ!

شہادت کے بعد جب آپ رضی اللہ عنہ کی لاش مبارک کو دیکھا گیا تو بے شمار زخموں کے علاوہ آپ رضی اللہ عنہ کے جسم اطہر پر 33 زخم تیروں کے اور 34 زخم تلواروں کے پائے گئے۔[3]

ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے کربلا میں جس وقت اقامت فرمائی۔ تو دشمن کے نرغے میں آنے اور محصور و نظر بند ہونے کے باوجود احکامِ الٰہی کی پابندی اور فرائض و سنن کی ادائیگی میں ذرا کوتاہی نہ کی۔ آپ کتاب اللہ اور

---

① الکامل لابن الأثیر: 295/3، والبدایة والنهایة: 190,189/8۔ ② المنتظم لابن جوزی: 345/5، والبدایة والنهایة: 200/8۔ ③ الکامل لابن الأثیر: 295/3۔ تاریخ طبری: 453/5، والبدایة والنهایة: 190/8۔

سنتِ رسول اللہ ﷺ کے مطابق یہاں بھی عمل کرتے اور قرآن وحدیث سے باقاعدہ تمسک فرماتے رہے۔ آخری دم تک نماز میں توقف نہیں کیا۔ آپ رضی اللہ عنہ کے محترم نانا جان ﷺ نے اپنے آخری وقت میں وصیت کرتے ہوئے ''الصلوٰۃ الصلوٰۃ'' کہہ کر مسلمانوں کو نماز کی تاکید فرمائی تھی۔[1]

نواسۂ رسول رضی اللہ عنہ نے نانا جان ﷺ کی اس وصیت پر آخر دم تک عمل کیا۔ جو بمطابق روایات بھوک پیاس سے نڈھال ہوجاتے تھے۔ بھوک سے پیٹ پر پتھر باندھ لیتے تھے۔ چاروں طرف تلواریں اور بھالیں چمک رہی تھیں۔ آپ رضی اللہ عنہ کا سر قلم کرنے کے لیے دشمن ٹوٹ ٹوٹ پڑتے تھے لیکن اس حالت میں بھی آپ رضی اللہ عنہ ذکر الٰہی اور اہم ترین عبادت سے غافل نہیں ہوئے تھے۔ وقت پر پابندی سے نماز پڑھتے اور دوسروں کو پڑھاتے۔ امامت فرماتے اور ساتھیوں کو نماز کا پابند رہنے کی ہدایت کرتے، ہاں! جنگ کی ایسی نازک ساعتوں میں حکمِ شریعت کے ماتحت نماز خوف ادا کی جاتی ہے۔

کاش! محبانِ حسین رضی اللہ عنہ ادائیگی نماز میں بھی ان کی پیروی کریں اور صلوٰۃِ مسنونہ کے پابند بنیں۔

[1] حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ کا (زندگی میں) آخری کلام ''الصلاۃ الصلاۃ وما ملکت أیمانکم تھا۔'' دیکھیے سنن أبي داود، الأدب، باب في حق المملوك، حدیث: 5156، وابن ماجه، الوصایا، باب هل أوصى رسول الله ﷺ، حدیث: 2698.

شہدائے کربلا کے اسمائے گرامی

بنا کردند خوش رسمے بخاک وخون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

عالی مقام حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ آپ رضی اللہ عنہ کے جن اعزہ واحباء نے شہادت پائی ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:

1. جعفر بن عقیل بن ابی طالب۔ آپ نے 15 آدمیوں کو قتل کیا، آپ کا قاتل بعض نے بشر بن حوطہ ہمدانی لکھا ہے۔
2. عبدالرحمٰن بن عقیل بن ابی طالب آپ نے پچاس آدمیوں کو ٹھکانے لگایا، آپ کا قاتل عبداللہ بن عروہ خثعمی تھا۔ بعض نے نام عثمان بن خالد جہنی لکھا ہے۔
3. عبداللہ بن عقیل بن ابی طالب۔
4. محمد بن ابی سعید بن عقیل بن ابی طالب۔
5. عبداللہ بن مسلم بن عقیل بن ابی طالب۔ آپ بڑی بہادری سے لڑے، بہت آدمی تہ تیغ کیے۔ آپ کا قاتل زفل بن مزاحم حمیری تھا، بعض مؤرخین نے قاتل کا نام عمر بن صبیح صداوی اور بعض نے مالک بن اُسید حضرمی بتایا ہے۔
6. محمد بن عبداللہ بن جعفر طیار بن ابی طالب۔ آپ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے بیٹے اور سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے حقیقی بھانجے تھے، آپ نے دس آدمیوں کو قتل کیا اور

آپ کے قاتل کا نام عامر بن نہشل تیمی ہے۔

7 عون بن عبداللہ بن جعفر طیار۔ کہتے ہیں کہ انھوں نے ستائیس آدمیوں کو موت کے گھاٹ اُتارا۔ آپ کے قاتل کا نام عبداللہ بن قطبہ ہے۔

8 ابوبکر بن حسن بن علی بن ابی طالب۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے حقیقی بھتیجے ہیں۔ ان کے قاتل کا نام حرملہ ہے۔

9 عمر بن حسن بن علی بن ابی طالب۔ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے حقیقی بھتیجے ہیں۔

10 عبداللہ بن حسن بن علی بن ابی طالب۔ یہ بھی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے حقیقی بھتیجے ہیں۔

11 قاسم بن حسن بن علی بن ابی طالب۔ آپ 19 برس کے بڑے بہادر نوجوان تھے، آپ کا قاتل سعد بن نفیل اروی تھا۔

12 محمد بن علی بن ابی طالب۔ آپ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے علاتی بھائی ہیں (عَلَّاتی بھائی وہ ہوتا ہے، جس کی ماں الگ ہو مگر باپ ایک ہی ہو)

13 عثمان بن علی بن ابی طالب۔ یہ بھی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے علاتی بھائی ہیں۔ آپ کا قاتل یزید بن البطی ہے۔

14 ابوبکر بن علی بن ابی طالب۔ یہ بھی حضرت موصوف رضی اللہ عنہ کے علاتی بھائی ہیں۔ آپ کے قاتل کا نام قدامہ موصلی ہے۔ بعض نے زحیر بن بدر نجفی اور عبداللہ عقبہ کے نام بتائے ہیں۔

15 جعفر بن علی ابن ابی طالب۔ آپ بھی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے علاتی بھائی ہیں۔

16 عباس بن علی بن ابی طالب۔ آپ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے علاتی بھائی ہیں، آپ لشکر کے علمدار تھے، آپ علی اصغر اور سکینہ کے لیے فرات سے پانی لینے گئے تھے، اس بناء پر آپ کو ساقی اہلِ بیت رضی اللہ عنہم کہتے ہیں۔

17 عبداللہ بن علی بن ابی طالب۔ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے علاتی بھائی ہیں، آپ کے قاتل

کا نام ہانی بن نویب حضرمی ہے۔

18 علی اکبر بن حسین بن علی بن ابی طالب۔ یہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بڑے صاحبزادے ہیں، آپ کا قاتل سعد بن عمرو بن نفیل ازدی بتایا جاتا ہے۔

19 علی اصغر بن حسین بن علی بن ابی طالب۔حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے شیر خوار بیٹے ہیں۔

20 فیروز، یہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے باوفا غلام ہیں۔

21 مسلم بن عوسجہ

22 حبیب بن مظاہر اسدی

23 سعد۔ (رحمہم اللہ)[1]

---

[1] البداية والنهاية: 191/8، والكامل لابن الأثير: 3/302-303، وتاريخ الطبري: 468-469/5.

باب 7:

شہادت کے بعد

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے کے بعد بھی زیادی بدطینت اور درندہ صفت کاسہ لیس شقاوت سے باز نہ آئے، شمر جسے ''ذِیَابٌ فی ثیابٍ'' (انسانی لباس میں بھیڑیا) بھی کہا جاسکتا ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ کی نعش مبارک پر چڑھ گیا، اور سینہ اقدس پر بیٹھ کر آپ رضی اللہ عنہ کا سر مبارک کاٹ لیا۔ (العیاذ باللہ) [1] اور بعض روایات کے مطابق اگر آپ رضی اللہ عنہ کی لاش مبارک کو گھوڑوں سے پامال کیا گیا ہو، اور آپ رضی اللہ عنہ کے جسم سے پوشاک اتار کر برہنہ کردیا گیا ہو تو ان سے کوئی بعید نہیں، یہ ان ہونی یا حیرت کی کوئی بات نہیں ہے۔ جن ظالموں نے زندگی میں آپ رضی اللہ عنہ کی عزت نہ کی، وہ آپ رضی اللہ عنہ کے سر بریدہ جسد اطہر کی تعظیم کیونکر کرسکتے تھے؟

اس کے بعد جفا کاروں نے خیموں کی طرف رجوع کیا اور امام شہید رضی اللہ عنہ کا کل مال اسباب لوٹ لیا۔ جنابِ زین العابدین فرزند حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بھی قتل کرنا چاہا مگر حضرت زینب اور حضرت سکینہ ان پر گر پڑیں اور وہ شہید ہونے سے بچ گئے، بعض نے انھیں کم عمر بتایا ہے اور بعض نے بچوں کا باپ۔ بہر حال کچھ بھی ہو اللہ تعالیٰ نے آپ کو بچالیا۔ دشمن کی فوج نے تمام بیبیوں اور بچوں کو گرفتار کرلیا۔ اور امام مظلوم رضی اللہ عنہ کے سر اقدس کو نیزے پر چڑھا کر معہ تمام اہلِ بیت کرام رضی اللہ عنہم کوفہ میں سفّاک ابنِ زیاد کے پاس بھیج دیا۔ چشم فلک نے ظلم وستم اور درندگی کی ایسی داستان خونچکاں شاید ہی کہیں دیکھی ہوگی۔ ﴿ إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ﴾

---

[1] الكامل لابن الأثير: 295/3، والبداية والنهاية: 8/189-190، وتاريخ الطبري: 453/5.

حادثہ کربلا کے بنیادی مجرم

یہاں چند باتیں عرض خدمت کرنا ضروری ہیں۔ امید ہے وہ قارئین کے لیے بھی مفید اور ازدیادِ علم کا باعث ہوں گی۔ (ان شاء اللہ)

بعض دوست جو یہ کہتے ہیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت لشکر ابنِ زیاد کے ہاتھوں واقع نہ ہوئی تھی بلکہ محض اہلِ کوفہ کے ہاتھوں واقع ہوئی تھی یہ محلِ نظر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کوفی بھی بلا واسطہ اور بالواسطہ دونوں صورتوں میں اس جرم میں شریک رہے، مگر لشکر ابنِ زیاد کو اس ستم و جفا سے مبرا قرار دینا بھی ایک ڈھٹائی ہے۔ جہاں تک ہم سمجھتے ہیں، قتل حسین رضی اللہ عنہ میں لشکر ابنِ زیاد کا پورا ہاتھ تھا۔ اس کیس کے (کوفیوں کے علاوہ) بنیادی طور پر تین مجرم ہیں: شمر ذی الجوشن، عبید اللہ بن زیاد اور عمرو بن سعد...... حُر بن یزید چوتھا مجرم ہوا چاہتا تھا مگر تائب ہونے کے بعد وہ مجرم نہ رہا، کیونکہ اول اس نے آپ رضی اللہ عنہ کو اور آپ کے ساتھیوں کو اپنے نرغے میں لے لیا تھا، اور ابنِ زیاد کی بیعت پر ضد کرتا تھا اور آپ رضی اللہ عنہ کے واپس جانے پر مصر تھا اور کربلا تک یہی آپ رضی اللہ عنہ کو لایا تھا۔ مگر اللہ کی قدرت ریگ زارِ کربلا میں عین لڑائی کے وقت یہ تائب ہو چکا تھا، اس لیے یہ مجرمین کی فہرست میں نہ رہا۔

عمرو بن سعد اگرچہ بہ نسبت شمر اور ابن زیاد کے بہتر تھا، مگر وہ لالچ اور خوف کا شکار ہو چلا تھا۔ ویسے وہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شرائط کو مان لینے کے حق میں تھا، یہ قتل حسین رضی اللہ عنہ میں مجبوراً شریک ہوا تھا، یا جیسے کیسے...... بہر حال اس کے شریک ہونے

سے انکار نہیں کیا جاسکتا، چنانچہ ابنِ کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

«فَوَثَبَ إِلَىٰ فَرَسِهِ فَرَكِبَهَا ثُمَّ دَعَا بِسَلَاحِهِ......»

''عمرو بن سعد ابنِ زیاد کا حکم ملتے ہی مقابلہ حسین رضی اللہ عنہ کے لیے کود کر گھوڑے پر جا بیٹھا اور ہتھیار سجائے اور فوج لے کر سیدھا مقابلے کے لیے چل پڑا۔''[1]

عبید اللہ بن زیاد ذاتی طور پر جابر، متشدد اور سخت مزاج حکمران تھا۔ اور حکومت کا دلدادہ تھا۔ ہر قسم کا کریڈٹ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے نہ صرف حضرت مسلم اور ان کے ساتھیوں پر مظالم توڑے بلکہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے اعزہ پر بھی ستم ڈھائے، اس لیے بلا شک کہا جاسکتا ہے کہ ابنِ زیاد بڑا جفا پیشہ، چیرہ دست اور سنگدل حکمران تھا جس نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے اعیان و انصار رضی اللہ عنہم پر مظالم توڑنے میں کوئی کمی نہ اٹھا رکھی۔ حالانکہ اگر یہ چاہتا تو آپ رضی اللہ عنہ کی شایان شان نرم برتاؤ رکھ سکتا تھا۔ اور امیر یزید سے مشورہ کر کے بہتر راہ نکال سکتا تھا، لیکن یہ ادھر آیا ہی نہیں، اور صلح و صفائی کے تمام مواقع ہاتھ سے نکال دیے۔

یوں بھی ابنِ زیاد کو قتل حسین رضی اللہ عنہ سے کیسے بری قرار دیا جاسکتا ہے؟ اسی نے تو ابنِ سعد کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے جنگ کرنے کے لیے روانہ کیا تھا۔ علامہ ابنِ کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

«وَبَعَثَ عُبَيْدُ اللّٰهِ بْنُ زِيَادٍ عَمْرَو بْنَ سَعْدٍ لِقِتَالِهِمْ»

''ابنِ زیاد نے ابنِ سعد کو قافلۂ حسین رضی اللہ عنہ سے قتال کے لیے بھیجا۔''[2]

دراصل ابن سعد کا لشکر جو چار ہزار سپاہ پر مشتمل تھا، دیلم کی طرف لڑائی کرنے کے لیے جا رہا تھا۔ ابنِ زیاد نے اس لشکر کو قتال دیلم سے روک کر قتال حسین رضی اللہ عنہ کے لیے

---

① البداية والنهاية: 171/8. ② البداية والنهاية: 170/8.

روانہ کر دیا، کیونکہ اس کے خیال میں یہ قتال اس قتال سے زیادہ ضروری تھا، ملاحظہ ہو البدایہ کی عبارت:

«وَكَانُوْا أَرْبَعَةَ آلاَفٍ يُرِيدُونَ قِتَالَ دَيْلَمَ فَعَيَّنَهُمُ ابْنُ زِيَادٍ وَصَرَّفَهُمْ إِلَى قِتَالِ الْحُسَيْنِ»[1]

علاوہ ازیں ابنِ زیاد نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر وقتاً فوقتاً دائرہ حیات تنگ کرنے کے احکامات نافذ کیے، جن کی تعمیل تمام ماتحت عملہ بجا لاتا رہا۔ ابنِ زیاد کی یہ حرکت بھی بہت ذلیل تھی جو اس نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بریدہ سر اقدس کے ساتھ کی۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

«فَجَعَلَ يَقُوْلُ بِقَضِيْبِهِ فِي أَنْفِهِ أَنَّ أَبَاعَبْدِ اللّٰهِ كَانَ قَدْ شَمِطَ»

''آپ رضی اللہ عنہ (کے بریدہ سر اقدس) کی ناک مبارک پر اپنی چھڑی رکھی اور کہا کہ ابوعبداللہ (حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی کنیت) کے بال تو اب پک چکے ہیں۔''[2]

لیکن بخاری شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کا قول مذکور ہے، الفاظ یہ ہیں:

«فَجَعَلَ يَنْكُتُ وَقَالَ فِي حُسْنِهِ شَيْئاً»

''جب ابن زیاد کے سامنے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا سر لایا گیا تو اس نے چھڑی سے اشارہ کیا اور ان کے حسن کا ذکر کیا۔''

فتح الباری میں بروایت ترمذی یہ الفاظ ہیں: مَارَأَيْتُ مِثْلَ هٰذَا حُسْنًا.
''میں نے اس چہرے جیسا خوبصورت چہرہ نہیں دیکھا۔'' لیکن ہمارے اکثر دوستوں نے ''يَنْكُتُ'' کا ترجمہ چھڑی مارنا اور قَالَ فِي حُسْنِهِ شَيْئاً کا ترجمہ ''برا بھلا کہنا'' کیا ہے اور بعض نے اس بات کو یزید کی طرف منسوب کیا ہے۔ لیکن یہ باتیں امر واقع

---

[1] البداية والنهاية : 169/8. [2] البداية والنهاية :171/1.

کے خلاف ہیں۔ اور اگر یہ صحیح ثابت ہو جائیں تو بہت بری اور تکلیف دہ باتیں ہیں......
اور اس بات میں تو شبہ نہیں کہ ابنِ زیاد کا سب سے گھناؤنا فعل شمر ذی الجوشن کو قتلِ حسین رضی اللہ عنہ پر متعین کرنا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ابنِ سعد بھی مجرم تھا اور ابنِ زیاد بھی۔ لیکن جس نے جور و جفا اور درندگی میں ان دونوں کے کان کاٹ دیئے، وہ یہی شقی شمر ذی الجوشن تھا۔ یہ ظالم حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا قریبی رشتہ دار تھا، شمر کی پھوپھی ام البنین بنت خرام حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زوجہ تھیں، اور ان کے بطن سے عباس، جعفر، عبداللہ اور عثمان پیدا ہوئے تھے۔ اور وہ کربلا میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔ شمر نے اسی تعلق قرابت کی بنا پر کربلا کی جانب روانہ ہوتے وقت ابنِ زیاد سے ان چاروں بچوں کے لیے امان حاصل کی تھی۔ لیکن اس ازلی شقی سے کوئی پوچھے کہ تمھیں ان بھائیوں کی امان لینے کی فکر تھی مگر تمھیں دوسرے بھائیوں یعنی علی رضی اللہ عنہ کے گوشۂ جگر، سیّدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے پارۂ دل اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نورِ عین کی فکر نہ تھی؟ ایسے کیوں کیا؟ ان کی تو امان لیتے تھے مگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی...... جان......؟ کیسی بیہودہ اور معاندانہ و مبغضانہ ذہنیت تھی۔ اچھے بھائی تھے حسین رضی اللہ عنہ کے؟ تُف ہے ایسا بھائی ہونے پر۔ اور ہزار بار افسوس ہے ایسی ذلیل حرکات پر۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے ریگزارِ کربلا میں اسے دیکھتے ہی فرما دیا تھا:

«صَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ، قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: كَأَنِّي أَنْظُرُ اِلٰی کَلْبٍ أَبْقَعٍ يَلِغُ فِي دِمَاءِ أَهْلِ بَيْتِي رضی اللّٰه عنهم»

"اللہ اور اس کے رسول نے سچ فرمایا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: گویا کہ میں ایک چتکبرے کتے کو دیکھ رہا ہوں جو میرے اہل بیت کے خون میں منہ

ڈالے گا۔“[1]

اسی کتاب کے اگلے صفحہ پر ہے کہ شمر کو برص کا عارضہ لاحق تھا۔ شمر، حضرت حسین بن حیدر رضی اللہ عنہما کا سخت دشمن تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ کی عزت و عظمت اسے ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ لگتا ہے یہ آپ رضی اللہ عنہ کے خلاف ایسے ہی موقع کی تاک میں تھا۔ اس ذلیل، ملعون اور کمینہ فطرت انسان نما درندے اور چتکبرے کتے نے ریگزارِ کربلا میں خیابانِ زہرا کے شگفتہ پھول کی پتیاں آن کی آن میں توڑ مسل کر رکھ دیں، یہی ہے وہ درندہ خصلت جو انسان کے لبادے میں بھیڑیا تھا کہ جس نے بمطابق مشہور روایت حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا سر تن سے جدا کیا، اور اسی نے خاندان رسالت کا ہرا بھرا چمن دیکھتے ہی دیکھتے ویران کردیا، اور یہی تھا وہ ریکارڈ توڑ کمینہ فطرت جس نے بیمار عابد کو ذبح کرنا چاہا۔ یہ الگ بات ہے کہ اللہ نے انھیں بچا لیا۔

ابنِ سعد، ابنِ زیاد اور شمر قتل حسین رضی اللہ عنہ کے براہ راست مجرم ہیں، بہت بڑے مجرم۔ ان کے علاوہ اہل کوفہ تھے، اُن کا ہم الگ ذکر کرچکے ہیں اور بتا چکے ہیں کہ ان میں وفا نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ اور یہ سب ایک دوسرے کے ایماء اور اشارے پر چلتے رہے اور وہ سبھی بڑے ظالم تھے جو کسی نہ کسی درجہ میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور مقتولین کربلا کے قتل میں شریک تھے۔ یہ لوگ حد درجہ گناہ گار اور مجرم تھے۔ انھی قاتلینِ حسین رضی اللہ عنہ کے بارے میں کسی نے کہا ہے۔

أَتَرْجُوْ أُمَّةٌ قَتَلَتْ حُسَيْنًا شَفَاعَةَ جَدِّهٖ يَوْمَ الْحِسَابِ

فَلَا وَاللّٰهِ لَيْسَ لَهُمْ شَفِيْعٌ وَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِي الْعَذَابِ

”کیا تم قاتلینِ حسین رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ سمجھتے ہو کہ روزِ محشر حسین رضی اللہ عنہ کے

[1] البداية والنهاية : 188/8.

نانا جان ﷺ ان (کمینہ فطرت لوگوں) کی سفارش کریں گے؟ نہیں، کبھی نہیں، واللہ ان کا کوئی سفارشی نہ ہوگا اور وہ روز قیامت عذاب میں گرفتار ہوں گے انھیں اس ظلم واستبداد کی سزا مل کر رہے گی۔'' (اِن شاء اللہ)

ہمارا بھی یہی خیال ہے کہ یہ سب مجرم اور جفا کی تیغ چلانے والے اللہ تعالیٰ کے قہر وغضب سے بچ سکے ہیں نہ بچ سکیں گے۔ اور یہ خوفناک عذاب سے دو چار ہوں گے۔

ایک اہم سوال

اب ایک اہم اور قابل ذکر سوال باقی رہ جاتا ہے کہ قاتلینِ حسین رضی اللہ عنہ میں یزید کا نام ہے یا نہیں؟ ...... یہ سوال اہم بھی ہے اور مشکل بھی۔ اس بارے میں بالعموم تین نظریات ملتے ہیں:

پہلا نظریہ: یزید حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا قاتل تھا، یہ سارا کام اس کے حکم اور خواہش پر ہوا۔ اور وہ قتل حسین رضی اللہ عنہ سے خوش تھا۔ بڑا اور اصلی مجرم یہی تھا۔

دوسرا نظریہ: یزید اس سلسلے میں قطعاً بے خبر تھا۔ قتلِ حسین رضی اللہ عنہ کا حکم دینا تو رہا درکنار اسے اس حادثہ کی اطلاع تک نہ تھی۔ یہ سب کچھ اسے بعد میں معلوم ہوا جس کا اسے بہت دکھ ہوا۔ وہ قاتلین پر لعنت بھیجتا رہا۔

تیسرا نظریہ: یزید براہِ راست قتل حسین رضی اللہ عنہ میں بیشک شریک نہ تھا مگر وہ بالواسطہ شریک تھا۔ بالفرض شریک نہ بھی ہو، مگر اس کے دورِ حکومت میں تو یہ حادثہ ہوا ہی تھا۔

جہاں تک پہلے نظریے کا تعلق ہے تو اس کی ہمنوائی نہیں کی جاسکتی کیونکہ اس سلسلے میں کوئی صحیح دلیل نہیں ملتی، جو لوگ یہ نظریہ رکھتے ہیں ان کے پاس کوئی مستند حوالہ ہو تو پیش کریں۔

تیسرا نظریہ بھی محل نظر ہے، کیونکہ کسی صحیح روایت سے اس کی بھی تائید نہیں ہوتی ......
حقیقت یہ ہے کہ یزید قتلِ حسین رضی اللہ عنہ میں نہ بلا واسطہ شریک تھا، نہ بالواسطہ شریک تھا۔

ہاں یہ درست ہے کہ یہ حادثہ فاجعہ اس کے دورِ حکومت میں ہوا، مگر محض اس وجہ

سے یزید کو کیسے مجرم قرار دیا جا سکتا ہے کہ یہ واقعہ اس کے عہد حکومت میں ہوا......؟

یہاں چند باتیں سامنے رکھ لی جائیں تو اشکال کے حل ہونے میں مدد مل سکتی ہے:

1 یزید جب تختِ خلافت پر بیٹھ گیا، اور مسلمانوں نے اسے خلیفہ تسلیم کر لیا تو فرمایئے وہ ملک میں امن وامان قائم کرنے کا ذمہ دار تھا یا نہ تھا؟

2 جس علاقے میں اس نے شورش کا زیادہ خطرہ محسوس کیا، اگر وہاں اس نے سخت انتظامات کیے تو بحیثیت ایک حکمران ہونے کے اس نے اچھا کام کیا یا برا کام کیا......؟...... کیا یہ اس کی ذمہ داری تھی یا نہ تھی......؟

3 معلوم ہے حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے یزید کی بیعت نہ کی تھی، کیونکہ آپ رضی اللہ عنہ اپنے آپ کو خلافت کا زیادہ اہل سمجھتے تھے جیسا کہ بتایا جا چکا ہے (ہمارا اپنا بھی یہی خیال ہے) مگر تاریخ گواہ ہے کہ یزید نے آپ رضی اللہ عنہ کا احترام روا رکھا، کوئی اور ہوتا تو وہ غالباً آپ رضی اللہ عنہ کو مدینے اور مکے سے باہر نہ جانے دیتا۔ اور مسلم بن عقیل جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے لیے بیعت لیتے رہے اس کی ایک دن کے لیے بھی اجازت نہ دیتا۔

4 یزید نے یہ جاننے کے باوجود کہ آپ نہ صرف یہ کہ حکومت سے اختلاف رکھتے ہیں اور حکومت کو تسلیم نہیں کرتے، سب کچھ گوارا کیا۔ لیکن جب یزید کو یہ علم ہوا کہ اہلِ کوفہ آپ کو بلا رہے ہیں اور آپ رضی اللہ عنہ ان کی دعوت پر وہاں جا رہے ہیں تو اسے خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں میری سلطنت کا ایک عظیم حصہ (کوفہ، عراق) کٹ کر ہی نہ رہ جائے اور میری بقایا حکومت میں بھی ناقابلِ تسخیر ہنگامہ نہ کھڑا ہو جائے، تو اندریں حالات اس نے حکومتی اور سیاسی نقطۂ نظر سے جو انتظامات کیے خود ہی انصاف سے کہیے وہ اگر نہ کرتا تو اور کیا کرتا، کیا یہ اس کا حق نہ تھا؟ کیا انتظامات کرنا اس کے لیے ناگزیر نہ ہو چکا تھا؟ اس کے قلمرو میں طرح طرح کی اور شورشیں اٹھنے کا خطرہ لاحق نہ تھا؟ کیا ایسے مخدوش اور مہیب وخطرناک حالات میں کوئی حکومت چین سے بیٹھ سکتی ہے؟

5 ان حالات میں بظاہر دو ہی صورتیں تھیں۔ یزید حکومت کرتا یا حضرت حسین رضی اللہ عنہ حکومت کرتے، کیونکہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا یہ اقدام حکومت یزید کے خلاف ایک کھلا چیلنج تھا، اور یہ حکومت میں ایک اور ذیلی حکومت قائم کرنے کے مترادف تھا۔ نئی حکومت وجود میں آئی یا نہ آئی بہرحال حکومت وقت کو خطرہ تو تھا ہی۔ حساس حکومتیں تو ان حالات میں نہایت چوکس ہو جاتی ہیں۔ آپ خود ہی بتائیں اندریں حالات کسی ملک میں بیک وقت دو متوازی حکومتیں قائم ہوسکتی یا چل سکتی ہیں؟ اور اس صورت حال میں ملک میں کیونکر امن و امان قائم رہ سکتا ہے؟ جبکہ کسی بھی ریاست میں امن و امان قائم کرنا اور ہر طرح کی شورش کو دبانا حکومت کا اولین فریضہ ہوتا ہے۔ انصاف سے کہیے: کیا یہ کسی حکومت کا فریضہ ہوتا ہے کہ نہیں؟

6 یزید کا اگر جرم تھا تو یہی تھا کہ وہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ایماء، صحابہ رضی اللہ عنہم کے انقیاد اور تابعین رحمہم اللہ و عامۃ المسلمین کے بیعت کرنے پر سریر آرائے خلافت ہوگیا تھا، یا تو وہ زمامِ اقتدار نہ سنبھالتا۔ اور اگر اس نے سنبھالی تھی تو پھر اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوتا۔ کیا اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا جرم ہے؟ کچھ دیر کے لیے ہماری باتوں کو چھوڑ دیجئے۔ آپ خود کہیے کہ اندریں حالات بحیثیت حکمران ہونے کے یزید کو کیا کرنا چاہیے تھا؟ وہ اگر اس وقت امارت سے دست کش ہوتا تو حالات کیا ہوتے۔ کیونکہ اہل نفاق اور دین دشمن عناصر گھات میں بیٹھے ایسے ہی حالات کے منتظر تھے۔ ان خطرناک اور مہیب حالات کو کنٹرول کرنا کیا اس کے لیے آسان ہوتا۔

7 جہاں تک حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو سمجھانے کا تعلق ہے تو وہ سب نے سمجھایا، حکومت نے بھی سمجھایا اور آپ رضی اللہ عنہ کے احباء، اعزہ اور رفقاء نے بھی، جس کی تفصیل دوسری جگہ دی جاچکی ہے، مگر آپ اپنا جو عزم کر چکے تھے اس کے خلاف کسی کی بات کو تسلیم کرنا تو رہا الگ، اس پر ایک لمحہ کے لیے بھی نظر التفات مائل کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھے، اب اس

صورت حال میں یزید کے لیے سوائے کوفہ کے انتظامات سخت کرنے کے اور کیا چارۂ کار تھا؟

8 حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے کا اگر یزید نے حکم دیا ہوتا تو قافلۂ حسین رضی اللہ عنہ کے بقیۃ السیف (یعنی شہادت سے بچ جانے والے) اعزہ مثلاً حضرت زینب و حضرت زین العابدین رحمہ اللہ اور دیگر اس کا اعلان یا اظہار فرماتے۔ اعلان و اظہار سے انھیں کون سی چیز روک سکتی تھی؟ مگر ان پرستارانِ حق نے بجائے یزید کے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا قاتل ابن زیاد، شمر، عمرو بن سعد اور اہلِ کوفہ کو قرار دیا، یزید پر کسی نے الزام عائد نہیں کیا۔ دیکھ لیجئے مستند اور معتبر کتب۔ سارے حقائق آپ کے سامنے آ جائیں گے۔ علاوہ ازیں سیدہ زینب رضی اللہ عنہا نے کوفیوں کو جو بد دعا دی، یزید کا اس میں بھی نام نہ تھا۔ دیکھیے سیرت فاطمۃ الزہرا آغا سلطان مرزا شیعہ، ایڈیشن: سوم، ص: 268۔ حق برادرز لاہور اور ہفت روزہ رضا کار، لاہور یکم مئی 1960ء ص: 80۔

9 اگر حسین رضی اللہ عنہ کا قاتل یزید ہوتا تو وہ اس قتل پر خوش ہوتا اور قاتلین کو انعامات سے نوازتا، کسی کو تھپکی دیتا، یا سراہتا، یا نقدی دیتا اور ہیرے جواہرات بانٹتا، یا کوئی جاگیر بخشتا، یا منصب میں ترقی دیتا، یا کم از کم چراغاں ہی کرتا، یا قاتلین کو اپنا قرب بخشتا۔ اس سلسلے میں تواریخ بتلاتی ہیں کہ وہ قتلِ حسین رضی اللہ عنہ سے نہ خوش ہوا، اور نہ اس نے کسی کو انعام و اکرام سے نوازا، بلکہ اس کے برعکس اس نے قاتلین حسین رضی اللہ عنہ کو سخت برا بھلا کہا۔ اور شیعہ سنّی کتب کے مطابق وہ خود بھی روتا رہا اور اس کے اہلِ خانہ بھی روتے رہے۔ بعض دوست انھیں مگر مچھ کے آنسو کہہ دیں..... تو اگر اس کے جواب میں کوفہ کے قاتلینِ حسین کو جو بعد میں روتے رہے ہیں۔ اور آج تک رو رہے ہیں ان کے رونے کو کس کے آنسو کہیں گے؟

10 اگر یزید حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا قاتل ہوتا تو قافلۂ حسین رضی اللہ عنہ کے باقی ماندہ اعزہ نہ اس کے ہاں قیام کرتے، نہ اس سے وظیفہ وصول کرتے، نہ اس کی ہدایات پر عمل کرتے۔

کیونکہ وہ بڑے خود دار اور غیرت مند تھے۔ یہ بیان مع دلائل عقلیہ ونقلیہ آگے آرہا ہے۔

11 جب یہ حادثۂ فاجعہ وقوع پذیر ہوا اس وقت کئی صحابہ رضی اللہ عنہم، صحابیات رضی اللہ عنہن اور اکابرین دین وملت زندہ تھے، اور تعجب یہ ہے کہ کسی قابل ذکر بزرگ نے بھی یزید کو قاتلِ حسین رضی اللہ عنہ قرار نہیں دیا۔ اگر آپ نے کہیں پڑھا ہو تو ان کے اسمائے گرامی سے آگاہ فرمائیں۔

12 حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما سے کسی عراقی نے بحالت احرام مچھر مار دینے کی بابت مسئلہ دریافت کیا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تم نے نواسۂ رسول رضی اللہ عنہ کو شہید کرتے وقت تو کچھ نہ پوچھا، اب مچھر مارنے پر مسئلہ پوچھتے ہو؟'' [1]

اگر حسین رضی اللہ عنہ کا قاتل یزید ہوتا تو حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما عراقیوں کے بجائے یزید کا نام لیتے......!

بدگمانی، ضد اور کینہ اور بات ہے مگر جہاں تک عقل ونقل، حالات و واقعات اور دلائل وشواہد کا تعلق ہے، وہ یزید کو بریٔ الذمہ قرار دیتے ہیں۔ بیشک سو فیصد نہ سہی، مگر اسّی نوّے فیصد امیر یزید بری نظر آتا ہے۔

ہمارے کچھ اہلِ علم وقلم دوست اس سلسلے میں دو بڑے وزنی اعتراض پیش کرتے ہیں، وہ اعتراض معہ مختصر جواب ملاحظہ فرمایئے:

1 پہلا اعتراض تقریباً وہی ہے جس کا ذکر کیا جارہا ہے کہ حسین رضی اللہ عنہ چونکہ یزید کے عہد حکومت میں شہید ہوئے، لہٰذا اس قتلِ حسین رضی اللہ عنہ کا سارا بار یزید پر پڑتا ہے، اور اسے کسی صورت بری قرار نہیں دیا جاسکتا۔

ہم ان احباب کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ دنیا کا کوئی قانون کہتا ہے کہ جس حکومت میں جو لوگ قتل ہوئے ہوں اُن کی سزا حکمران کو ملنی چاہیے۔ اسی طرح کیا یہ

---

[1] صحیح البخاري، فضائل أصحاب النبیﷺ، باب مناقب الحسن و الحسین رضی اللّٰہ عنہما، حدیث:3753.

تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ چونکہ قتلِ عثمان رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے وقت میں ہوا، لہٰذا قتلِ عثمان رضی اللہ عنہ کا بار حضرت علی رضی اللہ عنہ پر پڑتا ہے؟ نیز جب حسین رضی اللہ عنہ شہید ہوئے تو حسین رضی اللہ عنہ کربلا میں اور یزید ان سے سینکڑوں میل کے فاصلے پر دمشق میں تھا۔ مگر جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہوئے سب جانتے ہیں کہ اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ اسی شہر مدینے میں تھے، اور بقول بعض احباب آپ رضی اللہ عنہ مشکل کشا، عالم الغیب اور قادر و مختار بھی تھے، مظلوم عثمان غنی رضی اللہ عنہ کیوں نہ بچ سکے؟ اگر آپ کو دوستوں کے عقائد کا حامل مانا جائے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے عثمان رضی اللہ عنہ کو عمداً قتل کروایا۔ ہم پھر پوچھتے ہیں کہ اسی شہر میں ہوتے ہوئے آپ رضی اللہ عنہ نے سیّدنا حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے تحفظ و دفاع میں سعی بلیغ اور بھرپور جدوجہد کیوں نہ کی؟ ٹھیک ہے آپ رضی اللہ عنہ نے دونوں بیٹوں کو دفاع کے لیے بھیجا تھا، مگر سوال تو یہ ہے کہ مولیٰ علی رضی اللہ عنہ نے بعینہ و بذاتہ کون سی قابل ذکر دلچسپی لی اور سر توڑ کوشش فرمائی، جسے تاریخ اسلام نے اہتمام سے نہ سہی کسی طرح بھی ذکر کیا ہو۔ فما هو جوابكم فهو جوابنا یعنی جو تمھارا جواب ہے وہی ہمارا جواب ہے۔

2 دوسرا اعتراض اس سے بھی وزنی سمجھا جاتا ہے کہ اگر امیر یزید قتلِ حسین رضی اللہ عنہ سے خوش نہ تھا تو اس نے مقتولینِ حسین رضی اللہ عنہ کے خون کا بدلہ کیوں نہ لیا؟

کیا ہم ان معترضین سے یہ دریافت کرسکتے ہیں کہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ قتلِ عثمان رضی اللہ عنہ سے کبیدہ خاطر اور حزین وملول تھے تو آپ رضی اللہ عنہ نے اپنے عہدِ حکومت میں قاتلینِ عثمان رضی اللہ عنہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا انتقام کیوں نہ لیا؟

کیا سیدنا علی رضی اللہ عنہ شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد امیر المومنین نہ ہوئے تھے؟ اگر امیرالمومنین ہوئے تھے تو آپ رضی اللہ عنہ نے قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کو سزا کیوں نہ دلوائی؟ بلکہ آپ رضی اللہ عنہ کے دورِ حکومت میں مسلمانوں کے مابین جو تفرقہ ہوا اور مسلمانوں ہی کے

درمیان جَمل اور صِفّین نام سے جو دو مشہور جنگیں ہوئیں ان کا بنیادی سبب یہی قتل عثمان رضی اللہ عنہ کا قصاص نہ لینا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قصاص کیوں نہ لیا گیا؟...... اگر کسی کو سزا دی ہو یا قصاص لیا ہو تو بتاؤ؟ ہم بڑے ممنون احسان ہوں گے۔ کوئی بھی اعتراض کرنے سے قبل دس بار اس بات پر غور کرنا چاہیے کہیں یہ اعتراض الٹا ہو کر ہم پر ہی نہ پڑ جائے۔ اکثر لوگ اعتراض کر دیتے بلکہ جڑ دیتے ہیں اور آگے گہرائی یا تفصیل میں نہیں جاتے۔ اور قطعاً یہ نہیں دیکھتے کہ اس کا ہدف کون کون بنتا ہے۔ اور وہ بجائے نکلنے کے اور پھنس جاتے ہیں۔ اور یہی حال ہے تصنیف و تالیف میں دوسری طرف کا مطالعہ و معلومات نہ رکھنے والوں کا۔

ویسے ہماری آزادانہ رائے اور ہے، جس کا ہم پیچھے دو ایک جگہ ذکر کر چکے ہیں۔ یہاں پر بھی عرض کرنے میں باک نہیں ہے کہ ہم ذاتی طور پر علیٰ وجہ البصیرت سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ایسے الزامات و اعتراضات سے مبرا سمجھتے ہیں، اور آپ رضی اللہ عنہ کے بارے میں بدظنی یا عناد رکھنے کو ہلاکت و بربادی خیال کرتے ہیں اور آپ رضی اللہ عنہ کے بارے میں نہایت پاکیزہ و اعلیٰ اور صاف ستھرے جذبات رکھتے ہیں۔

ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اگر عوام و خواص کی سوچ کا یہی انداز اپنایا جائے تو پھر ہدف تنقید سے کوئی بڑے سے بڑا آدمی بھی نہیں بچ سکتا، یقیناً یہ بدظنی ہے، اس سے قرآن حکیم نے منع فرمایا ہے۔ ہمیں جہاں تک بن پڑے بدگمانی سے احتراز کرنا چاہیے، مثبت اور تحقیقی انداز اختیار کرنا چاہیے، اور خارجی تاثرات، فرقہ وارانہ پروپیگنڈے یا لاعلمی و جہالت کی بنا پر خواہ مخواہ کسی پر الزام نہیں دھرنا چاہیے اور ہمیشہ ﴿وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ﴾ ''کوئی شخص کتنا قریبی اور محبوب کیوں نہ ہو ہمیشہ عدل و انصاف کی بات کرو۔'' کے ارشاد قرآنی کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ عدل کا یہی تقاضا ہے۔ اہل تشیع کو تو عدل کا اہلسنت سے بھی زیادہ خیال رکھنا چاہیے، کیونکہ

ان کے ہاں ''عدل'' ارکان اسلام اور اصول دین میں سے ہے۔لیکن جائے تأسُّف ہے کہ عدل کے تقاضوں کو وہی زیادہ پامال کرتے ہیں۔کسی سے دشمنی خواہ کتنی ہو (اگرچہ وہ بھی کسی حد تک ہی ہونی چاہیے) مگر تقاضائے عدل اس سے بلند ہے۔بات ہمیشہ عدل وانصاف کی کرنی چاہیے۔بیشک عدل وانصاف پر قرآن مجید نے بہت زور دیا ہے۔

یزید کا تأثر و تأسف

سفاک ابن زیاد نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور دیگر شہداء کے بریدہ سروں کے ساتھ بھی اچھا سلوک نہ کیا اور انھیں اہلِ کوفہ کی عبرت کے لیے شہر کے گلی کوچوں میں پھرایا۔ پھر زحر بن قیس کی زیرِ نگرانی ان مقدس بریدہ سروں کو یزید کے پاس روانہ کیا، تاکہ داد تحسین وصول کی جاسکے، چنانچہ یزید کے پاس پہنچ کر اس نے اپنا ''کارنامہ'' یوں بیان کیا کہ ''آپ کو فتح و کامرانی کی مبارک ہو...... حسین رضی اللہ عنہ ہمارے مقابلے میں آگئے اور جنگ کے لیے تیار ہوگئے، چنانچہ ہم نے ان لوگوں کو گھیر لیا، اور یہ ادھر اُدھر بھاگتے رہے، مگر انھیں کہیں پناہ نہ ملی، بالآخر ہم نے اُن کا کام تمام کردیا، اور ان کے جسم برہنہ پڑے ہیں۔''[1]

مگر ''البدایہ والنہایہ'' میں اگلی وضاحت یہ آتی ہے کہ ''غاضریہ'' جو نواح کوفہ میں کربلا کے قریب ایک قریہ ہے، وہاں کے ساکنین بنو اسد نے قتل کے دوسرے دن شہداء کو دفن کیا تھا[2] یعنی وہ پڑے نہیں رہے تھے، بلکہ اگلے روز دفن کردیئے گئے تھے۔

جب یہ لوگ یزید کے پاس گئے تو انھوں نے اپنی کارکردگی بتانے کے بعد یزید سے وضاحۃً و اشارۃً انعام و اکرام کا بھی تقاضا کیا، کیونکہ ان کی یہ ساری ظلم کی کارروائی اسی لیے تھی کہ شاہی دربار سے انعام اور عزت ملے...... مگر وہ دونوں چیزوں سے محروم رہے، اور انھیں انعام و عزت سے کچھ نہ ملا۔

---

① تاریخ الطبري: 5/459-460. ② تاریخ الطبري: 5/455، والبدایة والنهایة: 8/191.

عام مؤرخین نے اس موقع پر بھی بڑے افسانے تراشے ہیں مثلاً:

''یزید قتلِ حسین رضی اللہ عنہ سے بہت خوش ہوا، اور اس نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے دانتوں پر چھڑی رکھی، اور یہ کہا، اور وہ کہا، اس کے پاس کھڑے ایک شامی نے اہلِ بیت رضی اللہ عنہم کی ایک جواں سال لڑکی سیّدہ سکینہ رحمۃ اللہ علیہا کے بارے میں فلاں ناروا درخواست کی، اس پر سیدہ زینب رضی اللہ عنہا سیخ پا ہوگئیں جس پر یزید اور زینب رضی اللہ عنہا میں تلخ مباحثہ شروع ہوگیا، نیز یزید نے شہدائے کربلا پر شادیانے بجائے۔ قاتلینِ حسین رضی اللہ عنہ کو جائیدادیں دیں۔ اور طرح طرح کے انعامات سے نوازا، اور انھیں مناصب میں ترقیاں دیں۔ اور یزید اور اس کا خاندان کئی روز تک جشن مناتا اور گھی کے چراغ جلاتا رہا۔ وغیرہ وغیرہ۔''

لیکن یہ سب باتیں محض ایک افسانہ اور ڈھکوسلے ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ یزید کو اس حادثہ سے بڑا رنج ہوا اور اس نے جو لوگ اس کیس میں شریک تھے اُن سب کو بُرا بھلا کہا، انھیں اپنی مجلس سے دھتکار دیا۔ دل گرفتہ ہو کر دیر تک روتا رہا، اور اس کے اہلِ خانہ بھی روتے رہے، اور بقیۃ السیف افراد سے نہایت اعزاز و اکرام سے پیش آیا......۔

یہ وہ حقائق ہیں کہ جن کا اہلِ تشیع کو بھی انکار نہیں......ان شواہد و حقائق کو دلائل اور اہتمام سے پیش کرنے کی کوئی خاص ضرورت تو نہ تھی مگر پھر بھی ہم قارئین کرام کی تسکین اور اضافۂ معلومات کے لیے چند حوالہ جات پیش کیے دیتے ہیں کہ جن سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یزید قتلِ حسین رضی اللہ عنہ سے ناخوش ہوا۔ بڑا مغموم اور رنجیدہ رہا۔ بلکہ اس کے بعد زندگی بھر وہ مضطرب و بے چین رہا۔ تا آنکہ وہ موت کی آغوش میں چلا گیا۔

کتب میں لکھا ہے:

یزید نے جب زحر بن قیس کی زبان سے شہادت حسین رضی اللہ عنہ کی خبر سُنی تو کچھ دیر دم

بخود رہا، پھر سر اُٹھا کر کہا: میں اس پر ہی راضی تھا کہ بلاقتلِ حسین رضی اللہ عنہ میری اطاعت کی جاتی، لیکن میں اگر ان کے ساتھ ہوتا تو حسین رضی اللہ عنہ کو ضرور معاف کر دیتا۔[1]

یزید نے یہ افسوس ناک خبر سنتے ہی ﴿اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ﴾ پڑھا۔

یزید انگشت بدندان گزید، "یعنی یزید نے دانتوں تلے انگلی دبالی۔"[2] عموماً غیر متوقع خبر سن کر اس طرح حیرت واستعجاب کا اظہار کیا جاتا ہے۔

"یزید خود رویا۔"[3] اس کی بیوی روتی ہوئی بے پردہ باہر نکل آئی۔ (یعنی ناگہانی صدمے میں جیسے اوسان قائم نہ رہے ہوں ویسے وہ بڑی باحیا اور باپردہ خاتون تھی)[4]

"یزید نہ صرف جلوت میں بلکہ خلوت میں بھی روتا رہتا تھا۔"[5]

"یزید کی دختران اور ہمشیرگان روتی تھیں۔"[6]

"تباہ حال قافلہ جب دمشق پہنچا، تو یہ دیکھ کر یزید رو پڑا، وہ رومال سے آنسو پونچھتا تھا۔"[7]

یزید نے جب شہدائے کربلا کی خبر سُنی تو اس کی آنکھیں اشک بار ہوگئیں۔ کہنے لگا: "میں بغیر قتلِ حسین رضی اللہ عنہ کے بھی تمھاری اطاعت سے خوش ہوسکتا تھا، ابن سُمَیَّہ (یعنی ابنِ زیاد) پر خدا کی لعنت! واللہ! اگر میں وہاں ہوتا تو حسین رضی اللہ عنہ سے درگذر کرتا، اللہ تعالیٰ حسین رضی اللہ عنہ کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے۔"

اور یہ بات شیعہ سنی تقریباً سب کتب میں موجود ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ قاصد کو یزید نے کوئی انعام نہیں دیا۔[8]

یزید کے دروازے پر پہنچ کر محضر بن ثعلبہ چلایا اور کہا: "میں امیر المومنین کے پاس

---

① ناسخ التواریخ، ص: 369. ② نہج الاحزان، ص: 321. ③ خلاصة المصائب، ص: 326. ④ خلاصة المصائب، ص: 315. ⑤ خلاصة المصائب، ص: 393. ⑥ خلاصة المصائب، ص: 292,294. ⑦ خلاصة المصائب، ص:293. ⑧ شهادتِ حسین ابو الکلام آزاد بحواله ابن جریر۔ کامل و تاریخ کبیر ذهبی، ص: 60.

فاجر کمینوں کو لایا ہوں۔" یزید یہ سن کر خفا ہوا، کہنے لگا "محضر سے زیادہ کمینہ اور شریر بچہ کسی عورت نے نہیں جنا۔" [1]

شمر نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا سر مبارک یزید کو پیش کرتے وقت کہا ۔

اِمْلَا رِکَابِیْ فِضًّا وَ ذَهَباً   قَتَلْتُ خَیْرَ الْخَلْقِ أَمًّا وَ أَبًا

"یعنی میرے رکاب (برتن) کو سونے اور چاندی سے بھر دے، کیونکہ میں نے اسے قتل کیا جو ماں اور باپ (دونوں کی طرف) سے سب سے بہتر تھا۔"

یزید نے سخت غضبناک ہو کر جواب دیا:

"خدا تیرے رکاب کو آگ سے بھرے، تیرے لیے بربادی ہو، جب تُو جانتا تھا کہ حسین رضی اللہ عنہ مخلوق میں بہترین ہیں تو تُو نے انھیں کیوں قتل کیا؟ میری نگاہوں سے دُور ہو جا، تیرے لیے میرے پاس کوئی انعام نہیں۔" [2]

یزید نے کہا: "میری طرف سے تجھے کوئی انعام نہیں۔" یہ سُن کر شمر خائب و خاسر دفع ہو گیا، اور اس طرح وہ دین و دنیا میں بے نصیب رہا۔ [3]

ملا اسحاق الغرائینی اور صاحب ناسخ التواریخ نے لکھا ہے:

"یزید نے مجمع عام میں ایک تقریر کی جس میں فرداً فرداً سب قاتلینِ حسین رضی اللہ عنہ پر لعنت کی۔" [4]

یزید نے کہا: "ابن زیاد ملعون نے حسین رضی اللہ عنہ کے معاملہ میں عجلت سے کام لیا۔ میں ان کے قتل پر راضی نہ تھا۔" [5]

"حسین رضی اللہ عنہ کو اس (ابن زیاد) نے قتل کیا، خدا اس کو غارت کرے۔" [6]

---

① شہادت حسین رضی اللہ عنہ، ص: 76. ② خلاصۃ المصائب، ص: 304. ③ ناسخ التواریخ، ص: 269. ④ ملخص ترجمہ مقتل امام الغرائینی، ص: 198. ⑤ جلاء العیون، ص: 527. ⑥ ناسخ التواریخ، ص: 378.

یزید نے حکم دیا: ''اہل بیت رضی اللہ عنہم کو خاص مکان (بہترین رہائش گاہ) میں اتارا جائے۔ اور ان کی ضرورت کی ہر چیز بہم پہنچائی جائے۔'' (اور لکھا ہے) جب تک امام زین العابدین رحمہ اللہ دستر خوان پر نہ آتے، یزید کھانا نہ کھاتا۔ نہ آرام کرتا۔[1]

مذکورہ دلائل و شواہد پڑھ کر کئی دوست کہتے ہیں کہ عبارات اور حوالہ جات تو صحیح ہیں مگر یزید نے یہ سارا کچھ دل سے نہیں کیا تھا۔ بس دکھانے کے لیے اوپر اوپر سے کیا تھا۔ اگر وہ یہ نہ کرتا تو اس کا اپنوں میں بھی مقام کھو جاتا وغیرہ وغیرہ۔ ہم کہتے ہیں: دل کی کیفیت تو اللہ تعالیٰ جانتا ہے لیکن ہمیں ظاہری دلائل و شواہد کے اخذ و قبول کا حکم ہے۔ ہمیں بجائے بدظنی کرنے کے حسن ظنی کے پہلو کو غالب رکھنا چاہیے۔ اس میں زیادہ بہتری اور پائیداری ہے۔ بدظنی سے بہت سی قباحتیں جنم لیتی ہیں۔ سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ شریعت کا دامن ہاتھ سے چھوٹتا اور فساد فی الارض پروان چڑھتا ہے۔

اب دوسرا پہلو دیکھئے کہ یزید نے بحیثیت سربراہ مملکت ہونے کے کس طرح حادثہ کربلا کے باقی ماندہ افراد سے احترام اور شفقت کا برتاؤ کیا۔ یزید نے حکم دیا: (یہ عبارت اوپر گزر چکی ہے) ''اہل بیت رضی اللہ عنہم کو خاص مکان میں اتارا جائے اور ان کو ضرورت کی ہر چیز بہم پہنچائی جائے، (اور احترام کا یہ عالم تھا کہ) جب تک حضرت زین العابدین رحمہ اللہ دستر خوان پر نہ آتے یزید کھانا کھاتا، نہ آرام کرتا۔''[1]

ہم نے شیعہ کتب کے عام حوالہ جات عمداً دیے ہیں تاکہ کسی کو اس بات میں شبہ باقی نہ رہے کہ یزید قتلِ حسین رضی اللہ عنہ سے راضی تھا۔ بات ایسے نہیں، بلکہ امرِ واقع یہ ہے کہ یزید قتلِ حسین رضی اللہ عنہ سے ناخوش، ناراض، غضبناک اور حد درجہ رنجیدہ و ملول تھا اور اس نے اس جرم میں ملوث لوگوں کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔ اور انعام دینا تو رہا الگ غصہ اور افسوس سے انھیں اپنی مجلس میں بیٹھنے بھی نہ دیا۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ یہ

---

[1] طراز مذہب مظفری، ص: 468.

یزید کی خواہش، ہدایت اور مقصد سبھی کے خلاف ہوا تھا۔ معتبر کتب سے پتہ چلتا ہے کہ یزید بقیہ افراد سے ہمدردی سے پیش آیا۔ اور اس ستم رسیدہ قافلے سے اس نے بڑی عزت کا سا سلوک کیا اور انھیں احترام سے رخصت کیا......۔

دمشق سے رخصت ہوتے وقت یزید نے حضرت زین العابدین رحمہ اللہ کو دو لاکھ دینار دیئے اور کہا کہ مجھے لکھتے رہیے اور اپنی ضروریات کی برابر اطلاع دیتے رہیے۔ یہ بات کہیں نہیں ملتی کہ آپ نے وہ رقم قبول نہ کی ہو یا واپس بھجوادی ہو۔ کیا دشمن، کافر اور باپ کے قاتل سے حضرت زین العابدین رحمہ اللہ یہ نذرانہ وصول فرما سکتے تھے؟ ہرگز نہیں۔ مگر یہ رقم آپ نے وصول فرمالی۔

اور حضرت ام کلثوم رحمہا اللہ کو بھی ایک تھیلی دی، اور کہا: «يَا أُمَّ كُلْثُومٍ خُذِي هٰذَا الْمَالَ عِوْضَ مَاأَصَابَكُمْ» "ام کلثوم! یہ مال لیجئے۔ یہ آپ کی مصیبتوں کا معاوضہ ہے۔"

سیدہ سکینہ رحمہا اللہ کے بارے میں آتا ہے: «كَانَتْ سَكِيْنَةُ تَقُولُ مَارَأَيْتُ رَجُلًا كَافِرًا بِاللّٰهِ خَيْرٌ مِنْ يَزِيْدَ» "میں نے کبھی کوئی اللہ کا ناشکرا انسان یزید سے بڑھ کر اچھا سلوک کرنے والا نہیں دیکھا۔"[1] یہاں رَجُلًا كَافِرًا کے معنی بعض دوستوں نے "اللہ کا منکر اور کافر" کردیا ہے لیکن اس کے معنی "کافر و منکر" کرنا درست نہیں۔ ورنہ یہ لازم آئے گا کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے کافر و منکر کو اپنا جانشین منتخب کیا۔ اسی طرح دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم اور اہل اسلام نے ایک کافر و منکر کو خلیفۃ المسلمین تسلیم کیا۔ اس لیے معنی وہی درست ہیں جو اہل علم نے کیے۔ اور پاک و ہند کے مسلمہ عالم مولانا ابوالکلام آزاد نے کیے۔ مطلب یہ کہ وہ ان سب عظیم ہستیوں کے ساتھ بڑا

---

① شہادت حسین، ابوالکلام آزاد، ص: 77. یہ حوالہ مندرجہ ذیل کتب میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ تاریخ طبری: 364/5، وتاریخ کامل: 86/4، نور الابصار، ص: 145، تنویر الازھار، ص: 470.

فیاضانہ سلوک کیا کرتا تھا۔

سیدہ زینب ؓ نے دمشق ہی میں رہنا پسند فرمایا۔ چنانچہ وہیں سکونت اختیار کر لی اور وہیں آپ کی تدفین ہوئی، یعنی بقایا پوری زندگی وہیں رہیں۔ اور بڑے امن وسکون سے رہیں۔ اس کی عام طور پر دو وجوہات بیان کی جاتی ہیں:

پہلی وجہ: امیر یزید کا اہلِ بیت کے ساتھ حد درجہ ہمدردانہ سلوک تھا۔

دوسری وجہ: امیر یزید کی بیوی اُم محمد، سیدہ زینب کی سوتیلی بیٹی تھیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ امیر یزید کو قتل حسین ؓ سے بہت رنج ہوا اور اس نے اہل بیت کو بڑے اعزاز واکرام سے رخصت کیا، اور ان کے محافظ دستے کو تاکید کی کہ انھیں خیال سے مدینے پہنچایا جائے۔ انھیں راستے میں کوئی تکلیف نہ ہو، انھیں جس چیز کی ضرورت ہو مہیا کی جائے اور ان کی آسائش کا پورا پورا خیال رکھا جائے۔ امیر یزید نے ممکن حد تک ان کی اشک شوئی کی اور انھیں ہر اعتبار سے خوش بخوش روانہ کیا۔

مستند روایات کے مطابق اہل بیت کو یزید پر کسی قسم کا گلہ شکوہ نہ تھا، یزید کو ان سے محبت اور دلی ہمدردی تھی۔ جس کے مظاہر وہ دیکھ چکے تھے۔ اور ساتھ کھانا کھا کر اور اچھا رویہ دیکھ کر انھوں نے الفاظ میں بھی اچھا اظہار کیا تھا۔ اور یہ بڑی کشادہ ظرفی ہے۔

یہ جو بعض دوست کہتے ہیں کہ ہاں جی! یزید نے یہ سب کچھ کیا تھا مگر اوپرا اوپر سے کیا تھا اندر سے نہیں کیا تھا۔ مگر یہ تأثر اس قافلے نے تو نہ دیا تھا جو یزید کے پاس رہا؟ اور نہ یہ انکشاف کسی صحابی، تابعی یا امام نے کیا؟ معلوم نہیں ہمارے ایسے برادران کو یہ کیسے علم ہوا کہ یزید دل سے ایسا نہیں کرتا تھا، اوپرا اوپر سے کرتا تھا۔

ایک وضاحت

یزید بن حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں علمائے امت مختلف خیالات رکھتے ہیں۔ بعض برے خیالات رکھتے ہیں بعض اچھے اور بعض متوسّط۔ ہمارے خیالات متوسط ہیں۔ جیسا کہ آپ کو "سیرت حسین رضی اللہ عنہ مع سانحہ کربلا" کے مطالعہ سے اندازہ ہو چکا ہوگا۔ ہم صرف صحابہ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہم کی پوزیشن صاف کرنا چاہتے ہیں۔ ورنہ ہمیں یزید کے ساتھ عقیدت ہے نہ محبت۔ نہ یہ ہمارے ایمان کے لیے ضروری ہے نہ شرط۔ ہمارے لیے جو بات ضروری ہے وہ صحابہ و اہل بیت رضی اللہ عنہم سے عقیدت و محبت اور ان کا دفاع ہے۔ ان کا ہر ممکن ادب و احترام بجا لانا لازمی ہے۔ بے ادبی بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ، ہم دیکھ سکتے ہیں نہ برداشت کر سکتے ہیں۔

یزید بن امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی زندگی کے دو دور ہیں۔ پہلا دور شہادت حسین رضی اللہ عنہ سے پہلے کا ہے۔ دوسرا شہادت حسین رضی اللہ عنہ کے بعد کا ہے۔ ان دونوں ادوار میں بڑا فرق ہے۔ جن علماء نے اس کے خصائل و محاسن بیان کیے ہیں انھوں نے عموماً پہلے دور کو پیش نظر رکھا ہے۔ اور اس کے برعکس جن اہل علم نے اس کے عیوب و نقائص بیان کیے ہیں انھوں نے عموماً دوسرے دور کو پیش نظر رکھا ہے۔ دونوں نے ضد، تعصب یا اپنے پہلے سے بنے اور جمے ہوئے خیالات یا یکطرفہ یا محدود مطالعہ یا تقلیدی ذہن کی بنا پر اپنے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ اور حوالہ جات کو سیاق و سباق سے ہٹا کر یا کاٹ کر درج کیا ہے۔ اور ہمیں کہتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے کہ حوالہ جات کو عام کتب سے نقل در

نقل کر دیا ہے، اور تحریف و خیانت سے بھی دریغ نہیں کیا۔ اور کئی جگہ معنی ہی غلط کر دیے ہیں۔ حالانکہ یہ باتیں اصحاب علم اور اہل انصاف کی شان کے منافی ہیں جو انھیں زیب نہیں دیتیں..... ایسی ہی باتوں نے قوم کو الجھا دیا اور اس کا بٹوارہ کر دیا ہے۔ جو لوگ قرآن و حدیث میں "فنکاریاں" کرنے سے نہیں چوکتے وہ تاریخ اسلام و سیر صالحین سے کیونکر رعایت برتیں گے؟

اس بات کا ہمیں انکار نہیں کہ ہم نے بعض مقامات پر ایک حد تک یزید کا دفاع کیا ہے۔ اس سے ہمارا مقصد یزید کا دفاع نہیں بلکہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا دفاع ہے۔ سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا دفاع ہے۔ قرآن کا دفاع ہے، حدیث کا دفاع ہے۔ محدثین رحمہم اللہ کا دفاع ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یزید کی پوزیشن جس قدر گدلی ثابت کریں گے یزید کو خلیفہ برحق ماننے والوں کی پوزیشن بھی اسی قدر مکدّر اور گدلی ثابت ہوگی۔ اگرچہ بعض دوستوں نے رخصت و عزیمت کہہ کر جواب دینے کی کوشش فرمائی ہے مگر ان کا جواب بھی غیر تسلی بخش ہے۔ جو کم از کم علم دوست قارئین کی تسلی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ برے اور فاسق و فاجر کی تائید میں رخصت سے کام لینا بھی شان صحابہ رضی اللہ عنہم سے بعید ہے۔ ہم نے جو کچھ لکھا ہے وہ عدل و انصاف کے تقاضوں کا خیال رکھتے ہوئے لکھا ہے۔ جس سے صحابہ رضی اللہ عنہم کی پوزیشن مکدر ہوتی ہے نہ اہل بیت رضی اللہ عنہم کی عزت پر کوئی دھبہ آتا ہے نہ لانا چاہیے۔ اللہ کے فضل و کرم سے ہم نے ان باتوں کا خیال رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ارباب ذوق و تحقیق کو ہماری کتاب میں عدل بھی نظر آئے گا اور اعتدال بھی۔ ہم نے اپنی آزادانہ رائے کا برملا اظہار کیا ہے، اگر ہماری رائے سے کسی کو اختلاف ہو تو لاحرج۔ ہاں! دلیل کے ساتھ اختلاف کرنے کا اختیار بحال ہے، وہ سلب نہیں ہو سکتا۔ ہم اپنا نظریہ خواہ مخواہ کسی پر ٹھونسنا روا نہیں جانتے۔ جو مانتا ہے مانے، جو نہیں مانتا نہ مانے۔ ہمارے ساتھ اتفاق رائے رکھتا ہے اس کی مرضی، اختلاف رائے رکھتا ہے اس کی مرضی۔ یہ ہماری محتاط رائے اور ممکنہ تحقیق ہے۔ ہمارا کسی پر دباؤ ہے نہ ہونا چاہیے۔

غلط روایاتِ شہادت

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے واقعات کو بعض غالی مؤرخین خصوصاً شیعی مؤرخین نے بہت مبالغہ آمیزی سے بیان کیا ہے۔ سچ میں جھوٹ کی آمیزش سے ان کا مقصود یہ ہے کہ جو لوگ سانحہ کربلا کو پڑھیں ان کے دل سوز و گداز میں ڈوب جائیں، اور وہ نوحہ و ماتم، گریہ و مرثیہ، سینہ کوبی اور شیون وشین میں شریک ہو کر عاشقِ حسین رضی اللہ عنہ واہلِ بیت رضی اللہ عنہم بن جائیں اور جان لیں چونکہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ مظلوم شہید ہوئے ہیں لہٰذا آپ رضی اللہ عنہ کی یاد میں تابوت وتعزیہ بنانے اور نکالنے لگیں وغیرہ وغیرہ۔ اہل تشیّع کے ہاں تو یہ امور عبادات کا درجہ رکھتے ہیں۔ اور ان کے ہاں توحید وشرک اور سنت و بدعت میں کوئی حد فاصل نہیں ہے۔ مگر افسوس اہل سنت پر ہے کہ ان کے بھی بہت سے اصحاب منبر وقرطاس باوجود اہل تشیّع سے اختلاف کا اظہار کرنے کے تحریر وتقریر میں قریب قریب انھیں کا انداز اختیار کر لیتے ہیں۔ اگر آپ ان کی تحریر وتقریر پڑھیں یا سنیں تو دونوں میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آئے گا۔ اللہ ایسے لوگوں کو سنت کی حقیقت سمجھنے اور اپنے اور ان کے درمیان فرق پہچاننے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

بیشک حضرت حسین رضی اللہ عنہ مظلوم شہید ہوئے۔ آپ رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ بے حد المناک اور انتہائی کربناک ہے۔ اس سے کون مسلمان متأثر نہیں ہوتا؟ کون سا کلمہ گو ہے جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور اہلِ بیت اطہار رضی اللہ عنہم کے فضائل ومحامد اور درجات ومراتب

کا منکر ہے؟ اور ان سے عقیدت و محبت نہیں رکھتا؟

ہاں! جس بات کا اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حکم نہیں دیا۔ اور جس بات کو اہلِ بیت و صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اختیار نہیں کیا، اس کو اختیار کرنا اور ان کی مخالفت کر کے غیر شرعی امور پر عمل پیرا ہونا بڑا گناہ ہے جس سے اسلام نے شدید نفرت کا اظہار کیا ہے۔ تمام مسلمانوں کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی اور مخالفت سے ڈرنا چاہیے۔ اور اپنی مقصد براری کے لیے باطل اور بناوٹی روایات بنانے اور سنانے سے یکسر پرہیز کرنا چاہیے۔

انھی باطل روایات میں یہ بھی ہے کہ جب یزید کے پاس حضرت امام کا سر اقدس لے جایا گیا تو سر اقدس وہاں سے غائب ہو گیا اور اس کو فرشتے اٹھا کر آسمان پر لے گئے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فرشتے آپ رضی اللہ عنہ کا سر آپ کی لاش کے پاس لائے، آپ رضی اللہ عنہ کے جسم کے ساتھ جوڑ دیا۔ پھر آپ رضی اللہ عنہ کی میت کو ملائکہ نے غسل دیا اور جنتی کفن پہنا کر اس جگہ دفن کر دیا جہاں آج کل روضۂ حضرت حسین رضی اللہ عنہ ہے۔ مگر یہ سب باتیں خود ساختہ، جعلی اور دروغ بے فروغ ہیں۔ تاریخی روایات سے کچھ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو کہاں اور کس طرح دفن کیا گیا۔ موجودہ مقبرۂ حسین رضی اللہ عنہ بھی مشکوک ہے اور وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ حضرت گرامی قدر یہیں مدفون ہیں! بس جتنے منہ اُتنی باتیں۔ بہر حال آپ رضی اللہ عنہ کے سر اقدس کے متعلق کوئی تاریخی شہادت نہیں ملتی کہ وہ کہاں دفن کیا گیا، صرف قیاس آرائیاں اور اندازے ہی ہیں۔ اور ان میں کذب کا احتمال زیادہ ہے۔

علاوہ بریں شہادت کے وقت جو جو ظلم امامِ مظلوم پر کیے گئے ہیں، غالی محبانِ حسین رضی اللہ عنہ ان میں رنگ آمیزی کرتے اور من گھڑت افسانے تراش تراش کر پیش کرتے ہیں۔ جو کچھ لکھا اور سنا گیا وہی کچھ کم ستم خیز و جفا انگیز نہیں، پھر طرح طرح

جھوٹ موٹ واقعات گھڑ کر شامل کرنے سے کیا حاصل؟

ہاں ہاں! حاصل یہی ہے کہ یزید کی ستم رانی اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور آپ کے قافلے کی مظلومیت کو بڑھا چڑھا کر بیان کر کے عوام میں بے پناہ درد وسوز اور رنج وغم پیدا کیا جائے، بدعاتِ شنیعہ کی خوب اشاعت کی جائے اور مردوں، عورتوں اور بچوں کو اپنا ہمنوا بنا کر سبائیت کو جس قدر ہو سکے بڑھایا اور پھیلایا جائے۔ اور قوم کا قیمتی وقت اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور سیرت حسین رضی اللہ عنہ پر عمل کرنے کے بجائے رونے پیٹنے اور رسومات ادا کرنے پر صرف کیا جائے۔ انا للہ! ہمیں رونے پیٹنے اور گریہ و بکا کی بے مقصد محافل برپا کرنے کے بجائے اس عظیم سانحہ سے قیمتی اسباق لینے چاہئیں۔ اور وہ کافی اور بہت مفید اور فکر آ گیں ہیں۔

درسِ عبرت وموعظت

امام الشہداء[1] حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی مقدس ومنور زندگی اور پاکیزہ وعظیم شہادت سے ہمیں بہت سے بیش قیمت اور نفع بخش اسباق ملتے ہیں۔ ہمیں سب سے پہلے ادھر توجہ دینی چاہیے۔ شہدائے کربلا کی شہادت ایک بڑا سانحہ ہے۔ ہمیں خود ساختہ رسومات کی خاطر وقت، دولت اور توانائی صرف کرنے اور اپنے بھولے بھالے بچوں کو غلط راہ پر ڈالنے، اور انھیں سینہ کوبی کی ٹریننگ دینے کی بجائے اس سانحہ کے اسباب و عوامل اور نتائج و اسباق کی جانب توجہ دینی چاہیے۔

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے بھائیوں نے آپ رضی اللہ عنہ کی شہادت عظمیٰ سے اسباق و دروس حاصل کرنے کے بجائے رونے پیٹنے، آہ و بکا کی مجالس بپا کرنے، تعزیہ وعلم کے جلوس نکالنے، نالہ وشیون کرنے اور اپنے ہاتھوں سے اپنے ہی سینوں پر زنجیریں مارنے اور خون بہانے کو مقصد زندگی بنا لیا ہے، اور سال میں دو ایک مرتبہ رو پیٹ کر اور جلوس نکال کر چہلم شہداء اور محفل مسالمہ و چہلم وغیرہ منعقد کر کے مطمئن ہو جاتے اور اپنے تئیں یہ سمجھتے ہیں کہ جس مقصد کے لیے آپ رضی اللہ عنہ نے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی قربانی دی تھی وہ پورا ہو چکا۔ یقین جانیے! یہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور شہدائے

---

[1] آپ اپنے قافلے کے بھی امام تھے اور آپ کی شہادت شہدائے کربلا میں چونکہ سب سے بڑھ کر مظلومانہ شہادت تھی اس طرح آپ شہدائے کربلا کے بھی امام ہوئے۔ البتہ ''سید الشہداء'' کا لقب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کو عنایت فرمایا تھا، لہٰذا یہ انھی کے لیے خاص رہنا چاہیے۔

کربلا کے ساتھ ایک مذاق اور اپنے آپ سے کھلا دھوکا ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ کی شہادت کا ہرگز یہ مقصد نہ تھا، بھلا اتنا عظیم انسان، اتنی بڑی شہادت اور اتنا تاریخی سانحہ اور اتنا پست مقصد؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ یہ سانحہ کربلا پر پانی پھیرنے کے مترادف ہے۔

یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ کوئی اسلامی حکم یا دنیائے تاریخ کا اہم واقعہ فلسفہ اور فائدہ سے خالی نہیں۔ مگر معذرت کے ساتھ عرض ہے کہ اگر یہ رونا اور پیٹنا اور اس طرح کے جلسے منعقد کرنا یا جلوس نکالنا اور بدن سے خون نکالنا بھی اسلامی حکم ہوتا تو اس کا کوئی فلسفہ اور فائدہ ہمارے سامنے آتا، مثلاً اس کا کوئی ثواب ہوتا، یا اہل بیت رضی اللہ عنہم کی ارواح کو سکون ملتا، یا قاتلین حسین رضی اللہ عنہ کو نقصان پہنچتا، یا غیر مسلم اچھا تأثر لیتے، یا ملتِ اسلامیہ پر اس کا خوشگوار اثر پڑتا، یا سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ارشادات اہلِ بیت رضی اللہ عنہم پر عمل ہوتا اور احیائے توحید وسنت ہوتا۔ مگر اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا، ہر طرح کا نقصان ہی نقصان ہے۔ دوستوں نے رونے پیٹنے کے جو استدلالات بیان کیے ہیں اور فلسفے بتائے ہیں ان سے ہم بے خبر نہیں، مگر کیا کیا جائے وہ سب کے سب اس قدر لا یعنی ہیں کہ انھیں کسی کے سامنے پیش کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ ان میں ایک بھی دلیل معتبر نہیں۔ کیونکہ سب کی سب دوستوں کی دماغی اختراعات ہیں۔ ان کے سوا کچھ نہیں۔ انھیں ہم کبھی الگ بیان کریں گے۔ (ان شاء اللہ)

ضد اور تعصب الگ چیز ہے لیکن اگر بہ نگاہِ غور دیکھا جائے تو رونے پیٹنے کے اس دھندے کی مطلق افادیت نہیں، بلکہ جانی، مالی، روحانی اور اسلامی ہر طرح کا خُسران ہی ہے اور جذبہ جہاد جو ملت اسلامیہ کا طرۂ امتیاز ہے، وہ سرد پڑ جاتا ہے۔ بھلا جب لوگ شہید کو روئیں پیٹیں گے، اس کا سوگ اور غم منائیں گے، تو آنے والی نسلیں کب اس فضیلت والی شہادت کو حاصل کرنے کی کوشش کریں گی؟ وہ تو جہاد اور شہادت کو ایک صبر آزما، بڑا کٹھن اور رنجیدہ مرحلہ سمجھیں گی۔ اور اس سے گریز کی راہ اختیار کریں

گی۔ اور وہ رزق حلال کمانے کے بجائے اپنا قیمتی وقت ان کاموں میں لگا دیں گی، جیسا کہ بے دریغ لگایا جا رہا ہے۔ خود ہی فرمایئے پھر کیوں نہیں اس سے بزدلی وکاہلی بڑھے گی؟ اور جذبۂ جہاد کو دھچکا لگے گا؟ اور ملت اسلامیہ کیوں نہ عملی میدان میں پیچھے رہ جائے گی؟ اگر قوم اسی ڈگر پر چلتی رہی تو پتہ نہیں آئندہ کیا بنے گا؟ زمانہ مستقبل کی کیفیت خدا خبر کیا ہو۔ ایسے لوگوں میں ابھی سے یہ بزدلی اور جہاد سے گریز پائی جا رہی اور عقیدہ وعمل کی خامیوں میں اضافہ ہوتا نظر آ رہا ہے۔ اسی لیے قرآن مجید نے شہداء کو مردہ کہنے بلکہ مردہ خیال کرنے سے بھی منع فرما دیا ہے تاکہ مسلمانوں میں بزدلی، کمزوری، سستی اور خوف والے آثار نظر نہ آئیں۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو عازم فردوس ہوئے آج کم وبیش 14 سو برس ہو رہے ہیں۔ اور ایک طبقہ رو پیٹ رہا ہے اور اس قدر اہتمام اور باقاعدگی کے ساتھ گریہ وبکا کی مجالس منعقد کر رہا ہے جیسے یہ بھی کوئی بڑی عبادت اور اسلام کا چھٹا رکن ہو۔ خود کہیے ہماری قومی وملّی افسوسناک یہ صورتحال دیکھ کر کیونکر کسی کے دل میں جذبہ جہاد ابھرے گا؟ اور شوق شہادت انگڑائیاں لے گا؟ نئی نسل تو آہ وبکا اور رونے پیٹنے کی یہ مجالس دیکھ کر شہادت کے لفظ سے خوفزدہ ہو جائے گی۔

ہمارے ہاں یوں بھی رونا پیٹنا بے صبری کا مظاہرہ مُردوں کے لیے ہوتا ہے، جبکہ بمطابق قرآن مجید شہداء زندہ ہیں۔ جب تسلیم کر لیا کہ زندہ ہیں تو پھر انھیں رونا پیٹنا کیسا؟ امید ہے ہمارے بھولے بھالے دوست ان باتوں پر غور کرنے کی کوشش فرمائیں گے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ کسی حادثے اور افسوس ناک واقعے کو پڑھنے یا سننے پر دل گداز ہو جائے اور آنسو پھوٹ نکلیں، رونا آ جائے تو یہ منع ہے۔ بیشک رونا جائز، (اور پیٹنا تو ہر صورت میں منع ہے،) بشرطیکہ رونا فطری ہو، بناوٹی نہ ہو۔ فطری رونا وہ ہے جس کے

لیے وقت، جگہ متعین نہ ہو اور منصوبہ نہ بنایا گیا ہو، فطری اور قدرتی رونا ان چیزوں کا پابند نہیں ہوتا، فطری اور بناوٹی رونے کی روشن مثال دیکھنی ہو تو حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کے بیٹوں کو دیکھ لیجیے۔ فراقِ یوسف میں حضرت یعقوب علیہ السلام کا رونا سچا تھا۔ اور اس کے برعکس ان کے بیٹوں کا رونا جھوٹا۔ جھوٹے رونے میں سب کچھ متعین اور طے شدہ ہوتا ہے۔ کیا ہم قرآن مجید کے اسی اصول کے مطابق اپنی گریہ و بکا کی محافل کا جائزہ لے سکتے ہیں۔

فطری رونے میں اگرچہ اباحت ہے مگر اس میں بھی آپے سے باہر ہونے کی اجازت نہیں، ہاتھ اور زبان مکمل قابو میں ہو، ورنہ یہ بھی ممنوع ہے۔

ہم یہاں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہمیں رونے پیٹنے کے جلوس پر قیمتی وقت، طیّب مال اور جسمانی توانائی صرف کرنے کے بجائے فلسفۂ شہادت حسین رضی اللہ عنہ اور اس کے اہم اور مفید نکات کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے، کیونکہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی عقیدت و محبت کی یہی علامت ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کے مشن اور کاز کو زندہ رکھا جائے، اور آپ کی تعلیمات و اسباق کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ اور اگر یہ کوشش کی جائے تو یہ کوئی زیادہ مشکل نہیں۔ بہت سے لوگوں نے ان خود ساختہ باتوں کو چھوڑ بھی دیا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ توفیق ارزانی عطا فرمائے۔ (آمین)

باب : 8

فلسفۂ شہادت حسین رضی اللہ عنہ

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت اپنے اندر گہرا فلسفہ رکھتی ہے، چونکہ ہمارے خیال میں یہی فلسفہ اُن کی سیرت اور شہادت کا لب لباب، خلاصہ اور نچوڑ ہے، اس لیے اس کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔

یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ شہادت نہایت اونچا منصب ہے، قرآن حکیم کے بموجب شہید مردہ نہیں زندہ ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ

''اور جو اللہ کے راستے میں قتل کر دیے جائیں انھیں مردہ نہ کہو۔''[1]

دوسری جگہ فرمایا:

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا

''اور اللہ کی راہ میں جان دینے والوں کو مردہ گمان (بھی) نہ کرو۔''[2]

اس میں نکتہ یہ ہے کہ شہید کو مردہ کہنے سے حوصلے پست ہوتے ہیں بزدلی فروغ پاتی ہے اور جذبہ جہاد کو دھچکا لگتا ہے، اور شہید کو زندہ کہنے اور سمجھنے سے غم ہوتا ہے نہ صدمہ، بلکہ حوصلے بلند ہوتے اور جذبہ جہاد پروان چڑھتا ہے۔ اور اسلام بھی یہی چاہتا ہے کہ لوگوں کے دلوں میں جذبہ جہاد پیدا کیا جائے، اور اس میں شبہ نہیں کہ جہاد کی

---

① البقرۃ 154:2. ② آل عمران 169:3.

بدولت ہر طرح کی عزت وعظمت نصیب ہوتی ہے، دشمن پر رعب طاری ہوتا ہے، قوم کو غلامی سے نجات ملتی ہے۔ نئی نسل پُر جوش، بلند اخلاق، قرآن وسنت کی شائق، جری، دلیر، نڈر، چاق و چوبند، اولوالعزم اور بہادر بنتی ہے، اسلام پھیلتا پھولتا، اور اسلامی حکومت وسیع ہوتی ہے اور مسلمانوں کی دنیائے کفر پر دھاک بیٹھتی ہے۔ اس پر ہمارا ماضی اور بدر وحنین کے معرکے، میدان قتال کے رزمیہ کارنامے اور مجاہدین وشہدائے اسلام کے روح پرور اور ایمان افروز واقعات شاہد ہیں۔

اب آپ خود غور فرمائیے کہ جس قوم کے ہاں زور وشور سے رونے پیٹنے کا عمل جاری ہو، گریہ ہی گریہ ہو، اپنی چھریوں سے اپنی پیٹھ ادھیڑی جا رہی ہو۔ مکّوں سے اپنا ہی سینہ کوٹا، اور دو ہتڑوں سے منہ سرخ اور سر کے بال نوچے جا رہے ہوں کیا وہ قوم جذبہ جہاد برقرار رکھ سکتی ہے؟ اور مجاہدانہ سرگرمیوں میں حصہ لے سکتی ہے؟ بالکل نہیں، کبھی نہیں۔ جس قوم کے ابھی پچھلے شہیدوں کے آنسو خشک نہ ہوئے ہوں وہ نئے شہیدوں کے ''صدمات'' کیونکر برداشت کر سکتی ہے؟ ایسے لوگ تو شہادت کے تصوّر ہی سے کان پر ہاتھ رکھیں گے۔

ہمیں چاہیے کہ ہم شہادت حسین رضی اللہ عنہ پر رونے پیٹنے کے بجائے فلسفہ شہادت حسین رضی اللہ عنہ پر غور کریں، اور آپ رضی اللہ عنہ کی شہادت سے جو اسباق ملتے ہیں انھیں پیش نظر رکھیں اور انھیں اہتمام کے ساتھ بتانے، سنانے اور اپنانے کی کوشش کریں۔ ہم ایسے سب دوستوں کو یہی ہمدردانہ ومخلصانہ مشورہ دیں گے کہ اللہ کے لیے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے مشن کو سمجھیں کہ وہ کیا تھا اور اسے عام کریں اور اتنا عام کریں کہ جس قدر ضرورت ہے۔ ورنہ سال میں ایک دو دفعہ رونے رُلانے سے نہ ہمیں کچھ حاصل ہو سکتا ہے، نہ روح حسین رضی اللہ عنہ کو سکون بہم پہنچ سکتا ہے۔

اب ذیل میں ہم فلسفہ شہادت حسین رضی اللہ عنہ پر اختصار وجامعیت سے روشنی ڈالتے ہیں، کیونکہ یہی وہ نکتہ حقیقت طراز ہے جسے پیش نظر رکھنے اور اپنانے کی بدولت ہماری

زندگی میں انقلاب آ سکتا ہے۔ اب فلسفہ شہادت حسین رضی اللہ عنہ ملاحظہ فرمائیے۔

1 آغاز قربانی انجام قربانی

ہمارا اسلامی سال اگر حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی پر ختم ہوتا ہے تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت سے شروع ہوتا ہے، جو ہمیں سرفروشی و جاں سپاری کا سبق دیتا ہے۔ مطلب یہ کہ ہمارا آغاز بھی شہادت اور ہمارا انجام بھی شہادت ہے۔ یہ شرف اور کسی قوم کو نصیب نہیں ہے۔ یہ ہمارا آغاز وانجام بتا رہا ہے کہ ہم کسی وقت بھی نقد جسم و جان پیش کرنے سے گریز نہیں کرتے نہ کر سکتے ہیں۔ بحیثیت مسلمان ہم نذرانۂ جان پیش کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔

اللہ ہمیں اپنا سالِ نَو رزمیہ اور مجاہدانہ کارناموں سے شروع کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ یہی انداز مسلمانوں کے شایانِ شان اور ان کی فخریہ روایات کے مطابق ہے۔ مہربانی کر کے اپنا نیا سال رونے پیٹنے سے شروع نہ کریں۔ یوں شروع کریں کہ دل میں جذبہ جہاد انگڑائیاں لے رہا ہو۔ خلیفہ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی یکم محرّم کو مرتبۂ شہادت سے سرفراز ہوئے۔ اللہ کرے ہم ادھر بھی کچھ غور کریں۔

2 آزادئ رائے

اگر ہماری آزادانہ رائے اکثریت کے خلاف ہو تو جرأت کے ساتھ اس کا اظہار کریں، کسی بھی قوت و طاقت سے ہرگز مرعوب نہ ہوں۔

دیکھیے! حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو حکومت وقت سے اختلاف تھا، گورنر کوفہ ابن زیاد نے آپ رضی اللہ عنہ سے اپنے ہاتھ پر یزید کے لیے بیعت لینے پر اصرار کیا اور اپنے دربار میں حاضر ہونے کے احکامات جاری کیے، آپ رضی اللہ عنہ کو دھمکیاں اور ڈراوے دیے، مگر آپ رضی اللہ عنہ مطلق خوفزدہ نہ ہوئے اور اپنی رائے پر برابر قائم رہے، کربلا پہنچ کر ابنِ زیاد

اور شمر جیسے درندہ خصلت حکمرانوں کے سامنے بھی نہ جھکے، نہ دبے، نہ ہراساں ہوئے۔ اور باوجود نہتے ہونے کے دشمن کے ٹڈی دل لشکر سے ٹکرا گئے۔

3 درس وفا

ہمیں چاہیے کہ اہل کوفہ کی بے وفائی سے عبرت حاصل کریں۔ انھوں نے سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو خود بُلایا، مگر مشکل وقت آنے اور ضرورت پڑنے پر کسی کام نہ آئے۔ ہمیں کوفیوں سے یہ درس عبرت لینا چاہیے کہ ہم اپنے مخلص و محسن لوگوں کو پہچانیں۔ ان کا ساتھ دیں اور کسی صورت ان سے دغا نہ کریں۔ اور صحیح مخلص وہ ہوتے ہیں جو اپنا خیال نہ کریں بلکہ قائدین اور مخلصین کا خیال کریں۔ اپنے آپ کو نہ بھریں یعنی اپنی ضروریات سے پہلے ان کی ضروریات کا خیال رکھیں۔ سانحہ کربلا سے ہمیں یہ سبق لینا چاہیے کہ اپنے مخلصین اور محسنین کے ساتھ کسی صورت میں بے وفائی اور دغا بازی کا برتاؤ روا نہ رکھیں۔ اور کم از کم درجہ یہ ہے کہ مخلصین و محسنین کو پہچانیں۔ اور ان سے کوئی فریب نہ کریں۔

ہمیں صحابہ و اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم کی وفا داری کے واقعات اپنے سامنے رکھنے چاہئیں کہ انھوں نے کس طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے وفا کی تھی۔ اور درحقیقت ہمارے سچے مخلص و محسن ہیں بھی وہی لوگ۔ یا ان کے سچے پیروکار۔ جنھوں نے ہمیں دین اور دنیا دونوں کا رستہ دکھایا۔ اور اپنے قول و عمل سے ایثار و وفا کی ناقابل فراموش داستانیں رقم کیں۔

4 نفاق کی تباہ خیزیاں

ہم جب کسی شیخ کو امامت، امارت اور سیادت سپرد کریں تو سوچ سمجھ کر سپرد کریں، مگر جب کسی کو یہ منصب سونپ دیں تو پھر اس پر اعتماد کرنا سیکھیں۔ آئے دن اس سے الجھنا اور برسر پیکار رہنا شریفانہ شیوہ نہیں۔ جن لوگوں نے سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو

شہید کیا، ان میں سے اکثر آپ رضی اللہ عنہ کی اقتداء میں نماز ادا کر چکے تھے۔ اور آپ رضی اللہ عنہ کی عظمت کے قائل تھے، حسب ونسب، علم وتقویٰ ہر چیز میں آپ رضی اللہ عنہ کو افضل و بہتر مانتے تھے، مگر اس کے باوجود انھوں نے آپ رضی اللہ عنہ سے لڑائی کی، حالانکہ یہ ہرگز ان کے لائق نہ تھا۔ جو لوگ کسی شخص کو اپنا امیر یا امام بنا کر اس کی امارت و امامت قولاً یا عملاً نہیں مانتے سمجھ لیجیے وہ نفاق میں گرفتار ہیں۔ انھیں نفاق کی لعنت سے کوسوں دور رہنا چاہیے۔ تاریخ کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس طرح کرنے سے ملّی شیرازہ منتشر اور اتحاد و تنظیم کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ منافق ذہن قوم کبھی بکھیڑوں سے نہیں نکل سکتی۔

5 نوشتۂ تقدیر

تقدیر، تدبیر پر غالب آ کے رہتی ہے۔ تقدیر ارکان ایمان میں سے ہے اور یہ برحق ہے۔ اہل اسلام کو تقدیر پر پورا ایمان رکھنا چاہیے اس سے کبھی صرف نظر نہیں کرنا چاہیے۔

دیکھ لیجیے حضرت حسین رضی اللہ عنہ جب عازم کوفہ ہوئے، تو سب آپ رضی اللہ عنہ کو روکتے تھے، مگر آپ نہ رُکے، مگر اثنائے سفر جب آپ رضی اللہ عنہ واپس جانا چاہتے تھے تو لشکر ابنِ زیاد نے رکاوٹ ڈال دی کہ آپ واپس نہیں جا سکتے۔ کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں یہ سب کچھ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے جان بوجھ کر کیا تھا؟ دوستو! یہاں بھی تقدیر کا عمل دخل تھا۔ مگر قسمت کا لکھا کون مٹا سکتا ہے؟ اسی کو کہتے ہیں: ''نوشتۂ تقدیر'' اور یہ بدل نہیں سکتا۔ سچ کہا کسی نے:

؎ ہوتا وہی ہے جو منظور خدا ہوتا ہے

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾

”اور اللہ رب العالمین کے چاہے بغیر تم کچھ بھی نہیں چاہ سکتے۔“[1]

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾

”اور اللہ اپنے (ہر) کام پر غالب ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔“[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مشہور قول ہے:

«عَرَفْتُ رَبِّي بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ»

”جو گا ہے میرے مضبوط ارادے تکمیل کو نہیں پہنچتے اور راستے ہی میں ٹوٹ پھوٹ کر چکنا چور ہو جاتے ہیں اس بات سے میں نے رب کو پہچانا ہے۔“

علامہ اقبال رحمہ اللہ نے مذکورہ ارشادات کی روشنی ہی میں کہا ہے ع

بزور بازوئے تقدیر، تدبیریں نہیں چلتیں

بیشک تقدیر کے سامنے بڑے بڑے طاقتور، دانشور اور ارباب اختیار و اقتدار بے بس ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ٹھیک یہی کچھ ہوا عالی مقام حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ۔ یہ بات ہرگز نہ بھولئے اور اسے پلّے باندھ لیجئے کہ ہر بات پر سو فیصد پوری طرح قدرت رکھنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے اور کوئی نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ جو لکھ دے اسے کوئی بدل نہیں سکتا۔

6 علم غیب اللہ کا خاصہ ہے

چھٹا سبق یہ ہے کہ پیش آنے والے حالات اور غیب کی باتوں کو اللہ رب العالمین کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ ان بدلتے ہوئے حالات کا یقیناً حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو علم نہ تھا۔ اگر آپ رضی اللہ عنہ کو پہلے علم ہو جاتا تو آپ رضی اللہ عنہ ہرگز آگے قدم نہ اٹھاتے، بلکہ حضرت

[1] التکویر 81: 29. [2] یوسف 12: 21.

مسلم بن عقیل ہی کو روانہ نہ فرماتے، کیونکہ آپ رضی اللہ عنہ اپنے آپ کو اور اپنے کسی عزیز کو جان بوجھ کر موت کے منہ میں دھکیلنا نہیں چاہتے تھے۔ یقیناً آپ رضی اللہ عنہ وقت سے قبل ان دلخراش اور افسوسناک حالات و واقعات پر مطلع نہ تھے۔ یہ عقیدہ رکھنا کہ امام یا ولی، عالم ما کان و ما یکون ہوتا ہے درست نہیں۔ یہ عقیدہ سراسر قرآن کے خلاف ہے۔ قرآن حکیم نے اعلان کرتے ہوئے حضرت خاتم النبیین ﷺ کی زبان سے کہلوایا ہے:

﴿ قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ﴾

''اے محمد ﷺ! کہہ دیجیے کہ آسمان و زمین کا غیب اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔''①

یقین جان لو امام یا کوئی ولی، بزرگ، عالم بلکہ کوئی نبی گزشتہ اور آئندہ حالات کو نہیں جانتا۔ اللہ معجزہ یا کرامت کے طور پر اگر کسی کو تھوڑا بہت آگاہ فرما دے، کوئی اشارہ دے دے تو الگ بات ہے۔ لیکن اس کے لیے بھی قرآن و حدیث سے واضح دلیل درکار ہے۔ عالم «ماکان وما یکون» وہ ہوتا ہے جس سے کسی بھی وقت کوئی بات پوشیدہ نہیں ہوتی۔ اس شان کی حامل صرف ذات باری تعالیٰ ہے اور کوئی نہیں۔

7 قیادت کوئی پھولوں کی سیج نہیں

سانحہ کربلا کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ایک لیڈر، قائد اور رہنما کو کبھی مجبوراً اپنی رائے کے خلاف اپنے پیروکاروں کی رائے پر عمل کرنا پڑ جاتا ہے۔ قیادت جہاں اپنے پہلو میں منافع رکھتی ہے، وہاں اپنی جلو میں قسم قسم کے مفاسد بھی رکھتی ہے۔ اور جہاں اطاعتِ امیر کا جذبہ کم یا کالعدم ہو وہاں قیادت ماسوائے ابتلاء اور فتنہ سامانی کے کچھ بھی نہیں، ایسی صورت میں اس سے یکسر احتراز کرنا چاہیے۔

① النمل 65:27.

مسلم بن عقیل کی شہادت کی خبر سن کر حضرت حسین رضی اللہ عنہ واپس جانا چاہتے تھے، مگر حضرت مسلم بن عقیل کے اعزہ رکاوٹ بن گئے۔ اس وقت حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو مجبوراً اور بادلِ نخواستہ آگے بڑھنا پڑا، کیونکہ آپ رضی اللہ عنہ نے اپنے ایثار پیشہ ساتھیوں کے جذبات کا احترام بجالانا ضروری سمجھا۔

8 تکلیف پر صبر کیجئے

انسان کو اگر کوئی رنج، دکھ، تکلیف یا صدمہ پہنچے تو اس پر صبر سے کام لینا چاہیے، صبر آزما اور کٹھن مرحلے پر صبر کرنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی عظیم ترین سنت ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے کربلا میں جس صبر وسکون کا مظاہرہ کیا وہ صفحاتِ تاریخ میں ہمیشہ رقم رہے گا، آپ رضی اللہ عنہ کے کمال صبر کا ذکر کرتے ہوئے شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی نے کہا ہے ؎

جو دہکتی آگ کے شعلوں پہ سویا وہ حسین رضی اللہ عنہ
جس نے اپنے خون سے عالم کو دھویا وہ حسین رضی اللہ عنہ
جو جواں بیٹے کی میّت پر نہ رویا وہ حسین رضی اللہ عنہ
جس نے سب کچھ کھو کے کچھ نہ کھویا وہ حسین رضی اللہ عنہ

اور سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے جب ہمشیرہ زینب کو پریشان حال دیکھا تو فرمایا: ''اے بہن! میں تمھیں قسم دے کر کہتا ہوں: میری جدائی پر صبر کرنا، ہرگز نہ رونا پیٹنا، نہ بال نوچنا، نہ گریبان چاک کرنا، تم سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی بیٹی ہو، جیسے انھوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر صبر کیا تھا، تم میری شہادت پر صبر کرنا۔''[1]

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے سوائے اللہ کے کسی فرد سے داد فریاد کی نہ استغاثہ و استعانت، اور جب کوئی شہید ہوتا تو آپ رضی اللہ عنہ بمطابق حکم قرآنی صرف ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ

[1] جلاء العیون مترجم، ص: 382.

اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿ پڑھتے۔

کیا آج ہم حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی اس مقدس سنت (صبر) پر عمل کرنے کے لیے تیار ہیں؟

اور جس طرح حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے صبر سے کام لیا، کیا اسی طرح ہم بھی صبر سے کام لینے کی کوشش کریں گے؟...... یہ کام ہے تو مشکل مگر جنہیں اللہ نے توفیق بخشی ہو ان کے لیے کوئی مشکل نہیں۔ صبر کی اہمیت کا اس بات سے اندازہ لگائیے کہ قرآن مجید میں اس کا تقریباً سو بار تذکرہ آیا ہے اور یہ احکام کسی دوسری قوم کے لیے نہیں، ہمارے لیے ہیں۔ کیا ہمارے دوست اس مسئلے پر کوئی توجہ فرمائیں گے؟

9 عقیدۂ توحید کی اہمیت

شہادتِ حسین رضی اللہ عنہ ہمیں سب سے بڑا اور مرکزی سبق توحید باری تعالیٰ کا دیتی ہے کہ حاجت روا اور مشکل کشا صرف ایک اللہ ہے۔ اس کے سوا کوئی نہیں۔ اور لگتا ہے کہ کربلا کا بنیادی فلسفہ اور مرکزی نکتہ ہے بھی یہی۔ اور شاید اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ کے تحت یہ حادثہ رونما بھی اسی لیے ہوا کہ ساری دنیا جان لے کہ اگر رب تعالیٰ کسی کو تکلیف پہنچانا چاہے تو اسے کوئی دور نہیں کر سکتا۔ اور اگر وہ تکلیف دور کرنا چاہے تو کوئی پہنچا نہیں سکتا۔ یہ قرآن مجید کا فیصلہ ہے جو آگے آ رہا ہے۔ جہاں تک ہم نے غور کیا ہے سانحہ کربلا کا سب سے بڑا مقصد توحید خالص کو اجاگر کرنا ہے کہ سوائے ذاتِ احد و صمد کے کوئی حاجت پوری کر سکتا ہے نہ مشکل دور کر سکتا ہے۔ تمام انبیاء علیہم السلام کی مشترک اور پُر زور دعوت مسئلہ توحید ہی تھی۔

دیکھ لیجیے میدانِ کربلا میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ دشمن کے لشکر میں پھنس چکے تھے۔ اور ایسے پھنسے کہ بسیار کوشش کے باوجود نکل نہ سکے۔ اور پھر آپ رضی اللہ عنہ اور آپ کے قافلے

پر وہ وہ مظالم توڑے گئے کہ جن کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، لیکن اس مشکل سے دوسروں کو رہائی دلانا تو رہا الگ، آپ رضی اللہ عنہ خود اپنی ذات کو نہ بچا سکے۔ یہ جو کچھ ہم عرض کر رہے ہیں یہ نہ اتہام ہے نہ جھوٹ، نہ تنقیص ہے نہ بے ادبی۔ یقین جان لو یہ حقیقت ہے مہرِ نیم روز کی سی حقیقت۔ بلکہ یہ توحید باری تعالیٰ کی روشن دلیل ہے۔ جسے کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔ اور یہ عقیدہ ہمیں قرآن وسنت سے ملا۔ اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ یا حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا یا حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کی توہین ہے نہ ان کی عظمت وفضیلت کی نفی۔ دراصل یہ فرق مراتب ہے جو سمجھنا ضروری ہے۔

مشہور فارسی مقولہ ہے ''گر فرقِ مراتب نہ کنی زندیقی'' یعنی اگر تم مراتب میں فرق نہ کرو گے تو زِندیق ہو جاؤ گے۔ برادران اسلام! براہ کرم غور فرمایئے! ایک خالق کا مرتبہ ہے ایک مخلوق کا۔ مخلوق خواہ کتنی بزرگ و برتر ہو اللہ تعالیٰ کا مرتبہ اور خصوصیات حاصل نہیں کر سکتی۔ مختصر یہ کہ اللہ اللہ ہے، نبی نبی، صحابی صحابی اور امام امام۔ ہر ایک کا اپنا اپنا مرتبہ ہے۔ مسئلہ توحید کا خلاصہ اور ما حاصل یہی ہے۔

آیئے! ذرا حقائق کی دنیا میں قدم رکھئے، اور دیکھئے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جنھیں بعض لوگ ''مشکل کشا'' کہتے ہیں خود اپنے لختِ جگر حسین رضی اللہ عنہ کی مشکل دُور نہ فرما سکے، اور حضرت سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم جنھیں بعض حلقوں میں ''مختارِ کل'' اور ''حاجت روا'' کہا جاتا ہے، اپنے نواسے کی حاجت روائی نہ فرما سکے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور علی رضی اللہ عنہ اپنے محبوب ترین لختِ جگر کی مدد کو نہ پہنچ سکے تو سیدہ فاطمۃ الزّہراء رضی اللہ عنہا کا نمبر تو بعد کا ہے، وہ کیونکر مدد کے لیے آ سکتی تھیں؟

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا ننھا منا لختِ جگر علی اصغر پانی کی بوند کے لیے تڑپتا ہے۔ اور بڑا جگر پارہ علی اکبر آپ رضی اللہ عنہ کی آنکھوں کے سامنے ٹھنڈا ہو جاتا ہے، مگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ جنھیں ''یا حسین رضی اللہ عنہ، یا حسین رضی اللہ عنہ'' کہہ کر مدد کے لیے بلایا جاتا ہے، نہ

ننھے علی اصغر کو پانی پلا سکے، نہ نوجوان علی اکبر کی جان بچا سکے۔ غور فرمائیے کہ جب یہ مذکورہ عظیم الشان ہستیاں اپنے پارہ ہائے جگر کے لیے حاجت روا اور مشکل کشا نہیں بن سکیں تو دوسروں کے لیے کیونکر بن سکتی ہیں؟ اور دوسرا کوئی کیونکر مشکل کشا ہو سکتا ہے؟ ہر ایک کی بیک وقت دور و نزدیک سے فریاد سننا اور حاجت روائی و مشکل کشائی کرنا اللہ تعالیٰ ہی کا کام ہے اور کسی کا نہیں۔ اسی کو توحید کہتے ہیں۔ حاصل کلام یہ ہے کہ یہ الٰہی منصب ہے اور اس الٰہی منصب پر رب تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں بیٹھ سکتا۔ یہی نچوڑ ہے عقیدۂ توحید کا۔ اگر یہ عقیدہ محفوظ نہیں تو سمجھ لو کچھ بھی محفوظ نہیں۔ توحید کے بغیر آدمی کا ہر عمل نا قابل قبول ہے۔ حقیقت وہی ہے، جسے قرآن مجید نے واضح اور دو ٹوک الفاظ میں فرما دیا، ارشاد ہے:

﴿ وَإِنْ يَمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ ﴾

''اے مخاطب! اگر اللہ تعالیٰ تجھے کسی مصیبت سے دو چار کرے تو اس کے سوا کوئی تیری تکلیف دُور نہیں کر سکتا۔''[1]

اب کہیے کہ مشکل کشا اور حاجت روا کون ہوا؟ پنجتن پاک یا خالق ارض و سماء؟ یقیناً اللہ تعالیٰ ہی اس شان کا حامل ہے، لہٰذا سب مسلمانوں کو اپنی ہر مصیبت اور ہر تکلیف کے وقت اُسی ذات واحد کو پکارنا چاہیے۔ مافوق الاسباب طور پر نہ کوئی کسی کی پکار سنتا ہے نہ مدد کو پہنچتا ہے۔ تو خوب جان لیجیے کہ یہ خاصۂ خداوندی ہے۔ اس خاصے میں اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک و سہیم نہیں۔ وہ تنہا یہ کام کر رہا ہے۔ اسی عقیدے کو توحید کہتے ہیں۔ اور یہ خالص ہونی چاہیے۔ یاد رکھیے! اگر اس عقیدہ توحید میں ملاوٹ ہو گئی تو سارا کام خراب ہو جائے گا۔ مگر مقام افسوس و تعجب ہے کہ ہمارے ہاں کچھ دوست حضرت علی و حضرت حسین رضی اللہ عنہما ہی کو نہیں بلکہ ہر سفید گھوڑے، (گھوڑا بیشک حضرت

---

[1] یونس 10: 107.

حسین رضی اللہ عنہ کا ہو وہ بھی مشکل کشا نہیں) علم، تعزیے اور اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے مقبرے تک کو دافع البلاء اور قاضی الحاجات سمجھتے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ ۔ اللہ تعالیٰ ہمیں نکتۂ توحید سمجھنے اور الٰہی صفات میں دوسروں کو شریک کرنے سے باز رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

توحید ہی اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے اس پر کسی صورت آنچ نہیں آنی چاہیے۔ اب یہ فیصلہ آپ نے کرنا ہے کہ باپ دادا اور مولویوں اور پیروں فقیروں کے بتلائے ہوئے عقیدہ و مسلک کو اختیار کرنا ہے یا اللہ اور اس کے محبوب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کردہ عقیدے اور طریقے کو اپنانا ہے؟ سانحہ کربلا کا سب سے بڑا سبق یہی نکتۂ توحید ہے۔ مگر افسوس، قطع نظر شیعہ سنّی کے اس مسئلہ سے ہم من حیث القوم غافل اور بڑی حد تک بے خبر ہیں۔ کیونکہ اس انداز سے کوئی سمجھاتا ہے نہ سمجھتا ہے، نہ روشنی ڈالتا ہے اور نہ کوئی روشنی لیتا ہے۔

10 جرأت و شجاعت کا لافانی سبق

واقعہ شہادتِ حسین رضی اللہ عنہ ہمیں بتاتا ہے کہ ممکن حد تک لڑائی سے احتیاط کرنی چاہیے، مگر جب جنگ مسلط کر دی جائے اور لڑائی ناگزیر ہو جائے، تو پھر بہادری سے لڑائی کرنی چاہیے۔ اس وقت خوفزدہ ہونا روا نہیں۔ بیشک حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے مجبوری کے عالم میں جنگ کی، مگر جب دشمن مقابلے میں آ گیا تو پھر نہایت جرأت و استقامت اور شجاعت و بسالت سے آگے بڑھے۔ شاعر اسلام حفیظ جالندھری نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے اس رزمیہ کارنامے پر یوں روشنی ڈالی ہے ؎

لباس ہے پھٹا ہوا غبار میں اَٹا ہوا
تمام جسم نازنیں چھدا ہوا، کٹا ہوا

یہ کون ذی وقار ہے؟ بلا کا شہسوار ہے
کہ ہے ہزاروں قاتلوں کے سامنے ڈٹا ہوا
یہ بالیقیں حسینؓ ہے نبیؐ کا نورِ عین ہے
اُدھر سپاہ شام ہے ہزار انتظام ہے
اُدھر ہیں دشمنانِ دیں ادھر فقط امام ہے
یہ بالیقیں حسینؓ ہے نبیؐ کا نور عین ہے
مگر عجیب شان ہے، غضب کی آن بان ہے
کہ جس طرف اٹھی ہے تیغ بس خدا کا نام ہے

مختصر یہ کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے ہمیں جرأت وشجاعت کا لافانی سبق دیا۔ اور بتایا کہ حالات کیسے ہی ابتر اور خوفناک ہوں دشمن کے مقابلے میں کمزوری اور بزدلی ہرگز نہیں دکھانی چاہیے۔

11 نیکی وشرافت کی عظمت

نیکی اور شرافت، زندہ پائندہ رہتی ہے۔ دیکھ لیجئے! آج ہر کوئی عالی مقام حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے خانوادے کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ اور اس کے بخلاف ابنِ زیاد، ابن سعد، شمر وغیرہم اور کوفہ کے جفا کاروں اور قاتلوں پر پھٹکار بھیجتا ہے۔ بلکہ یزید بھی جس کے دور حکومت میں یہ سانحہ ہوا لوگوں کی ملامت، طعن وتشنیع اور گالی گلوچ سے نہ بچ سکا۔

کسی بھی بات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی پوری تفصیل پڑھی جائے، اگر تقریر ہو تو پوری تقریر سنی جائے اگر زیر مطالعہ کوئی مضمون یا کتاب ہو تو اس کا اول تا آخر بے لاگ مطالعہ کیا جائے۔

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ اگر آدمی کی نیت کسی بھی امر واقعہ کو سمجھنے کی ہو تو بات سمجھ میں آ جاتی ہے اور اس کے برعکس اگر نیت میں فرق یا فتور ہو یا اپنے آبائی عقیدے پر جما ہوا ہو اور اللہ اور اس کے رسول سے بے نیاز ہو چکا ہو تو پھر کسی کی بھی بات سُن سکتا ہے نہ سمجھ سکتا ہے اور اگر نہ ہو تو پھر بھی بات نہیں سمجھی جا سکتی۔ اسی طرح ضد، تعصب، نفرت یا شخصیت پرستی کسی آدمی کو اصلی صورتحال سمجھنے نہیں دیتیں۔ دلائل کی رُو سے ہر ایک کو اختلاف کا حق حاصل ہے۔ ہم نے یہ جو بیان کیا ہے یہ ہماری آزادانہ تحقیق ہے۔ پھر بھی اگر کسی کو از رُوئے دلیل ہماری رائے سے اختلاف ہو تو ہمارا کسی سے کوئی گلہ نہیں۔ حجت و برہان کی روشنی میں ہر کسی کو اختلاف کا حق حاصل ہے۔ ذاتی طور پر ہم یزید کے وکیل ہیں نہ حمایتی۔ نہ عقیدت مند ہیں نہ ثنا گو، کتاب سے اقتباسات لے کر خواہ مخواہ پروپیگنڈہ کرنا روا نہیں۔ گذارش ہے، عجلت سے ہرگز کام نہ لیں۔ اور پوری کتاب ایک دفعہ پڑھ کر کوئی رائے قائم فرمائیں۔

اس وقت ہم بتلا رہے ہیں کہ چونکہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پاس نیکی و شرافت تھی۔ اور کسی کے کردار کی یہ بہت بڑی خوبی ہے۔ اسی لیے اپنے پرائے سب آپ کی تعریف میں رطب اللّسان ہیں اور آپ رضی اللہ عنہ کی عظمت کو سلام بھیجتے ہیں۔ شاید ہی دنیا کا کوئی شہر، قصبہ، یا دیہات ہو جس میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے لیے پاکیزہ جذبہ موجود نہ ہو۔ اور آپ رضی اللہ عنہ کے پیارے اور باعظمت نام مبارک کا استعمال نہ ہوا ہو۔ بعض نے شروع میں پاک نام محمد لگا لیا ہے اور بعض نے آخر میں احمد یا محمد یا علی لگا لیا۔ آپ رضی اللہ عنہ کا نام مبارک سب کو پسند ہے۔ اور یہ حقیقت میں آپ رضی اللہ عنہ کی عظمت پر دال ہے۔ آپ کی شرافت زندہ و پائندہ ہے۔ یہ اسی کی برکت ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کا اسم گرامی 14 سو برس سے جگمگا رہا ہے۔ اور تا نورِ نیّرین جگمگا تا رہے گا۔

12 نماز کی اہمیت وضرورت

واقعہ شہادتِ حسین رضی اللہ عنہ ہمیں باقاعدہ اور بروقت نماز ادا کرنے کی تعلیم دیتا ہے، حضرت حسین رضی اللہ عنہ جہاں اور جس حال میں بھی رہے اہتمام سے نماز ادا کرتے رہے۔ بلکہ لڑائی میں بھی فریضۂ نماز ترک نہیں کیا، کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

دیکھو وہ امام تشنہ لب، کیسا تھا عاشقِ نماز
خنجر ہے حلق پر رواں، اور سر جھکا ہے نماز میں

ادائیگی نماز حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی بہت مضبوط اور عظیم سنت ہے کہ جسے آپ رضی اللہ عنہ نے کسی حال میں بھی تا آنکہ جنگ میں بھی ترک نہیں فرمایا، مگر جائے افسوس ہے کہ آج ہمارے عام کلمہ گو اور شیعی علماء، ذاکرین اور مرثیہ خواں دوست نماز کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ یاد رکھیے! بے نماز کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اہلِ بیت رضی اللہ عنہم سے کوئی تعلق نہیں، اگر وہ ان سے محبت کا دم بھرتا ہے تو اسے شہادت حسین رضی اللہ عنہ کا یہ فلسفہ پڑھتے ہی بلا تاخیر یعنی آج ہی سے نماز شروع کر دینی چاہیے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ہمیں اس اسوۂ حسینی پر بھی چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

نماز میں سنی بھی سستی کرتے ہیں مگر شیعہ تو قریب قریب اس عبادت سے محروم ہیں۔ ویسے بھی ان کے ہاں نماز کا شمار ارکان اسلام میں نہیں ہوتا۔ مگر یہ ان کی غلطی ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کو اسلام کا اہم رکن قرار دیا ہے۔

13 مشورہ کی اہمیت

اس واقعہ سے ہمیں یہ سبق بھی ملا کہ ہمیں اہم اور بڑے امور میں اپنے احباء واعزہ سے ضرور مشورہ کر لینا چاہیے۔ اور اصحاب رائے کے مشورے کو اہمیت دینی چاہیے، اس سے بیش قیمت اور سود مند نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اور زیادہ دماغ ہوں تو پیش

آمدہ مسئلے کا بہتر حل نکل آتا ہے۔ بیشک بات اپنی مانیں اور منوائیں مگر امور مہمہ میں مشورہ لینے میں بڑے فوائد مضمر ہیں۔ اپنے آپ کو ان سے محروم نہ کریں۔ کئی مرتبہ بڑے بڑے اچھے گوشے سامنے آجاتے ہیں کہ آدمی ان کی بنا پر اپنی رائے میں نظر ثانی کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے، بڑے بڑے نقصانات سے بچ جاتا اور گوناں گوں فوائد حاصل کر لیتا ہے۔ تاریخ عالم، تاریخ اسلام، اور عام تجربات و مشاہدات میں بلکہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور سیرت خلفائے راشدین اور آثار صحابہ و ائمہ رضی اللہ عنہم میں مشورے کے مفید و نتیجہ خیز ہونے کے کثیر واقعات موجود ہیں۔

کاش! حضرت حسین رضی اللہ عنہ سفر کوفہ میں نکلنے اور اپنا عزم بالجزم کرنے سے قبل اجلّہ رفقاء اور قابل ذکر احباب سے مشورہ لے لیتے، اور جن ساتھیوں نے آپ رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا تھا ان کے مشورے کو اہمیت دیتے۔ ایسی صورت میں عین ممکن تھا کہ تاریخ میں حادثہ کربلا نام کا کوئی سانحہ ہی نہ ہوتا۔ یہ الگ بات ہے کہ سب کچھ اللہ کے علم اور تقدیر میں پہلے سے تھا۔ اور اس کی حکمت اور فلسفہ بھی اسے معلوم ہے۔ جو ہمیں معلوم ہوسکا وہ ہم بیان کررہے ہیں۔ بیشک تقدیر کا علم اللہ کو ہے مگر ہمیں شرعی احکام کا خاص خیال رکھنے کا حکم ہے۔ مَانَدِمَ مَنِ اسْتَشَارَ ''جس نے اپنے کام میں مشورہ لیا وہ پشیمان نہیں ہوتا۔'' کتنا مبنی بر حکمت جملہ ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے بزرگ و برتر کون ہوسکتا ہے، اللہ تعالیٰ ان سے فرماتا ہے:

﴿ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ﴾

''اور اپنے ساتھیوں سے مشورہ لے لیا کریں۔''[1]

---

[1] آل عمران، 3: 159۔

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم مشورے کی اہمیت کو واضح کرنے اور امت کو سمجھانے کے لیے دیا۔ اُمید ہے ہم مشورے کی اہمیت کو پہچانیں گے۔

14 آزمودہ را آزمودن خطا است

اس عظیم سانحہ نے ہمیں ایک اور قیمتی سبق یہ دیا کہ جس کو آزمایا جاچکا ہو، اسے دوبارہ آزمانے کی ضرورت نہیں۔ اسے دوبارہ، سہ بارہ اور بار بار آزمانا نادانی ہے۔ یعنی یہ اپنے اندر فائدہ کم اور نقصان زیادہ رکھتا ہے، بلکہ اس طرح سوائے تضیع اوقات کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ حدیث مبارکہ ہے: اَلْمُؤْمِنُ مِنْ جُحْرٍ وَّاحِدٍ لَايُلْدَغُ مَرَّتَيْنِ. یعنی مؤمن جہاں سے ایک مرتبہ نقصان اٹھائے وہاں سے دوسری مرتبہ نقصان نہیں اٹھاتا۔ جس سوراخ سے سانپ یا بچھو ایک بار کاٹتا ہے دانشمند آدمی وہاں دوسری بار ہاتھ نہیں ڈالتا، اگر ڈالے گا تو پھر نقصان اٹھائے گا۔ دانشوران فارسی کا مقولہ ہے: ''آزمودہ را آزمودن خطا است'' مطلب یہ کہ جسے ایک بار آزمایا گیا ہو اسے دوبارہ آزمانا جہالت و نادانی ہے۔ جس شہتیر کو گھن لگا ہوا ہو اسے چھت کے نیچے ڈالنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔

ساری دنیا جانتی تھی کہ اہلِ کوفہ کے خمیر میں عنصر وفا کی حد سے زیادہ کمی بلکہ فقدان تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو انھوں نے دھوکا دیا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے نیچے سے مصلّٰی کھینچ کر ان کی تذلیل کی۔ مسلم بن عقیل کا ساتھ نہ دیا۔ بھلا ایسے بے وفا طوطا چشم اور مطلب پرست لوگ حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے کیونکر وفا کر سکتے تھے؟ کبھی نہیں۔ خوب کہا کسی نے ؎

بنتے ہو وفا دار، وفا کر کے دکھاؤ
کہنے کی وفا اور ہے کرنے کی وفا اور

کاش! حضرت حسین رضی اللہ عنہ کوفیوں کے داغدار ماضی کو دیکھ لیتے اور ان سے کنارہ کش رہتے، یا کم از کم عورتوں اور بچوں کو اپنے قافلے کے ساتھ لے کر نہ جاتے۔ مگر چونکہ آپ رضی اللہ عنہ خود شریف النفس، صحیح النیت اور صاف دل تھے، اس لیے آپ رضی اللہ عنہ نے انھیں بھی ایسا ہی سمجھ لیا اور ان پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کر لیا، زیادہ کرید نہ کی۔ اوّل تو ان پر اعتماد کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اگر اعتماد کرنا ہی تھا تو بہت زیادہ تحقیقِ احوال اور چھان پھٹک کی ضرورت تھی۔ اور فاصلہ دور ہونے اور بروقت اور صحیح کوائف نہ ملنے کی وجہ سے آپ رضی اللہ عنہ کو پریشانی سے دوچار ہونا پڑا۔ مختصر یہ کہ بعد والوں کو اس سانحہ سے یہ سبق تو مل ہی گیا کہ بڑے کاموں میں ضرور مشورہ کر لینا چاہیے۔ مشورے کی بدولت آدمی نقصانات سے بچ جاتا ہے۔ اور نقصانات سے بچنا بھی ایک گونہ فائدہ ہے۔

15 ظالم اور شقی آخر سزا پاتا ہے

اس واقعۂ عظیمہ نے ہمیں بتایا کہ کوئی بھی ظالم اور شقی اللہ تعالیٰ کے قہر سے نہیں بچ سکتا۔ اور اکثر وہ اُخروی عذاب سے قبل دنیوی عذاب سے بھی دوچار ہوجاتا ہے، چنانچہ قاتلین حسین رضی اللہ عنہ کو دنیا ہی میں عبرتناک سزا مل گئی۔ اس سزا کا تذکرہ ابھی آرہا ہے، سچ کہا قرآن حکیم نے:

﴿ وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ﴾

”ظالموں اور ستم رانوں سے اللہ تعالیٰ کو ہرگز بے خبر نہ سمجھے۔“[1]

قرآن و حدیث اور تاریخ اسلام میں بہت سے واقعات ملتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجرمین کو بروقت سزا دی۔ قوم نوح، قوم صالح، قوم ہود، قوم موسیٰ، فرعون، قارون، ہامان اور دیگر بہت سے متمرّدین طاغین کے حالات اس پر شاہد ہیں۔ اور تاریخوں

[1] ابراھیم 14: 42.

میں بکھرے ہوئے واقعات اس قدر ہیں کہ ان کا استقصاء (احاطہ) آسان نہیں۔

چنانچہ قدرت کے طاقتور ہاتھ نے ان اشقیاء کو دنیا ہی میں عبرتناک سزا دے کر انھیں کیفر کردار تک پہنچا دیا۔ آخرت کی سزا اس کے علاوہ ہے۔ جو اس سے کئی گنا زیادہ ہوگی۔ اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَا مِنْہُ۔

باب: 9

قاتلینِ حسین رضی اللہ عنہ کا عبرتناک انجام

ابھی آپ نے سورۂ ابراہیم میں فرمانِ الٰہی پڑھا: ''ظالم جو کچھ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کو اس سے بے خبر نہ سمجھو۔''

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ ﴾

''بیشک تیرے رب کی پکڑ بڑی سخت ہے۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے ان ظالم حکمرانوں، ان کے مشیروں اور بے وفا کوفی بھیڑیوں کو بہت جلد پکڑا۔ اور انہیں وہ سزا دی جس کے وہ مستحق تھے۔ حدیث میں آتا ہے:

«إِتَّقِ دَعْوَةَ الْمَظْلُومِ فَإِنَّهُ لَيْسَ بَيْنَ اللّٰهِ وَبَيْنَهُ حِجَابٌ»

''مظلوم کی بددعا سے بچو اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہوتا۔''[2]

مطلب یہ کہ مظلوم و بے بس کی پکار فوراً عرش تک پہنچتی ہے۔

یہ ظلم کی سزا تھی یا حضرت حسین رضی اللہ عنہ یا قافلۂ حسین رضی اللہ عنہ کے مظلوموں کی بددعا کہ قاتلین میں سے کوئی بھی اللہ کی خوفناک پکڑ سے نہ بچ سکا۔ علامہ ابنِ کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جو فتنے برپا ہوئے ان میں اکثر صحیح ہیں، آپ رضی اللہ عنہ کے قاتلوں میں سے کوئی شخص ایسا نہیں بچا جو کسی نہ کسی المناک اذیت میں

---

① البروج 12:58. ② صحيح البخاري: 2448.

مبتلا نہ ہوا ہو، بعض لوگ دردناک عذاب میں مبتلا ہو گئے، اور اکثر مجنون اور مخبوط الحواس ہو گئے۔''[1]

امام ابنِ جوزی رحمہ اللہ، امام زُہری رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں:

''قاتلین حسین رضی اللہ عنہ میں سے کوئی بھی شخص دنیا میں زندہ نہ بچ سکا۔''

امام زُہریؒ فرماتے ہیں: ''قاتلینِ حسین رضی اللہ عنہ کو دنیا ہی میں سزا مل گئی۔ کوئی قتل کیا گیا، کسی کا چہرہ کالا سیاہ ہو گیا یا مسخ ہو گیا۔''[2]

امام ابن جوزی رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے کہ ایک بوڑھا شخص قتلِ حسین رضی اللہ عنہ میں شریک تھا، وہ دفعتہً نابینا ہو گیا۔ لوگوں نے سبب پوچھا تو اس نے کہا: ''میں نے خواب میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آستین چڑھائے ہوئے ہیں۔ ہاتھ میں تلوار ہے اور آپ رضی اللہ عنہ کے سامنے چمڑے کا فرش بچھا ہوا ہے، جس پر قاتلین حسین رضی اللہ عنہ میں دس آدمیوں کی ذبح شدہ لاشیں پڑی ہیں۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ڈانٹا اور حسین رضی اللہ عنہ کے خون کی ایک سلائی میری آنکھوں میں لگا دی، میں صبح اُٹھا تو اندھا تھا۔''

امام ابنِ جوزیؒ نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ جس شخص نے حسین رضی اللہ عنہ کے سر اقدس کو اپنے گھوڑے کی گردن میں لٹکایا تھا، اس کے بعد اُسے دیکھا گیا تو اس کا منہ سیاہ کالا ہو گیا۔ لوگوں نے اس سے پوچھا کہ تم تو عرب کے حسین ترین آدمی تھے، اب تمھیں کیا ہوا؟ اس نے کہا کہ اس روز کے بعد جب میں ذرا سوتا ہوں تو دو آدمی میرے بازو تھام لیتے ہیں اور مجھے ایک دہکتی ہوئی آگ پر لے جاتے ہیں اور اس میں ڈال دیتے ہیں، جو مجھے جھلس دیتی ہے۔ چنانچہ وہ اسی عذاب میں گرفتار رہنے کے چند روز بعد مر گیا۔

امام ابنِ جوزی رحمہ اللہ نے امام سُدی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے ایک شخص کی

---

[1] البداية والنهاية: 8/203. [2] تاريخ طبري: 5/575-582، والبداية والنهاية: 8/273-278، ومجمع الزوائد: 9/196,197

دعوت کی۔ مجلس میں یہ ذکر چلا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قتل میں جو بھی شریک ہوا اس کو دُنیا میں بھی سخت سزا مل گئی۔ اس شخص نے کہا کہ بالکل غلط ہے میں خود ان کے قتل میں شریک تھا، میرا کچھ بھی نہیں بگڑا۔ یہ شخص مجلس سے اُٹھ کر گھر کو روانہ ہو گیا، جاتے ہی چراغ کی بتی درست کرتے ہوئے اس کے کپڑوں میں آگ لگ گئی اور وہیں جل بھُن کر راکھ ہو گیا۔ امام سُدّی رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں نے صبح اسے خود دیکھا تو جل کر کوئلہ ہو چکا تھا۔

اسی طرح وہ شخص جس نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر تیر پھینکا اور پانی نہیں پینے دیا، اللہ تعالیٰ نے اس پر ایسی بیماری مسلط کر دی کہ اس کی کسی بھی طرح پیاس نہ بجھتی تھی۔ وہ خواہ کتنا پانی پی جائے پیاس سے تڑپتا رہتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کا پیٹ پھٹ گیا اور وہ بری حالت میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا۔

یزید کا بیشک شہادتِ حسین رضی اللہ عنہ میں بلاواسطہ یا بالواسطہ عمل دخل نہ تھا۔ واللہ اعلم۔ جس پر ہم نے تفصیل سے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا ہے، اور ہم نے اپنی طرف سے جو درست سمجھا وہ لکھ دیا ہے۔ اور اپنے پاس سے نہیں لکھا بلکہ معتبر کتب کے حوالہ جات کی روشنی میں لکھا ہے۔ اور ہم نے یہ ساری کاوش صحابہ کرام و تابعین عظام رضوان اللہ علیہم کے علاوہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے عزیزان اور اعوان و انصار کی پوزیشن کو بچانے کے لئے بخاری شریف کی صحیح حدیث جس میں مَغْفُورٌ لھم کے الفاظ آئے ہیں اس کا خیال کیا ہے۔ اور اس سلسلے میں شارحین حدیث کے حوالہ جات دیے ہیں۔ ورنہ ہمیں ذاتی طور پر یزید سے عقیدت ہے نہ محبت۔ نہ ہمارا مقصود اس کی وکالت کرنا ہے۔ بس دلائل کی رو سے اس کے حق میں جو بات جاتی ہے وہ ہم نے قارئین کے سامنے پیش کی ہے۔ ورنہ ہماری عقیدت و محبت کا محور اللہ اور اس کے محبوب پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، یا وہ بزرگ ہیں جنھیں اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی نسبت ہے۔ ہم جملہ انبیاء و مرسلین علیہم السلام کل صحابہ، اہل بیت رضی اللہ عنہم و سادات کرام، و ائمہ و اولیائے عظام رحمہم اللہ

کو انتہائی عزت وقدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ہمیں بحمد اللہ روافض سے کوئی نسبت ہے نہ خوارج سے کوئی علاقہ اور نہ نواصب سے کوئی الحاق۔ ہمیں ان سے اختلاف ہے شدید اختلاف۔ ہمارا مسلک رب کا قرآن ہے یا سنت خیرالانام صلی اللہ علیہ وسلم۔ ہمارے نزدیک اہلسنت اور اہلحدیث ایک ہی چراغ کے دو پرتو ہیں۔ ان میں کوئی فرق ہے نہ سمجھنا چاہیے۔ اتنا ضرور ہے کہ اہلسنت اور اہلحدیث کہلانا آسان ہے مگر بننا مشکل۔ اور جس قدر ہم حدیث وسنت کے قریب آئیں گے اسی قدر ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب آئیں گے۔ اور جس قدر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب آئیں گے اسی قدر اللہ تعالیٰ کے قریب آئیں گے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قرب دراصل اللہ کا قرب ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بُعد درحقیقت اللہ سے بُعد ہے۔ یہی عقیدہ تھا ہمارے اسلاف، صحابہ، اہلبیت رضی اللہ عنہم اور ائمہ، مفسرین اور صالحین رحمہم اللہ کا۔

ہم نے ''سیرت حسین رضی اللہ عنہ مع سانحہ کربلا'' میں جو لکھا بحمد اللہ کسی خوف اور طمع سے بے نیاز ہو کر لکھا۔ اور بے لاگ لکھا۔ ہم نے جو تحریر کیا اپنی طرف سے سچ تحریر کیا۔ اس کے باوجود ہمارا ہرگز یہ دعویٰ نہیں کہ ہماری تحریر وحی الٰہی ہے، اس میں کسی کمی بیشی کا امکان نہیں۔ یہ ایک انسانی کاوش ہے اس میں خطا اور صواب کا امکان ہوسکتا ہے۔

ہر شخص کو ہماری تحریر سے اتفاق یا اختلاف کرنے کا حق ہے۔ رہی یہ بات کہ یزید کے دل میں کیا ارادہ تھا اور وہ کیا چاہتا تھا۔ یعنی اس کے اندر کیا تھا اسے پورے طور پر اللہ ہی جانتا ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ واقعۂ شہادت کے بعد اسے بھی چین نصیب نہ ہوا، اور وہ زیادہ دیر حکومت نہ کرسکا، اور جلد ہی چل بسا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے لمبا عرصہ حکومت کرنے کی مہلت نہ دی۔ شاید اس کے اور مسلمانوں کے حق میں یہی بہتر تھا۔ اللہ تعالیٰ ''الحکیم'' ہے اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔

عالی مقام حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا مرتبہ بہت اونچا اور بہت بلند ہے۔ ہم نے اس

کتاب میں جگہ جگہ اس کا تذکرہ کیا ہے اس کا مطالعہ فرمائیں۔افسوس! حکومت وقت نے صحیح طور پر انھیں سمجھا نہ پہچانا۔آپ رضی اللہ عنہ امن و صلح کے پیغام بر اور پیار و محبت کے علمبردار تھے۔آپ رضی اللہ عنہ پر کربلا میں جو ہوا ظلم ہوا۔اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ظالمین سے ایسا بدلہ لیا، جسے اہلِ دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

آیئے! ان ظالموں کے عبرتناک انجام کے بارے میں مزید تاریخی حقائق کا مطالعہ فرمایئے۔اور دشمنانِ حسین رضی اللہ عنہ کے بارے میں قدرت کی قہرمانیاں دیکھیے:

عبدالملک بن مروان کے زمانے میں تقریباً 66 ھ میں جب مختار ثقفی کوفہ کا حاکم مقرر ہوا تو اس نے ان تمام لوگوں کو چُن چُن کر قتل کیا جنھوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت میں حصہ لیا تھا۔

مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس نے ایک دن میں دوسو چالیس240 قاتلین حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کیا۔اور جنھوں نے بھاگنے کی کوشش کی انھیں گرفتار کر کے تکلیف دے دے کر مارا، عمرو بن الحجاج اور شمر ذی الجوشن بھی بھاگنے والوں میں تھے،دونوں کو بُری طرح قتل کروا دیا۔ اور شمر کی منحوس لاش کو کتوں کے آگے ڈال دیا۔جنھوں نے اس کی ایک ایک بوٹی نوچ لی۔

عبداللہ، مالک اور حمل نے رحم کی درخواست کی، مختار نے کہا: ''ظالمو! تم نے سبطِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر رحم نہ کھایا،تم پر کیسے رحم کیا جائے؟'' پھر اس نے ان سب کو قتل کروا دیا، مالک بن بشیر نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی زیادہ بے حرمتی کی تھی، اس کے دونوں ہاتھ اور پاؤں کٹوا کر میدان میں پھینک دیا، یہ تڑپ تڑپ کر مر گیا۔

خولی ابن یزید جو براہِ راست قتلِ حسین رضی اللہ عنہ میں شریک تھا، اسے ذبح کر کے اس کی لاش کو آگ میں جھونک دیا۔عمرو بن سعد اور اس کے بیٹے کو ایک ساتھ قتل کروا دیا۔عبیداللہ بن زیاد، حصین بن نمیر اور شرحبیل بن ذی الکلاع کو ابراہیم بن اشتر نے قتل کر کے ان کے سر کاٹ کر مختار ثقفی کے پاس بھجوائے، جو کوفہ کے قصر امارت میں

اسی جگہ رکھے گئے جہاں حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے گرامی قدر ساتھیوں کے مبارک اور باعظمت سر رکھے گئے تھے۔ مختار نے ابنِ زیاد اور عمرو بن سعد کے سر حضرت علی بن حسین رضی اللہ عنہ کے پاس بھیج دیئے۔ آپ ان کا برا انجام دیکھ کر اسی وقت خدائے ذوالانتقام کے حضور سجدے میں گر گئے۔

مختار ثقفی نے کسی سے بھی رعایت نہ برتی، عثمان بن خالد اور بشیر بن قسمیط جنھوں نے مسلم بن عقیل کے قتل میں حصہ لیا تھا، انھیں قتل کر کے جلا دیا۔

حکیم بن طفیل جس نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر تیر پھینکا تھا اس کا بدن تیروں سے چھلنی کر دیا اور وہ تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ زید بن افاد جس نے عبداللہ بن مسلم پر تیر پھینکا تھا، اس ننھے منے نے ہاتھ سے پیشانی چھپائی، تیر پیشانی پر لگا اور ہاتھ پیشانی سے بندھ گیا، اس شقی کو گرفتار کر کے اس پر بکثرت تیر برسائے جس سے اس کا بدن چھلنی ہو گیا۔ اور ابھی یہ ہلاک نہیں ہوا تھا کہ اسے آگ میں زندہ جلا دیا گیا۔ سنان بن انس جس نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا سر اقدس کاٹا تھا بھاگ گیا، مختار نے اس کا گھر منہدم کرا دیا۔ یہ کھنڈر بن گیا جسے دیکھ کر لوگ عبرت پکڑتے تھے۔[1]

"تاریخ الخلفاء" میں ہے، عبدالملک بن عمر لیثی کا بیان ہے کہ میں نے کوفہ کے قصرِ امارت میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا سر ابنِ زیاد کے سامنے ایک ڈھال پر رکھا ہوا دیکھا۔ پھر اسی قصر امارت میں ابنِ زیاد کا سر مختار کے سامنے دیکھا، پھر اسی قصر میں مختار کا سر مصعب بن زبیر کے سامنے دیکھا، پھر اسی محل میں مصعب بن زبیر کا سر عبدالملک کے سامنے دیکھا۔ راوی کہتے ہیں: "یہ واقعہ جب میں نے عبدالملک سے ذکر کیا تو وہ اس قصر کو منحوس سمجھ کر یہاں سے چلا گیا۔"[2]

---

① تاریخ طبری: 5/575-582، والبدایۃ والنہایۃ: 8/273-278، ومجمع الزوائد: 9/196،197. ② المنتظم لابن جوزی: 6/116، والبدایۃ والنہایۃ: 8/326.

حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ہم

کون سا مسلمان ہے کہ جس کے دل میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی بیکراں عقیدت و محبت کا شیریں اور شفاف چشمہ ابل نہ رہا ہو؟ بیشک آپ رضی اللہ عنہ کی محبت جزوِ ایمان ہے، ایمان اور بغضِ حسین رضی اللہ عنہ ایک دِل میں جمع نہیں ہو سکتے۔

اب مقامِ غور ہے کہ وہ حسین رضی اللہ عنہ جو خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کا سنہری دَور لانا چاہتے تھے، اور اُسی طرح کا دین اور توحید وسنت دیکھنا چاہتے تھے، اور اسی مقصد کے حصول کے لیے آپ رضی اللہ عنہ نے طرح طرح کی مصیبتیں جھیلیں اور صدمات برداشت کیے، کیا آپ رضی اللہ عنہ کے پیروکار اور عشق ومحبت کے دعویدار بھی اُسی دین اور اُسی توحید و سنت کا غلغلہ بلند کرنے کے آرزومند ہیں؟ کیا وہ سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے مشن اور مقصد شہادت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس تاریکی میں اسلام کی شمع فروزاں کرنا اور سنت نبویہ کا پھریرا لہرانا چاہتے ہیں؟......مگر جائے افسوس ہے کہ ہم نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے دعوائے عقیدت ومحبت تو بہت کیا اور ان کے نام پر بہت کچھ لٹایا۔ پوری قوم کو ان کا یوم شہادت منانے پر لگا دیا، مگر بدقسمتی کہ ان کی پیروی سے ہمیشہ گریز کیا، حالانکہ محبت، اطاعت اور اتباع سے پہچانی جاتی ہے لیکن اگر کہا مانا جائے نہ پیروی کی جائے بلکہ اس کے برعکس کام کیا جائے ،یعنی آپ رضی اللہ عنہ کے مشن کو اپنایا جائے نہ آپ رضی اللہ عنہ کے عظیم فلسفہ شہادت کی پروا کی جائے، نہ آپ کی سیرت وادا کی اقتداء کی جائے تو خود ہی بتایئے کہ یہ کیسی عقیدت ومحبت ہوئی؟ اسے سچی عقیدت ومحبت نہیں کہا جا سکتا۔

بیشک حضرت حسین رضی اللہ عنہ عاملِ قرآن تھے، حاملِ سنت تھے، خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے متبع تھے، سچے مؤمن اور اعلیٰ پائے کے مسلمان تھے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسہ، علی المرتضی رضی اللہ عنہ کے فرزند اور محبوب صحابی تھے، ہمیں آپ رضی اللہ عنہ کے طریقے اور تعلیمات کو اپنانا چاہیے تھا، مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے..... کہ شیعہ ہی نہیں بہت سے سنّی دوست بھی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی راہ کو بھول چکے ہیں اور انھوں نے طرح طرح کے طریقے اور رسومات ایجاد کر لی ہیں۔ شرک اور بدعت میں گرفتار ہو چکے ہیں بلکہ ستم یہ کہ بخلاف مسلکِ پنجتن کے اللہ تعالیٰ کے اوصاف اہلِ بیت رضی اللہ عنہم اور اولیاء اللہ کو تفویض کر رکھے ہیں۔ اللہ سے مانگنے کے بجائے ان سے مانگتے ہیں، ایک اللہ کو پکارنے کے بجائے انھیں پکارتے اور ان کی شبیہوں کے سامنے گڑگڑاتے ہیں۔ ہم اتحادِ ملی کے مخالف نہیں، نفاقِ ملی کے مخالف ہیں۔ پہلے اندر تو صاف کر لیں اور نقطۂ اتحاد طے کر لیں کہ وہ ہے کیا؟ ہمارے خیال میں وہ صرف اور صرف اِعْتِصَامْ بِحَبْلِ اللهِ یعنی قرآن وسنت کو پوری قوت سے تھامنا ہے۔ اتحاد کی بس ایک ہی صورت ممکن ہے کہ طریق سلف پر چلو۔ نبوی منہج اختیار کرو۔ صرف صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرز کی ایک ہی جماعت بناؤ۔ الگ الگ ٹولیاں بنانے کو ممنوع جانو۔ خلاصہ کلام یہ کہ اول الگ الگ اپنے نام نہ رکھو..... اور اگر رکھنا ضروری ہے تو انھیں امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع کر دو۔ اور اپنی سب کتابوں کو قرآن اور ثابت شدہ احادیث کے پیچھے لگا دو۔ اور قرآن وسنت میں کسی بھی قسم کی تحریف وتاویل سے کام لینے کو حرام سمجھو۔

شیعہ جو حبِ حسین رضی اللہ عنہ کے سب سے بڑھ کر دعویدار ہیں اور سمجھتے ہیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ محض ہمارے ہیں، ہمارے علاوہ اور کسی کے نہیں۔ اگر بات ایسے ہی ہے تو پھر ان کا عمل اہلِ بیت رضی اللہ عنہم کے سراسر خلاف کیوں ہے؟ اُن کا دین خالص توحید و سنت تھا اور ان کا مستدَل قرآن وحدیث تھا اور بس۔ لیکن مقامِ تأسّف و رنج ہے کہ

آج شہید کربلا رضی اللہ عنہ، کے یہ محب و عاشق ایسی ایسی بدعتیں ایجاد اور اختیار کیے ہوئے ہیں جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے مشن کے سراسر خلاف اور ان کی تعلیمات کے یکسر منافی ہیں۔ حسین رضی اللہ عنہ کے نام نہاد معتقد بتائیں کہ کیا حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے ماتم کرنے، چھاتیاں کوٹنے، نوحہ و مرثیہ پڑھنے، نشتر اور زنجیریں مار مار کر اپنے آپ کو زخمی کرنے، اپنے جسم کا خون نکالنے، تابوت تعزیہ وضریح بنانے، گھوڑا اور علم نکالنے، سبیلیں لگانے، کوزے بھرنے اور غیر اللہ کے نام پر کھانا پکانے، کھلانے، دیے جلانے، اور اسی قسم کے دوسرے خلاف شرع اعمال سرانجام دینے کی تعلیم اور اجازت دی ہے؟ کہاں دی ہے؟...... اگر نہیں دی ہے، اور یقیناً نہیں دی ہے، تو پھر حبِّ حسین رضی اللہ عنہ کا تقاضا یہ ہے کہ تمام افعالِ قبیحہ اور عقائد وضعیہ کو چھوڑ کر وہی راستہ اور وہی اُسوہ اختیار کیا جائے، جس پر حضرت حسین رضی اللہ عنہ آخر دم تک گامزن رہے اور دوسروں کو اس پر چلنے کی تاکید فرماتے رہے۔ اور ہم بتا چکے ہیں کہ وہ صرف قرآن وسنت تھا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو اپنے جھگڑوں اور بکھیڑوں سے بچ کر صحیح حب حسین رضی اللہ عنہ، حب اہل بیت رضی اللہ عنہم اور حب صحابہ رضی اللہ عنہم کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ اور وہ ان کی صحیح سچی پیروی اور اسوہ کے احیاء میں ہے۔

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ پر باطل تاویلات و روایات

مسلمانوں میں ایک غالی اور گم گشتہ راہ جماعت جو اہلِ بیت کرام رضی اللہ عنہم کے عشق و محبت کا بلند بانگ دعویٰ کرتی ہے، قرآنِ کریم کی بکثرت آیات سے غلط استدلال کر کے ان کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی فضیلت اور شہادت میں پیش کرتی ہے۔ اور یہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش میں مصروف رہتی ہے کہ کلام اللہ میں جابجا حسین رضی اللہ عنہ اور اہلِ بیت رضی اللہ عنہم کے فضائل مرقوم ہیں۔ اور امام ممدوح رضی اللہ عنہ کی شہادت کے متعلق بہت سی پیش گوئیاں مذکور ہیں۔ اس کی تفصیل اس مختصر کتاب میں ناممکن ہے۔ نیز کتاب ھذا کا موضوع بھی ایسی تفصیلات کا متحمل نہیں ہے۔ صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ مذکورہ جماعت کے زعم میں اللہ تعالیٰ نے کتابِ حق کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شان اور ان کے فضائل شہادت بیان کرنے کے لیے نازل کیا ہے۔ اور یہ کہ قرآن پڑھنے اور سمجھنے کی اس سے زیادہ ضرورت نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ اس سے صرف اہلِ بیت رضی اللہ عنہم کے محامد اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے دلائل اخذ کیے جائیں۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۔

علاوہ ازیں عجیب تر بات یہ ہے کہ مذکورہ گروہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حدیث نبوی کا تو قریب قریب منکر ہے اور اس پر عمل کرنا اپنے اصول وعقائد کے خلاف سمجھتا ہے۔ لیکن ان موضوع اور خود ساختہ ''حدیثوں'' کو حرزِ جان بنائے ہوئے ہے جو شہادت حسین رضی اللہ عنہ کی پیش گوئیوں سے متعلق تراشی گئی ہیں۔ چند وضعی روایات یہاں

بطور نمونہ مختصراً درج کی جاتی ہیں:

1 جبرئیل نے آنحضرت ﷺ کو اطلاع دی کہ حسین رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ کی امت قتل کر دے گی۔

2 فرشتۂ وحی نے رسول اللہ ﷺ کو وہ سُرخ مٹی لا کر دکھائی جس زمین (یعنی سرزمینِ کربلا) میں حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کیا جانا تھا۔ پھر جب وہ مٹی کربلا کی مٹی سے ملائی گئی تو تصدیق ہوگئی کہ یہ وہی مٹی ہے۔

3 حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بھی بذریعہ غیب بتایا گیا کہ تمھارا بیٹا حسین رضی اللہ عنہ میدانِ طف میں قتل کیا جائے گا۔ وہ روتے ہوئے نبی ﷺ کے پاس پہنچے۔ تو آنحضرت ﷺ نے سُن کر فرمایا: ''مجھے تو اللہ تعالیٰ نے کب کی خبر دی ہوئی ہے کہ حسین رضی اللہ عنہ کا سر میری اُمت اتارے گی اور اس کو نیزے پر چڑھائے گی۔''

4 پیغمبر ﷺ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا منہ چوما کرتے اور فرماتے کہ اس کو زہر دیا جائے گا۔ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا گلا چومتے اور کہتے کہ اس کو تلوار سے قتل کیا جائے گا۔

5 آنحضرت ﷺ ایک شیشی لیے جا رہے تھے جس میں تازہ خون بھرا ہوا تھا۔ لوگوں نے پوچھا: ''یا رسولَ اللہ! یہ کیا ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ حسین رضی اللہ عنہ کا لہو ہے، جو فرشتے نے مجھے ابھی ابھی لا کر دیا ہے اور بتایا ہے کہ حسین رضی اللہ عنہ کو ارض طف (میدان کربلا) میں قتل کیا جائے گا۔''

6 رسولِ مقبول ﷺ کو وہ جگہ بھی دکھلا دی گئی، جہاں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا روضہ بننے والا تھا۔

7 معاویہ رضی اللہ عنہ نے شادی کر لی اور یزید پیدا ہو گیا۔ ایک روز وہ یزید کو کندھے پر اُٹھائے نبی ﷺ کے پاس آئے......، آپ ﷺ نے دیکھ کر کہا: ''دوزخی پر دوزخی سوار ہے۔ اور یہ سوار وہی دوزخی ہے، جو میرے حسین رضی اللہ عنہ کے خون کا پیاسا

ہے (العیاذ منہ)۔" وقس علی ہذا! یہ سب موضوع اور گھڑی ہوئی سو فیصد جھوٹی روایات ہیں۔ جس کی سزا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہنم بتلائی ہے جیسا کہ متعدد ثابت شدہ احادیث میں آتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ»[1]

"جس نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ گھڑا وہ اپنا ٹھکانہ آگ سمجھ لے۔"

ان بے بنیاد، من گھڑت اور بے سروپا روایتوں پر غور کیجیے کہ یزید تو دور نبوی میں پیدا ہی نہیں ہوا تھا بلکہ وہ تو عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں پیدا ہوا۔ اور معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کندھوں پر بھی اُٹھالیا؟ سچ ہے کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ پھر ایک تعجب خیز بات یہ بھی ہے کہ نام نہاد محبانِ حسین رضی اللہ عنہ یوں تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں نازیبا الفاظ کہتے ہیں اور ان سے عناد رکھتے ہیں۔ لیکن مندرجہ بالا روایات میں سے اکثر کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منسوب کرتے ہیں اور ان کو درست سمجھتے ہیں۔ یعنی بقول ان کے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ناقابل اعتماد ہیں مگر ان کی مرویات صحیح اور قابل اعتماد ہیں۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ.

8 پھر اسی پر بس نہیں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے مقبرہ کے متعلق لکھا ہے کہ جو شخص اس کی زیارت کرے اس کے تمام اگلے اور پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور حشر کے دن اس سے کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔ حالانکہ اس کا کوئی ثبوت ہی نہیں۔

9 کتاب "جامع الاخبار" مطبوعہ تہران، میں مرقوم ہے کہ جس شخص کا حج فوت ہو جائے وہ روضۂ حسین رضی اللہ عنہ پر جائے اس کی زیارت کرنے سے دس حجوں اور کئی عمروں کا ثواب ملے گا۔

10 کتاب "وافی" میں اس سے بہت بڑھ کر لکھا ہے مثلاً:

---

[1] صحيح مسلم، باب فى التحذير من الكذب على رسول الله ﷺ، حديث: 3 .

''عید کے دن مقبرۂ حسین علیہ السلام پر حاضر ہونے سے سو حج سو عمرہ اور سو جہاد کا اجر ملتا ہے۔ دریائے فرات میں غسل کرنے سے تمام گناہ دُور ہو جاتے ہیں اور غسل کرنے کے بعد جس نے روضۂ حسین علیہ السلام پر حاضری دی اس نے گویا عرش پر اللہ تعالیٰ کی زیارت کی۔'' لیکن کیا کیا جائے ان سب باتوں کا سر ہے نہ پیر۔

ان سب جعلی روایات کا مطلب یہ ہے کہ نماز روزہ اور دیگر احکام حقوق اللہ اور حقوق العباد پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں، بس حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے محبت وعقیدت رکھو سب گناہ بخش دیے جائیں گے۔ حُبِ حسین رضی اللہ عنہ تو خوش آئند بات ہے مگر یہ باتیں اور ان کا مقصد و مراد ناروا ہے۔

یقین جان لیجیے! اس قسم کی تمام خرافات ضلالت انگیز اور کفر خیز ہیں اور شرک و بدعت سے مملو اور مبنی برغلو ہیں۔ ان پر ایمان رکھنے سے انسان اپنے دین سے دُور ہو کر اس گمراہی میں مبتلا ہو جاتا ہے جس کی سزا ہاویہ جہنم ہے۔ اہلِ اسلام کو ایسے بدعقائد کے قریب بھی نہ پھٹکنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ جملہ مدّعیانِ اسلام کو ہدایت نصیب اور صحیح حبِّ حسین وحبِ آلِ حسین عطا فرمائے۔ آمین۔

محرّم اور عاشوراء

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ماہ محرم الحرام کی فضیلت حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کی وجہ سے ہے وہ غلطی خوردہ ہیں۔ محرم کا مہینہ ادوار پارینہ اور ازمنۂ قدیمہ سے معظم ومحترم چلا آرہا ہے اور اکثر انبیاء و مرسلین علیہم السلام کے عہد ہائے مبارکہ میں اس کا احترام کیا جاتا رہا ہے۔ خصوصاً یوم عاشوراء (محرم کا دسواں دن) تو کئی اقوام وملل کے نزدیک واجب الاحترام اور قابلِ انبساط دن تھا۔ اور اُس روز عید کی طرح خوشی منائی جاتی تھی۔ یہاں تک مرقوم ہے کہ اس کی فضیلت حضرت آدم صفی اللہ علیہ السلام سے چلی آتی ہے۔ کیونکہ جس روز جناب ابوالبشر علیہ السلام کی توبہ قبول ہوئی اور ان کو خلافت ارضی کا اعزاز ملا اُس دن یوم عاشور ہی تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا: ''کہ یومِ عاشوراء کو ایک قوم کی توبہ قبول ہوئی تھی۔ اور ایک قوم کی توبہ قبول ہوگی۔''[1] بنی اسرائیل میں اس کی بڑی اہمیت تھی۔ اور قوم یہود اس دن روزہ رکھتی، توبہ استغفار کرتی اور اس کو عید کی طرح مناتی تھی۔

یہ جو مشہور ہے کہ کشتی نوح علیہ السلام دس محرم کو جودی پہاڑ پر آن لگی۔ اسی دن یونس علیہ السلام کی توبہ قبول ہوئی اسی روز ابراہیم علیہ السلام کی پیدائش ہوئی۔ لیکن بمطابق امام ہیثمی رحمہ اللہ ''طبرانی'' نے المعجم الکبیر 188/2 میں اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ کیونکہ اس میں عبدالغفور نامی ایک متروک راوی ہے۔

زمانۂ جاہلیت میں عرب میں بھی محرّم کو افضل واشرف مانا جاتا تھا اور مشرکین بھی

---

[1] جامع ترمذی، الصوم، باب ماجاء في صوم المحرم، حدیث: 741

اس مہینے میں امن وصلح سے رہتے اور جنگوں کو ملتوی کر دیتے تھے۔

پھر حضرت رسول اکرم ﷺ کے عہد مبارک میں بھی محرم کی فضیلت برقرار رہی۔ صوم رمضان المبارک سے پیشتر حضور ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم یکم محرم کا روزہ رکھتے۔[1] اور بطور فرض رکھتے۔ لیکن جب رمضان شریف کے روزے کا حکم آیا تو محرم کا روزہ نفلی قرار دے دیا گیا۔ البتہ آنحضرت ﷺ دسویں محرم کو ضرور روزہ رکھتے۔[2] اور مسلمانوں سے فرمایا کرتے تھے: «مَنْ شَآءَ فَلْيَصُمْهُ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُفْطِرْ» ”عاشورہ کے دن جس کا جی چاہے روزہ رکھے جو نہ رکھنا چاہے نہ رکھے۔“ حضور ﷺ نے دسویں محرم کی اہمیت بھی بتا دی ہے، فرمایا:

«إِنَّ عَاشُوْرَاءَ يَوْمٌ مِّنْ أَيَّامِ اللّٰهِ فَمَنْ شَآءَ صَامَهُ وَمن شَآءَ تركَه»

”عاشورہ اللہ تعالیٰ کے دنوں میں سے ایک دن ہے، جو شخص چاہے اس دن روزہ رکھے۔“[3]

یعنی یہ روزہ فرض، واجب نہیں البتہ اس کا ثواب بہت زیادہ ہے۔ علاوہ اس روزہ کے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام عشرۂ محرم میں الگ کوئی کام نہ کرتے تھے نہ اس کا حکم دیتے تھے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ دس محرم کا روزہ ایک سال گزشتہ کا کفارہ ہے۔[4]

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ ”منہاج السنہ“ میں فرماتے ہیں: ”صوم عاشوراء کے سوا کوئی بھی عمل صحیح سند سے (محرم میں) ثابت نہیں۔“

---

① صحيح البخاري، الصوم، باب صوم عاشوراء، حديث: 2002.

② رسول اللہ ﷺ صرف دس محرم کو روزہ رکھتے تھے۔ البتہ ایک سال فرمایا کہ ان شاء اللہ اگلے سال نو محرم کا روزہ (بھی) رکھوں گا۔ (صحيح مسلم، الصيام، باب أي يوم يصام في عاشوراء، حديث: 1134) لیکن اگلا سال آنے نہیں پایا تھا کہ آپ ﷺ کی وفات ہو گئی۔

③ صحيح مسلم، الصيام، باب صوم يوم عاشوراء، حديث: 1125. ④ صحيح البخاري، الصوم، باب صوم يوم عاشوراء، حديث:2000، صحيح مسلم، الصيام، باب صوم يوم عاشوراء، حديث: 1126

اس سے ثابت ہوا کہ محرّم اور اس کے عاشورہ کی فضیلت واہمیت زمانۂ قدیم سے ہے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے یکم محرم کو میدان کربلا میں قیام فرمایا اور دسویں محرم (عاشوراء کے دن) آپ رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوئی۔ جاہل اور گمراہ لوگوں کی طرف سے محرّم، عشرۂ محرم اور یوم عاشورہ سے متعلق جو غلط روایات مشہور کی جاتی ہیں وہ سب خانہ ساز اور یار لوگوں کی وضع کردہ ہیں۔ مثلاً یہ کہ عشرۂ محرم میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ماتم اور غم والم میں آندھیاں چلیں، جھکڑ آئے، ژالہ باری ہوئی۔ اور حادثہ کربلا سے لے کر آج دن تک فضائے آسمان پر سُرخ روشنی نمودار ہوتی ہے۔ فرشتے آسمان سے منہ نکال نکال کر روتے ہیں۔ طرح طرح کے عذاب، سیلاب اور آفات ارضی وسماوی کا نزول ہوتا ہے۔ اور اس کے برعکس رونے پیٹنے اور گریہ وزاری کرنے، تعزیہ وعلَم نکالنے والے اور کربلا کی نیاز دلوانے والے ''مومنین'' کے لئے آسمان پر سے خاص روشنیاں اور برکات وتجلیات نمودار ہوتیں اور ملائکہ نازل ہوتے ہیں اور پچھلے سال کے سارے گناہوں کی معافی کا اعلان ہوتا ہے۔ اور تمام کائنات اور اس کی ہر ایک شے آہ وبکا، گریہ وماتم، رنج وغم اور حیف وتأسف کرنے لگتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

بیشک یہ تمام کہانیاں طبع زاد افسانے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔

یاد رکھیے! شرعاً ماہ محرم یا عاشورائے محرّم میں ختنہ، منگنی، سگائی، شادی، بیاہ کرنے کی کوئی ممانعت نہیں۔ جو لوگ اس سے منع کرتے ہیں وہ اسلامی تعلیمات سے تقریباً ناواقف ہیں اور قوم میں جہالت وضلالت پھیلانا چاہتے ہیں۔ ان کے پاس خوشی کی تقریبات کے امتناع کا کوئی شرعی حکم نہیں ہے، محض ڈھکوسلہ بازی سے کام لیا جاتا ہے۔ جو ایک مؤمن قانت کے لائق نہیں ہے۔

ہاں! ان تقریبات میں اسراف وتبذیر، مزامیر اور دوسری غیر اسلامی رسوم کی جو ممانعت دوسرے ایام میں ہے وہی عشرۂ محرم میں بھی ہے۔ بعض لوگ نہ صرف عشرۂ

محرم میں بلکہ محرم کے پورے مہینے میں تقریبات شادی وغیرہ کو حرام وممنوع قرار دیتے ہیں، جس کو جہالت بر جہالت (بہت بڑی جہالت) کہنا چاہیے۔

پھر اسی پر بس نہیں۔ عاقبت نا اندیش لوگ محرّم اور عاشورہ کے متعلق غلط تاویلات اور بے بنیاد روایات پیش کرنے سے بھی نہیں چُوکتے۔ اور یہاں تک غلو کرتے ہیں کہ قرآنی آیات کے اُنٹ شنٹ معنی کر کے کئی قسم کی تاویلیں کر لیتے ہیں۔ جعلی اور وضعی حدیثوں سے اپنی مطلب براری کرتے ہیں، کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے محرم اور اس کے ماتم کے متعلق یوں کہا ہے۔ فلاں کام کی ممانعت کی ہے۔ فلاں کام کا حکم دیا ہے۔ العیاذ باللہ!

یہ مذکورہ سب ہوائی باتیں ہیں۔ جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ اس قسم کے غیر شرعی مسائل پر چلنے چلانے والا بدعتی اور بڑا گناہگار ہے، جو اسوۂ رسول ﷺ اور اسوۂ حسین رضی اللہ عنہ سے دور، جادۂ اہلِ بیت رضی اللہ عنہم سے بھٹکا ہوا ہے اور یہ اہل بیت سے کوئی واسطہ اور محبت نہیں رکھتا۔ اسی طرح 10 محرّم کے دن توسیع طعام کی روایت جسے بڑی شہرت حاصل ہے بالکل من گھڑت ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی شان دار اور قابلِ مطالعہ تحقیق کے لئے ان کی گرانقدر کتب مثلاً مجموع الفتاوی: 254/2، منہاج السنہ: 248/2، اقتضاء الصراط المستقیم ص: 301، اور اسی طرح الموضوعات ج، 2 ص 203 کا مطالعہ فرمائیں۔ بہت تحقیقی اور مفید خاص وعام کتب ہیں۔

بدعات وخرافات سے بچنا ہر مسلمان کا اولین فریضہ ہے۔ چنانچہ صحیح البخاری اور صحیح مسلم میں ارشادِ نبوی ہے:

«مَنْ اَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هٰذَا مَالَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ»

"جس نے ہمارے دین میں کوئی نئی چیز شامل کی جو اس میں نہیں ہے تو وہ قابل قبول نہیں ہے۔"[1]

[1] صحيح البخاري الصلح، حديث: 2697، وصحيح مسلم، الاقضية، حديث: 1118.

خلاصہ کلام یہ کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی طرح قرآن وسنت سے تمسک اختیار کرنے اور شرک وبدعت کے ہر کام سے دور رہنے کی توفیق عطا فرمائے! آمین۔

نوحہ اور ماتم

آنحضرت ﷺ نے نوحہ اور ماتم کرنے سے سختی سے منع فرمایا ہے۔ آپ ﷺ اسے بہت ناپسند جانتے تھے، جب کوئی مرد یا عورت میت پر رونے پیٹنے لگتی تو آپ ﷺ فرماتے:

"اے لوگو! کیا تم اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: ﴿ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴾ [1] بھول گئے ہو؟ اللہ کریم تو فرماتا ہے کہ جب تم پر کسی قسم کی مصیبت نازل ہو یا غم واندوہ پہنچے تو ﴿ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴾ کہہ کر صبر وشکر سے کام لیا کرو جبکہ تم ماتم اور نوحے کرتے ہو؟" [2]

آنحضور ﷺ کی متعدد مستند حدیثیں اس بات پر شاہد ہیں کہ آپ ﷺ نے ماتم و غم، اور گریہ وبکا، نوحہ ومرثیہ، سینہ کوبی اور غیر شرعی رسوم کے مرتکب لوگوں سے بیزاری کا اعلان کیا ہے۔ مثلاً آپ ﷺ فرماتے ہیں:

«أَنَا بَرِيءٌ مِمَّنْ حَلَقَ وَسَلَقَ وَخَرَقَ»

"میں ان لوگوں سے بیزار ہوں، یعنی سخت نفرت کرتا ہوں جو چلّا کر اور گلا پھاڑ کر روئیں۔ گریبان اور کپڑے پھاڑیں۔ اور سر کے بال نوچیں۔" [3]

---

[1] سورة البقرة، 2: 156. [2] مسند أحمد: 201/1. [3] صحيح البخاري، الجنائز، باب ما ينهى من الحلق عند المصيبة، حديث : 1296، وصحيح مسلم، الإيمان، باب تحريم ضرب الخدود وشق الجيوب، حديث: 104، واللفظ له.

ایک موقع پر فرمایا:

«لَيْسَ مِنَّا مَنْ حَلَقَ وَخَرَقَ وَسَلَقَ»

''وہ شخص ہم میں سے نہیں جو غم اور مصیبت کے وقت سر کے بال منڈوائے، کپڑے پھاڑے، منہ نوچے اور چیخ چلا کر روئے۔''[1]

اسی طرح حضور ﷺ نے فرمایا:

«لَيْسَ مِنَّا مَنْ ضَرَبَ الْخُدُوْدَ وَ شَقَّ الْجُيُوْبَ وَدَعَا بِدَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ»

''وہ آدمی ہمارے ساتھ کچھ تعلق نہیں رکھتا جو مشکل و مصائب اور حزن و ملال میں رخساروں پر مارے، گریبان پھاڑے اور جاہلیت کے زمانہ کی طرح پکارے۔''[2]

کسی کے سوگ اور غم میں دائرہ متانت میں رہ کر صرف تین دن تک سوگ کی اجازت ہے۔ چنانچہ فرمایا: ''تین دن سے زیادہ سوگ کسی کے لیے جائز نہیں، ہاں! بیوی اپنے خاوند کے لیے 4 ماہ 10 دن سوگ کر سکتی ہے۔''[3]

ان ارشادات مبارکہ میں حضور ﷺ نے اس قسم کے اعمال کے مرتکب افراد کو لَيْسَ مِنَّا ''وہ ہم میں سے نہیں'' کہہ کر اپنے فرمانبرداروں کی صف سے ہی خارج کر دیا ہے۔ حضور ﷺ لَيْسَ مِنَّا کے الفاظ اس وقت استعمال فرماتے تھے جب کسی سے بہت بڑے گناہ کا ارتکاب ہو رہا ہو اور اسے سخت ڈانٹ پلانا مقصود ہو۔ لہٰذا اس

---

① صحيح مسلم، الإيمان، باب تحريم ضرب الخدود و شق الجيوب، حديث : 104، واللفظ له. ② صحيح البخاري، الجنائز، باب ليس منامن شق الجيوب، حديث: 1294، وصحيح مسلم، الإيمان، باب تحريم ضرب الخدود وشق الجيوب، حديث:103.
③ صحيح مسلم.

سے ثابت ہوا کہ جناب پیغمبر اسلام ﷺ نے ایسے خلافِ شرع افعال کو اختیار کرنے والوں سے سخت بیزاری اور نفرت کی ہے اور انھیں نہایت حقارت سے دیکھا ہے۔

لیکن تعجب یہ ہے کہ نوحہ و ماتم، گریہ و مرثیہ کو جائز کہنے والوں کے سامنے اگر قرآن وحدیث کے حوالے پیش کیے جائیں تو وہ ان حوالوں کو مانتے ہی نہیں۔ اور صاف انکار کرتے ہوئے کہہ دیتے ہیں کہ، صاحب! یہ ہمارے لیے نہیں۔ دوسری قوموں، فرقوں اور جماعتوں کے لیے ہیں۔ ہمیں تو یہی حکم ہے کہ حسین رضی اللہ عنہ کے غم میں خوب پیٹو، خوب روؤ، خوب ماتم کرو، زور زور سے چھاتیاں کوٹو، کثرت سے لہو بہاؤ اور اپنے گناہ بخشواؤ...... پتہ نہیں یہ کونسا اسلام ہے اور کون سی شریعت؟ ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾

سچ کہا کسی نے ؎

آنکھیں اگر بند ہیں تو دن بھی رات ہے
بھلا اس میں کیا قصور ہے آفتاب کا

ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب لوگوں کو اپنے اور اپنے حبیب پاک ﷺ کی بڑھ چڑھ کر اور بڑے ہی شوق و محبت سے اطاعت و فرمانبرداری کی توفیق عطا فرمائے۔آمین۔

خوب سمجھ لیجیے کہ آنحضرت ﷺ کسی ایک قوم کے نبی نہیں ہیں۔ جو دوسرے ان کی اطاعت و اتباع کے پابند نہ ہوں بلکہ آپ ﷺ آفاقی اور کائناتی رسول ہیں، آپ ﷺ کا ارشاد و اسوۂ مبارکہ سب لوگوں کے لئے لائق اطاعت و اتباع ہے۔ بعض لوگ اپنے ائمہ کے اقوال کو بے حد ترجیح دیتے ہیں، لیکن محرم کی جملہ بدعات و رسومات اور تعزیہ وعلَم وغیرہ کے لیے ان کے اقوال پیش نہیں کرتے۔ وجہ ظاہر ہے کہ ان خود ساختہ چیزوں کی حمایت میں ان ائمہ کرام رحمہم اللہ نے کچھ ارشاد نہیں فرمایا۔ الحمد للہ، سب ائمہ کی کتب ان رسومات کے تذکرہ سے خالی ہیں۔ چار اور بارہ کل سولہ اماموں

کی فقہ میں اس کے منانے کا کوئی ذکر و بیان نہیں۔

حضرت مولانا احمد رضا خان فاضل بریلی فرماتے ہیں: ''تعزیہ کے آثار دیکھ کر اعراض کریں۔ اس کی طرف دیکھنا ہی نہیں چاہیے۔''①

آپ محرّم میں مرثیہ خوانی میں شرکت اور چند دیگر رسومات کی بابت خوب فرماتے ہیں، موصوف کے چند ارشادات ملاحظہ ہوں۔ امید ہے، ہمارے سنّی بریلوی بھائی کم از کم اِدھر ضرور توجہ دیں گے:

1 آپ سے سوال کیا گیا: ''محرّم میں نوحہ خوانی کا کیا حکم ہے؟'' فرمایا: ''محرم شریف میں نوحہ خوانی ناجائز ہے......وہ (پروگرام) مناہی و منکرات سے پُر ہوتے ہیں۔''②

2 آپ سے پوچھا گیا: ''بعض اہلسنت والجماعت عشرہ محرم میں نہ تو روٹی پکاتے ہیں نہ جھاڑو دیتے ہیں۔ اس دن میں کپڑے نہیں اتارتے۔ ماہ محرم میں کوئی شادی بیاہ نہیں کرتے......'' اعلیٰ حضرت نے جواب میں فرمایا: ''یہ تینوں باتیں سوگ ہیں اور سوگ حرام ہے۔''③

3 محرّم کی محافل کی بابت فرماتے ہیں: ''ان بیہودہ رسوم نے جاہلانہ اور فاسقانہ میلوں کا زمانہ کر دیا۔''④

4 اعلیٰ حضرت فاضل بریلی نے فرمایا: ''تعزیہ پر چڑھا ہوا کھانا نہیں کھانا چاہیے۔ اگر نیاز دے کر چڑھائیں یا چڑھا کر نیاز دیں تو بھی اس کھانے سے احتراز کریں۔''⑤

5 سوال: تعزیہ منانا اور اس پر نذر و نیاز کرنا، عرائض بہ امید حاجت براری لٹکانا اور بہ نیت بدعت حسنہ اس کو داخل حسنات کرنا کیسا ہے؟ اعلیٰ حضرت موصوف نے فرمایا: ''افعال مذکورہ جس طرح عوام زمانہ میں رائج ہیں بدعت سیّۂ و ممنوع و ناجائز ہیں۔''⑥

---

① عرفان شریعت، حصہ اول، ص: 15. ②عرفان شریعت، حصہ اول، ص: 16. ③ احکام شریعت، حصہ اول، ص: 89. ④ تعزیہ داری، ص: 4.⑤ ایضاً،ص: 4. ⑥ ایضاً، ص: 15.

ایک اور اہم سوال

محرّم میں ماتم اور مرثیہ کرنے والے دوستوں سے کوئی پوچھے، کہ میدانِ کربلا میں ...... جس طرح حضرت حسین رضی اللہ عنہ شہید ہوئے۔ اسی طرح آپ رضی اللہ عنہ کے بہتر 72 ساتھیوں اور عزیزوں نے بھی شہادت پائی۔ آپ ان کا ماتم کیوں نہیں کرتے؟ ان کے مرثیے کیوں نہیں پڑھتے؟ ان کے تعزیے، تابوت، ضریح، گھوڑے، جھنڈے وغیرہ کیوں نہیں نکالتے؟

چلیے! دوسروں کو چھوڑ یئے۔ عباس علم دارِ حسین، علی اکبر بن حسین، عبداللہ بن حسین، عبداللہ بن علی، عثمان بن علی، جعفر بن علی، محمد اصغر بن علی، ابوبکر بن علی، علی اصغر بن حسین، ابوبکر بن حسن، قاسم بن حسین رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن حسن رضی اللہ عنہ، عون بن عبداللہ، محمد بن عبداللہ، جعفر بن عقیل، عبداللہ بن عقیل، عبدالرحمٰن بن عقیل، محمد بن سعید، عبداللہ بن مسلم، عبیداللہ بن عبداللہ، محمد بن قاسم بن عقیل رضی اللہ عنہم یہ تو سب کے سب اہلِ بیت اور آلِ رسول تھے تم اِن کا سوگ کیوں نہیں مناتے؟ ان کی ضریحیں کیوں نہیں بناتے؟ یہ بھی تو دشتِ کربلا میں بے دردی سے ذبح کیے گئے تھے۔ سب کچھ جو تم حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے عقیدت ومحبت کے نام پر کرتے ہو، تم ان مذکورین شہداء کے لیے کیوں نہیں کرتے؟ کیا تمھیں ان سے عقیدت ومحبت نہیں ہے؟...... اگر عقیدت و محبت ہے تو ان کے نام پر کیوں ''یہ کچھ'' نہیں کرتے؟؟ کون سی رکاوٹ ہے؟ کون سا

عذر مانع ہے؟

پھر حضرت علی کرّم اللہ وجہہ بھی تو شہید ہوئے تھے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو بھی زہر سے شہید کیا گیا تھا۔ ان سے کیوں درد و دریغ نہیں؟ اُنہیں کیوں نہیں رویا اور پیٹا جاتا؟ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے علاوہ اور گھڑ سوار تھے ان کے گھوڑے کیوں نہیں نکالے جاتے؟ یہ تو انصاف نہیں کہ ایک ہی شخصیت (حسین بن علی رضی اللہ عنہ) پر سارا زورِ غم اور تمام شورِ نوحہ صرف کر دیا جائے اور باقی بیسیوں شہدائے اہلِ بیت رضی اللہ عنہم کو اس سے محروم رکھا جائے۔ اگر ان کا ماتم اور سوگ نہیں کرتے ہو تو حسین رضی اللہ عنہ کا ماتم بھی بند کر دو۔ اگر حسین رضی اللہ عنہ کا کرتے ہو تو ان کا بھی کرو۔ یہ ہم ان کے کردار اور رویّے کے حوالے سے بات کر رہے ہیں۔ ورنہ شریعتِ بیضاء میں تو کسی کے ماتم کی بھی اجازت نہیں۔ یہ ہم دوستوں کی فکر اور دوستوں کی زبان میں پوچھ رہے ہیں۔

لیکن تحقیق یہ ہے کہ اسلام نے کسی چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے بزرگ کا بین، ماتم، سوگ، نوحہ وغیرہ کرنے کو جائز قرار نہیں دیا۔ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور آپ کے شہداء نوجوانوں نے تو ایسا بلند کردار پیش کیا ہے کہ ان کا سوگ اور ماتم کرنے کے بجائے صبر و سکون اور معمول کے ساتھ رہنا چاہیے۔ اور رب العزت کی بارگاہ میں ان کی قبولیت شہادت اور بلندیٔ درجات کی دعا کرنی چاہیے۔ اللہ جل مجدہٗ ان جملہ شہداء کی عظیم وجلیل شہادت کو قبول کرے۔ اور ان کی ارواح پر اپنی بے حد و حساب رحمت کی برکھا برسائے۔ (آمین ثم آمین)

توابین کی جماعت

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد کوفہ کے غدّاروں اور بے وفاؤں کو اپنے جُرم کا احساس ہوا۔ انھوں نے اپنے سیاہ اور سنگین دلوں کو جھانک کر دیکھا تو معصیت میں غلطاں نظر آئے۔ اور ان کی مجرمانہ حرکت ان کے گلے کی پھانس بن گئی۔ اتنا بڑا جرم آخر اس کا احساس تو ہونا تھا! چنانچہ ہوا۔ اور بہت ہوا۔ جب انسان صدق دل سے اپنی حرکات کا جائزہ لیتا ہے تو اسے ضرور احساس ہوتا ہے۔ اگر احساس نہ ہو تو سمجھ لیجئے کہ اندر کی انسانیت مر چکی ہے۔

اب انھوں نے سوچا کہ جس حسین رضی اللہ عنہ کو ہم نے اٹھارہ ہزار سے زائد خطوط لکھ کر اور بیسیوں پیغامات بھیج کر بُلایا تھا۔ جس کے ساتھ پکّی قسمیں اور حلف اُٹھا اُٹھا کر بڑے بڑے عہد و پیمان باندھے تھے۔ اور جس کے نام پر ہمارے تیس ہزار سے زیادہ افراد نے بیعت کی تھی۔ اس کو تو ہم نے بے وفائی کر کے دھوکا دے کر مارا اور بڑی بے دردی سے مارا۔ اب اس گناہ کو بخشوانے اور اس جرم عظیم کو معاف کرانے کا طریقہ یہ ہے کہ حسین رضی اللہ عنہ کے قاتلوں سے بدلہ لینے کے لیے ایک جماعت قائم کی جائے۔ جو قاتلین حسین کو تلاش کر کر کے انھیں ایسی عبرتناک سزا دے کہ جسے دیکھ کر پہلے اور پچھلے توبہ توبہ کریں۔ چنانچہ اس کا قیام عمل میں لایا گیا، اور اس کا نام "جماعۃ التوابین" (بہت توبہ کرنے والوں کی جماعت) رکھا گیا۔ مراد ہے قتلِ حسین رضی اللہ عنہ سے توبہ کرنے والا گروہ۔ لیکن اس کا کچھ فائدہ نہ تھا، محض اپنے دل کو مطمئن کرنے کے لیے ایک ادنیٰ

ساحر بہ تھا۔ قصہ مختصر یہ کہ اس جماعت نے کوشش کر کے اہلِ کوفہ کے علاوہ بصرہ، مدائن، عراق وغیرہ سے کثیر آدمیوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ اس فلسفے پر دنیا کے بڑے بڑے ظالموں، شقیوں، بدعہدوں، مکاروں اور فریب کاروں کی رُوحیں بھی تڑپ اُٹھی ہوں گی۔ کہ خود ہی قاتل اور اپنے ہی ہاتھوں نہایت شقاوت وقساوت سے امام مظلوم اور ان کے ساتھیوں کے ٹکڑے ٹکڑے اُڑانے والے ہیں اور خود قاتلینِ حسین رضی اللہ عنہ سے انتقام لینے کو اُٹھے ہیں۔ اللہ اللہ! اِمام شہید رضی اللہ عنہ کی مقدس روح بھی کیا کہتی ہوگی کہ ؎

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ

ہائے! اُس زُود پشیماں کا پشیماں ہونا

''توابین'' کی یہ جماعت کسی قاتلِ حسین رضی اللہ عنہ کو قتل تو کیا کرتی وہ تو اہلِ بیت رضی اللہ عنہم اور حسین رضی اللہ عنہ کے کسی دشمن اور مخالف کی نکسیر بھی نہ چلا سکی۔ ہاں! یہ ضرور کیا کہ اس جماعت کے آدمی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے مقبرہ پر جاتے، سر پر باہیں رکھ رکھ کر خوب روتے چلّاتے۔ آپ رضی اللہ عنہ کی قبر مبارک پر سر رکھ کر ''وائے حسین، ہائے حسین'' پکارتے، رو رو کے قبر کو بھگو دیتے۔ پھر لوگوں کو حسین رضی اللہ عنہ کی مظلومیت اور ان کے غم والم کی سچی جھوٹی داستانیں سُناتے۔ شہادت کے قصے بڑی رنگ آمیزیوں کے ساتھ رو رو کر بیان کرتے۔ ہوسکتا ہے اپنے سینے اور منہ پر ہاتھ بھی مارتے ہوں، جیسے کوئی شخص اپنا نقصان آپ کر کے کرنے لگتا ہے۔ آخر اس پیٹنے کی کوئی تاریخ یا پس منظر تو ہوگا۔ اور تعجب نہیں کہ یہیں سے آغاز ہوا ہو۔ یہ لوگ حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور اہل بیت رضی اللہ عنہم کے فضائل و خصائل، مکارم ومحاسن بڑھ چڑھ کر بتاتے۔ اور اس طرح اپنے گناہ ''بخشوانے'' کی کوشش کرتے۔ لُطف یہ کہ اہلِ بیت رضی اللہ عنہم کا کوئی فرد اس جماعت میں شامل نہ ہوا۔ اور سادات میں سے کسی نے جھانک کر بھی نہ دیکھا کہ یہ مکار گروہ کس باغ کی مولی ہے۔

روافض کا ظہور

یہ توابین کی جماعت ہی دراصل رافضیت کی بنیاد تھی، جو بڑھتے بڑھتے نہایت مبالغہ اور جذبہ سے حضرت علی اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کی مدح و توصیف میں بالاہتمام مصروف ہوگئی۔ یہ جماعت ہر سال عاشورہ کے دن حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے مزار پر جاتی، بین کرتی، روتی، پیٹتی، بال نوچتی، کپڑے پھاڑتی اور سینہ کوبی کرتی۔ اور لجاجت و آہ و زاری کر کے کہتی:

«يَاحُسَيْنُ! إِنَّا ظَالِمٌ وَأَنْتَ مَظْلُومٌ»

''اے حسین علیہ السلام! ہم ظلم کرنے والے ہیں اور آپ مظلوم ہیں۔''

پھر سوز و گداز سے جنگ کربلا کے منثور و منظوم واقعات سُناتی۔

الغرض توابین نے اسلام میں رفض کی مستقل بنیاد رکھ دی۔ رافضیوں کی ٹولیاں اکناف عرب میں پھیل گئیں۔ اور ممالک اسلامیہ میں انھوں نے اپنی شاخیں قائم کر لیں۔ عوام کو انھوں نے اپنا ہمنوا اور ہم عقیدہ بنانا شروع کر دیا۔ اور اہلِ بیت خصوصاً علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین کے لیے ''ہمدردیاں'' اور ''ارادتمندیاں'' حاصل کرنے کے لیے بہت دوڑ دھوپ کی۔ جس میں انھیں کافی حد تک کامیابی بھی ہوئی۔ عشق و محبت اور متلاطم جذبات کی بنا پر آخر تحریک تو چل پڑتی ہے، چنانچہ یہ تحریک بھی چل پڑی۔ لیکن اہلِ بیت رضی اللہ عنہم کے افراد ان سے بیزار اور الگ تھلگ رہے۔ اور دوبارہ ان کے جھانسے میں نہ آئے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ نام کے ''جاں نثار'' از حد طوطا چشم اور بے وفا ہیں۔

عبداللہ بن سبا

قوم یہود میں ایک شخص عبداللہ بن سبا کا وجود نا مسعود اسلام اور مسلمانوں کے لیے سخت خطرناک تھا۔اس کا نام جتنا اچھا تھا کام اتنا ہی برا تھا۔کسی کا محض شخصی یا جماعتی نام نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ اس کا کام بھی دیکھنا چاہیے۔اسی نام کا ایک اور شخص بھی تھا جو رئیس المنافقین تھا اور عبد اللہ بن اُبی کے نام سے مشہور تھا۔عبد اللہ کا معنی کتنا اچھا ہے؟اللہ کا بندہ۔اللہ کا غلام،لیکن ان دونوں اللہ کے''بندوں''اور''غلاموں'' کی پوری تگ و تاز اسلام کے خلاف تھی۔ ان دونوں نے اسلام کو بے حد نقصان پہنچایا، اتنا نقصان جو صریح کافر بھی نہ پہنچا سکے۔کافر تو کافر ہی ہوتا ہے۔اس کا کفر عیاں ہوتا ہے، اس لیے وہ کسی سے چُھپ نہیں سکتا۔ہر کوئی اسے پہچان لیتا ہے۔مگر جب وہ منافق بن کر کام کرتا ہے تو اسے پہچاننا مشکل ہوجاتا ہے۔ہم بتانا یہ چاہتے ہیں کہ ان دونوں بہت بڑے منافقوں نے اسلام کا لبادہ اوڑھ کر رسول اللہ ﷺ اور اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم کی عقیدت ومحبت کا نام لے کر اہل اسلام کے خرمنِ اتحاد میں آگ لگانی شروع کر دی۔اور مسلمانوں کا ایسا بٹوارہ کیا اور اسلام کو ایسی نا قابل تلافی گزند پہنچائی کہ الاماں۔

تقریباً اسی طرح کے ہمارے دور میں بھی دو اشخاص ہوئے ہیں دونوں کا نام بہت اچھا تھا یعنی''غلام احمد'' مگر کام اس کے بالکل برعکس تھا۔بہت خطرناک، بے حد برا۔ ایک نے ختم نبوت کا دروازہ کھولا اور منکرین ختم نبوت کی جماعت قائم کر دی۔دوسرے

نے حدیث کا برملا انکار کر دیا۔ اور منکرین حدیث کا منظم گروہ تیار کر دیا۔ اور دونوں نے مسلمانوں میں دو الگ الگ پارٹیاں بنا دیں۔ نتیجتاً بہت سے لوگوں کو گمراہی کے گڑھے میں گرا دیا۔ اس طرح خود بھی کفر کا ارتکاب کیا اور مسلمانوں کو بھی کافر بنا دیا۔ عبداللہ بن سبا کے ذیل میں چند دوسرے ''ائمۃ الکفر'' (یعنی کفر کے اماموں) کا بھی تھوڑا ذکر کر دیا ہے تاکہ ہم ان سے متعارف ہو کر ان کے دجل وفریب سے بھی آگاہ ہو جائیں۔

عبداللہ بن سبا کے بارے میں اتنا سمجھ لیجیے کہ یہ بدطینت، وقت کا منافق اعظم تھا اور اکابرین منافقین میں شمار ہوتا تھا۔ جب اس مردود کو جماعت توابین یعنی روافض کی سرگرمیوں کا علم ہوا، اور یہ خبر پہنچی کہ یہ لوگ علی اور حسین بن علی رضی اللہ عنہما کے بہت مداح ہیں اور مقبرۂ حسین رضی اللہ عنہ پر جا کر روتے پیٹتے اور اپنے جرائم و معاصی (یعنی حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں پر مظالم) کی معافی چاہتے ہیں۔ تو اس نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور سوچا کہ یہی وہ سنہری وقت ہے جس سے فائدہ اُٹھا کر دینِ اسلام اور اس کے متبعین کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اُس نے بھی ایک ''سبائی جماعت'' بنا لی۔ نام الگ تھا لیکن کام وہی تھا۔ اس نے بہت جلد توابین اور ان کے ہم عقائد لوگوں کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ اور اپنے اغراض و مقاصد کا یوں اعلان کیا کہ:

1. یہ جماعت حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بلافصل سمجھتی ہے۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکر، عمر، اور عثمان رضی اللہ عنہم خلیفہ نہ تھے وہ جبراً خلیفہ بن گئے یا بنا دیے گئے۔ آپ کے متصل بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ تھے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف انھی کی خلافت کے متعلق وصیت کی تھی۔

2. اصحابِ ثلاثہ (ابوبکر، عمر، عثمان رضی اللہ عنہم) علی رضی اللہ عنہ کی خلافتِ حقہ کے غاصب تھے اور اس پر جابرانہ قابض تھے۔ انھوں نے املاک نبوی پر بھی زبردستی قبضہ جما لیا تھا۔ ان ''جرائم'' کے ماتحت ان کے جس قدر ہجو و ہتک کی جائے اور ان کو جس قدر برا بھلا کہا جائے، اتنا ہی

باعثِ ثواب ہے۔ کیونکہ انھوں نے بڑے غصب اور ظلم کا ارتکاب کیا۔ یعنی علی رضی اللہ عنہ کا حق چھین کر خود اس پر قبضہ جمالیا۔ اس نے کہا: "یہ ان کا غصب بھی ہے اور ظلم بھی۔"

3 عائشہ رضی اللہ عنہا چونکہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیٹی ہے اور از بسکہ اسی نے اپنے باپ کو خلافت اور جائیداد رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر قبضہ جمانے پر اُکسایا تھا۔ لہٰذا اس پر بھی سب وشتم جائز بلکہ بعض صورتوں میں ضروری ہے۔ (چنانچہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر گالی گلوچ کا یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی منقبت وفضیلت پر ہماری مقبول عام تازہ پیشکش "عفیفۂ کائنات رضی اللہ عنہا" کا مطالعہ کیجیے۔

4 خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم چونکہ خود قابلِ اعتماد نہیں تھے، لہٰذا ان کا جمع کردہ قرآن بھی غلط اور ناقابل اعتماد ہے۔ اس کی بجائے کوئی اور قرآن مرتب کیا جائے۔

5 اذان ونماز کا طریقہ اور ایجاد کیا جائے۔ مروجہ اذان ونماز چونکہ صحابہ اور عام مسلمانوں سے مروی اور ان کی معمول بہا ہے، اس لیے وہ قابلِ عمل نہیں۔ یعنی نہ یہ اذان درست ہے نہ یہ نماز صحیح۔ چنانچہ اذان اور نماز الگ وضع کی گئی۔

6 ہر سال یکم محرم سے دسویں محرم تک حسین بن علی رضی اللہ عنہما کا زور وشور سے ماتم کیا جائے۔ تعزیے اور تابوت بنائے جائیں۔ گھوڑے اور علَم نکالے جائیں جو شخص غم حسین میں چند آنسو گرائے گا اُس کی مغفرت ہو جائے گی۔ اور جو کوئی ماتم حسین میں بدن کا لہو نکالے گا وہ سیدھا بہشت میں چلا جائے گا۔ اس کے مطابق محرم کی فضیلت کسی اور وجہ سے نہیں بلکہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کی وجہ سے ہے اور اس تمام مہینے میں خوشی کی ساری تقریبات حرام وممنوع اور موجب گناہ عظیم ہیں۔ (یعنی یہ سب جھوٹے مسائل پاس سے گھڑے اور رواج دیے۔ جو آج تک مروّج ہیں۔)

7 مروجہ درود: اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی إِبْرَاهِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ إِبْرَاهِیْمَ إِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔ اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی

مُحَمَّدٍ وَ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰی اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَجِيْدٌ کی بجائے یہ درود پڑھا جائے......: اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدِنِ الْمُصْطَفٰی وَعَلٰی عَلِيٍّ نِ الْمُرْتَضٰی وَعَلٰی فَاطِمَةَ الْبَتُوْلِ بِنْتِ الرَّسُوْلِ وَعَلَی الْحَسَنِ وَعَلَی الْحُسَيْنِ سِبْطَيِ الرَّسُوْلِ، الَّذِيْنَ أَذْهَبَ اللّٰهُ عَنْهُمُ الرِّجْسَ وَطَهَّرَهُمْ تَطْهِيْرًا. اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَى الْأَئِمَّةِ الطَّاهِرِيْنَ اٰبَاءِ الْاَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ.[1]

8 اصحابِ ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے مقابلے میں فاطمہ، علی، اور حسن و حسین علیہم السلام کو سب سے زیادہ فضیلت دی جائے۔ تاکہ لوگ ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کا نام لینا بھول جائیں اور ان کو برا بھلا کہنے لگیں۔

9 حج کے لیے کعبہ کی بجائے کربلائے معلّٰی سے رجوع کیا جائے۔ اور مدینہ جا کر روضۂ رسول کی بجائے قصر فاطمہ اور روضۂ حسین کی زیارت کی جائے۔ کیونکہ روضہ رسول پر جانے سے ان کے ساتھ پڑے ہوئے ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی تکریم ہوگی جو روا نہیں۔ یہ دونوں بڑے مجرم ہیں۔ ان کی عزت افزائی منع ہے۔[2] لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ.

[1] وفيات الأعيان ترجمه جوهر القلائد. [2] مأخوذ از العقد الفريد، مقدمه لواع الاشجان، الملهوف، مسائل الجاهلية، الموضوعات في عاشوراء، امالى مطبوعه ايران، خطط جلد اوّل مطبوعه بولاق وغيره.

پنجتن پاک کی اُلوہیت

سبائی اور رافضی جماعتوں نے پہلے تو یہ سوچا کہ جن اصحابِ ثلاثہ (ابو بکر صدیق، عمرِ فاروق، عثمانِ غنی رضی اللہ عنہم) کی مساعی بلیغہ سے اسلام کو تقویت اور ترقی حاصل ہوئی اور جن کی کوششوں سے دینِ اسلام تمام اکناف عالم میں پھیلا، جب تک مسلمانوں سے انھیں گالیاں نہ دلوائی جائیں اور مسلمانوں کے دلوں میں ان کی نفرت وعداوت نہ پیدا کی جائے، اس وقت تک اسلام اور مسلمانوں کو شدید ضعف نہیں پہنچ سکتا۔ پس انھوں نے سب سے پہلا تیشہ خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی عظمت وفضیلت کے شجرِ ثمر بار پر چلایا۔ اور ان جماعتوں کے ارکان کو شاتمِ اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم بنایا۔ پھر انھوں نے یہ خیال کیا کہ یہ منصوبہ بھی کافی نہیں، گو اس سے اسلام کو نقصان تو پہنچ سکتا ہے مگر مہلک نقصان نہیں پہنچ سکتا، لہٰذا انھوں نے پنجتن اور اہلِ بیت رضی اللہ عنہم کے جملہ افراد کو الوہیت کا درجہ دے دیا اور اعلان کر دیا کہ یہ حضرات صفاتِ خداوندی سے متصف ہیں۔ فریادیں سنتے ہیں۔ دعائیں قبول کرتے ہیں۔ قاضی الحاجات ہیں۔ حل المشکلات اور دافع البلیّات ہیں۔ تمام کائنات ارضی وسماوی، برّی وبحری کا قبضہ واختیار انھی کے ہاتھ میں ہے۔ چنانچہ یہ مشہور مشرکانہ شعر اسی جماعت کی تصنیف ہے کہ

لِیْ خَمْسَةٌ اُطْفِیءُ بِهَا حَرَّ الْوَبَاءِ الْحَاطِمَةِ

اَلْمُصْطَفٰی وَالْمُرْتَضٰی وَابْنَاهُمَا وَالْفَاطِمَةِ

"یعنی مجھے جہنم کے خوفناک عذاب سے بچانے والے پنجتن ہیں۔"[1]

مصیبت اور مشکل، بیماری اور وبا میں یہ لوگ اس کو گلے میں باندھتے، گھروں میں لٹکاتے۔ پانی میں گھول کر پیتے پلاتے اور انسانوں، حیوانوں پر چھڑکتے ہیں۔ العیاذ باللہ، لیکن خوب سمجھ لینا چاہیے کہ یہ اور اس قسم کی سب باتیں توحید کے منافی ہیں۔ ان سے بہت دور رہنا چاہیے۔

یہ نظریات قرآن وسنت اور خود عقیدۂ اہل بیت رضی اللہ عنہم کے سراسر خلاف ہیں۔

دکھ کی بات ہے کہ یہ سبائی افکار ونظریات آج تک باقی ہیں۔ اور روافض اس دن سے اسی عقیدے کی تشہیر کرتے اور اسے جگہ جگہ عام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہدایت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ فی الحال ہم دعا ہی کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ایسے عقائد و خیالات سے مکمل طور پر بچا کر رکھے جو قرآن وحدیث کے مخالف ہیں۔ ایسے نظریات واضح طور پر توحید سے ٹکراتے ہیں۔ اور ہمیں ذہناً صحابہ کرام واہل بیت رضی اللہ عنہم کا مخالف ومعاند بناتے اور اسلام سے دور کرتے ہیں۔

ہمارے بہت سے سنّیوں کو شیعہ سنّی کے درمیان فرق کا مطلق علم نہیں۔ وہ دونوں کو قریب قریب ایک ہی سمجھتے ہیں۔ بیشک رواداری اچھی بات ہے مگر رواداری کے نام سے حقیقت پر تو پردہ نہیں ڈالنا چاہیے۔ عقائد تو نہیں بدلنے چاہئیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کی توہین تو نہیں ہونی چاہیے۔

---

[1] افسوس! بہت سے سُنّی (بریلوی) واعظین بھی اپنی تقاریر میں جھوم جھوم کر یہ شعر پڑھتے ہیں۔ انھیں اہل توحید سے ضدّ کو بالائے طاق رکھ کر تھوڑی دیر رُک کر یہ غور کرنا چاہیے کہ وہ اپنے مجمع میں یہ شعر پڑھ کر کس مذہب اور عقیدے کو تقویت دے رہے ہیں؟ اور اپنے ساتھ عوام الناس کو کس راہ پر ڈال رہے ہیں؟ اگر پہلے غور نہیں کیا تو اب ہی کر لیں۔

باب 10:

شیعہ سنّی عقائد ونظریات میں فرق

اہل سنت اور اہل تشیع کے عقائد ونظریات میں دو ایک جگہ نہیں بلکہ جگہ جگہ فرق ہے۔ یہ فرق ہم بعض بھولے بھالے اہل سنت اور عوام الناس کے لئے مختصراً بیان کرتے ہیں۔ اور شیعی کتب اور شواہد کی روشنی میں ہدیۂ قارئین کرتے ہیں تاکہ کسی کو انکار یا اعتراض کا موقع نہ ملے۔ اور جو لوگ ناسمجھی سے اندھیرے میں پڑے ہوئے ہیں وہ روشنی میں آ جائیں۔

پہلا فرق

پہلا فرق ارکان اسلام اور کلمہ شریف کا ہے۔ اسلام کے ارکان میں پہلا رکن لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری و صحیح مسلم کی حدیث: «بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ......» میں آتا ہے۔ اس کے اقرار اور شہادت کے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہوسکتا...... جبکہ شیعہ کے ہاں اس کلمہ کی ضرورت ہی نہیں۔ ان کے ہاں جو ارکان ہیں وہ ملاحظہ فرمائیے۔

❁ شیعی حدیث نمبر [1]: فرمایا امام جعفر صادق علیہ السلام نے: اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی۔ نماز، زکوۃ، صوم، (روزہ)، حج اور ولایت۔ اور اسلام اس شان کے ساتھ کسی چیز کے ساتھ نہیں پکارا گیا جتنا ولایت کے ساتھ۔ [1]

---

① الشافی: 2/30.

❊ شیعی حدیث نمبر 2: فرمایا امام محمد باقر علیہ السلام نے: اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے، نماز، زکوٰۃ، صوم، حج اور ولایت۔ اور اسلام کی سب سے نمایاں چیز ولایت ہے۔لوگوں نے چار کو لے لیا اور ولایت کو چھوڑ دیا۔[1]

❊ شیعی حدیث نمبر 3: فرمایا امام جعفر صادق علیہ السلام نے: خدا نے پانچ چیزیں اپنی مخلوق پر فرض کی ہیں۔ ان میں سے چار میں رخصت کی اجازت ہے سوائے ایک کے۔ (یعنی ولایت کے۔)[2]

اسی مذکورہ کتاب الشافی میں بروایت ابو بصیر چاروں ارکان کی فرضیت کی نفی اور پانچویں رکن ''ولایت'' کی فرضیت بتائی گئی ہے۔ یعنی چاروں ارکان کو مانیں یا نہ مانیں کوئی فرق نہیں پڑتا مگر ولایت کو ضرور مانیں...۔ مطلب ظاہر ہے کہ کوئی شخص ولایت کو مانے بغیر مسلمان بن سکتا ہے نہ مومن۔ اور ''ولایت علی'' سے ان کی مراد رسول اللہ ﷺ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ولی اور وصی ہونا ہے۔شیعہ کے نزدیک ارکان اسلام میں سب سے اہم رکن یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ کا ولی، وصی اور جانشین مانا جائے۔ اور ان کی اصطلاح میں ''مؤمن'' سے مراد وہ شخص ہے جو آپ ﷺ کے متصل بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ولایت (نیابت و جانشینی) کو مانتا ہے۔[3]

ہماری اذان میں: «أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ اور أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ» ہے۔مگر اس کے برعکس شیعہ احباب ان کلمات کو بھی شامل کرتے ہیں: «أَشْهَدُ أَنَّ عَلِیًّا وَلِیُّ اللّٰهِ وَوَصِیُّ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَخَلِیْفَتُهٗ بِلَافَصْلٍ» یہ کلمہ ہر جگہ شیعہ دوستوں کی اذان میں بڑے اہتمام کے ساتھ بآواز بلند سنایا جاتا ہے۔ گویا شیعہ اور باقی امت کے ارکان اسلام میں بھی فرق ہے اور اذان کے الفاظ میں بھی فرق ہے۔

---

[1] الشافي: 2/ 30. [2] الشافي، ص: 34. [3] الشافي: 2/ 34.

(یہ الگ بات ہے کہ ان کا یہ کلمہ کہیں آتا بھی ہے یا نہیں۔لیکن اتنا ضرور ہے کہ ان کا اس کلمہ پر پختہ ایمان ہے۔اس کے منکر کو وہ اسلام کا منکر اور اس کے قائل کو وہ اسلام کا قائل اور'' مؤمن'' کہتے ہیں۔) وہ کہتے ہیں یہ اذان چونکہ صحابہ سے مروی ہے لہٰذا درست نہیں۔اور کہتے ہیں وہ بھی ایسے ویسے تھے اور ان کی اذان بھی ایسی ویسی یعنی ناقابل تسلیم ہے۔(استغفر اللّٰہ ثم استغفر اللّٰہ) حالانکہ ہمارے پاس پورا دین انھی کے راستے اور ذریعے سے آیا ہے۔(بمطابق روایت قرآنِ مجید کی جملہ آیات اور پچاس پچپن ہزار سے زائد احادیث صحیحہ ہمیں انھی کے ذریعے سے موصول ہوئیں۔ہم اس جماعت حقّہ کا انکار کر کے دنیا کے سامنے کون سا قرآن و حدیث پیش کر سکتے ہیں؟ کون سے اسلام کی دعوت دے سکتے ہیں؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اولین راویان قرآن و حدیث ہیں۔اولین راویان اسلام ہیں تو پھر ہم کون سے قرآن و حدیث اور دینِ اسلام کو برحق کہہ سکتے ہیں؟ ان کی تردید وتکذیب کے بعد اسلام کی صداقت اور اہمیت کی کوئی دلیل ہمارے پاس تو نہیں رہتی، کسی اور کے پاس ہو تو پیش کرے۔گویا صحابہ رضی اللہ عنہم کا انکار، قرآن کا انکار، حدیث کا انکار، سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار، بلکہ اسلام کے انکار کے ہم معنی ہے۔یہ ارکانِ اسلام وایمان اور کلمہ شہادت بھی ہمیں انھی کے واسطے سے ملا۔

دوسرا فرق

دوسرا فرق قرآن مجید کا فرق ہے۔ہم اس موجودہ قرآن مجید کو برحق مانتے ہیں۔ یعنی اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ جبرئیل امین علیہ السلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارا ہوا مانتے ہیں۔اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ وہی قرآن مجید ہے جو آج سے تقریباً چودہ سو برس قبل امام کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا۔اس میں کوئی کمی بیشی

ہوئی ہے نہ ہوسکتی ہے۔ اور یہ بہر پہلو محفوظ ہے اور تا نورِ نیّرین قطعی طور پر محفوظ رہے گا۔ جبکہ شیعہ احباب بیشک اس قرآن کو مانتے ہیں مگر اس کو تحریف اور تبدیل شدہ مانتے ہیں۔ اس سلسلے میں شیعی عقیدہ ملاحظہ ہو:

❁ شیعی حدیث: امام جعفر صادق سے روایت ہے۔ انھوں نے فرمایا:

«إِنَّ الْقُرْآنَ الَّذِیْ جَآءَ بِهٖ جِبْرِیْلُ عَلَیْهِ السَّلَامُ إِلٰی مُحَمَّدٍ وَلَهٗ سَبْعَةَ عَشْرَ أَلْفِ أٰیَاتٍ»

''جبرئیل علیہ السلام جو قرآن، محمد ﷺ کے پاس لائے تھے اس میں سترہ ہزار (17000) آیات تھیں۔''[1]

حضرت العلام مولانا محمد عبدالشکور فاروقی لکھنوی رحمہ اللہ نے کتاب ''شیعہ اور قرآن'' ص: 13 میں لکھا ہے: ''میں نے پٹنہ میں خدا بخش خاں کے مشہور کتب خانہ میں ایک جعلی قرآن کا قلمی نسخہ، شیعوں کا لکھا ہوا چالیس پارے کا بچشم خود دیکھا ہے۔''

ملا باقر مجلسی نے تذکرۃ الائمہ ص 5 پر لکھا ہے: درقرآن درآیات بسیار نام علی علیہ السلام بودہ کہ عثمان بیرون کردہ. ''قرآن کی بہت سی آیات میں مولیٰ علی علیہ السلام کا نام تھا عثمان نے ان کا نام قرآن سے خارج کردیا۔'' (استغفر اللہ)

چونکہ اس قرآن کو روایت اور جمع کرنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے، لہٰذا اہلِ تشیّع اس کی صداقت اور حفاظت وصیانت کے بارے میں متردد اور حد درجہ شک وشبہ کا شکار ہیں۔ لیکن زبان سے نہیں کہتے۔ بیشک ان کے کسی بڑے سے پوچھ کر دیکھ لیں، گویا اندر عقیدہ اور ہے اور باہر اور۔ اسی کو قرآنِ مجید نے نفاق اور کھوٹ کہا ہے۔ اور یہ

[1] اصول کافی، ص: 176.

نفاق ہرگز کسی مؤمن ومسلم میں نہیں ہونا چاہیے ورنہ اس کے اصل عقیدے کا بھی اعتبار نہیں رہتا۔ اور اعتبار بھی کیوں ہوسکتا ہے؟

تیسرا فرق

تیسرا فرق صحابہ رضی اللہ عنہم کا ایمان ہے۔ ہمارے نزدیک سب صحابہ واہل بیت رضی اللہ عنہم جنتی ہیں۔ اللہ ان سے راضی ہو چکا ہے۔ اور وہ اللہ سے راضی ہو چکے ہیں۔ اور یہی معنی ہیں رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡہُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡہُ کے۔ وہ عقیدہ وعمل میں ہمارے لیے معیار ہیں۔ ان کی گستاخی یا توہین فسق وکفر ہے، ان کا ادب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب ہے اور ان کی دشمنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی ہے۔ ان کی منقبت وفضیلت میں قرآن مجید میں جابجا آیات اور کثیر احادیث ملتی ہیں۔ اگر انہیں یکجا کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے۔ اگر ساری امت جمع ہو جائے تو وہ کسی ایک صحابی کی شان کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتی۔ منافقوں کے متعلقہ آیات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر چسپاں کرنا بدترین ظلم، حد درجہ طوطا چشمی اور پرلے درجے کا کفر ہے۔ یہی حکم امہات المومنین اور جملہ صحابیات رضی اللہ عنہن کا ہے۔ علاوہ ازیں انبیاء ورسل علیہم السلام کی طرح صحابہ رضی اللہ عنہم میں بھی تفاوتِ مدارج ہے۔ مگر سب سے کم تر صحابی کی عظمت کا بھی یہ عالَم ہے کہ اس کے بلند وبالا درجے کو کوئی دوسرا نہیں پہنچ سکتا۔ خلفائے راشدین یعنی حضرت ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم کا درجہ سب صحابہ رضی اللہ عنہم سے فائق ہے۔ اور ان کی ترتیب فضیلت وہی ہے جو ان کی ترتیبِ خلافت ہے۔ صحابہ ہوں یا اہل بیت رضی اللہ عنہم وہ اس قدر عظمت وجلالت کے باوجود معصوم یا نبی ومرسل کے ہم پلہ نہیں تھے، وہ آخر امتی تھے۔ لہٰذا ان سے بھی فروگذاشتیں ہوئیں۔ جنہیں اجتہاد اور سوچ یعنی فکر کی فروگذاشت کہتے ہیں۔ غلطی فکر کی ہو یا نسیان اور لاعلمی کی اس پر اللہ تعالیٰ مؤاخذہ نہیں فرماتا۔ جس غلطی میں نیت اور ارادہ

شامل نہ ہو رب اس غلطی کو معاف فرما دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سب صحابہ واہل بیت رضی اللہ عنہم کے دل و دماغ کی تطہیر وتزکیہ کو دیکھ کر ان کی خطاؤں کو معاف کر دیا۔ اور انہیں:

أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ   أُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ   أُولَٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ

أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا   لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ   فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَنِعْمَةً   رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ   کے روح افزاء و ایمان افروز کلمات دلنواز کو قرآن بنا دیا۔ اور قرآن کو محفوظ فرما کر صبح قیامت تک ان کی عظمت و بزرگی کا پرچم لہرا دیا۔ جو زمان ومکاں کی پابندیوں سے بے نیاز ہو کر آج تک لہرا رہا ہے اور حشر تک لہراتا رہے گا۔ آسمان علم وفضل کے ان تابندہ و درخشندہ ستاروں پر تھوک پھینکنے والا انہیں نہیں گہنا سکتا بلکہ خود ہی ذلیل وحرماں نصیب ہوتا ہے۔

لیکن افسوس صد افسوس! اہل تشیع کا عقیدہ ونظریہ ان اَخیارِ امت کے بارے میں بڑا ہی افسوسناک اور دلخراش ہے۔ ان کے نزدیک گنتی کے دو چار صحابہ کے سوا سب منافق اور مرتد تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس آیت: إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا [1] میں جن منافقین کا ذکر ہے اور جنہیں قرآن مجید نے إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ [2] کہہ کر کافروں سے بھی بدتر قرار دیا، اس سے مراد خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم (علاوہ حضرت علی رضی اللہ عنہ) ہیں۔ چنانچہ ان کی شہرۂ آفاق ومعتبر کتاب ''اصول کافی'' ص: 265 میں ہے:

«نَزَلَتْ فِيْ فُلَانٍ وَفُلَانٍ وَفُلَانٍ اٰمَنُوْ بِالنَّبِيِّ فِي اَوَّلِ الْأَمْرِ كَفَرُوا حَيْثُ عُرِضَتْ عَلَيْهِمُ الْوَلَايَةُ فَهٰؤُلَاءِ لَمْ يَبْقَ فِيْهِمْ مِنَ الْإِيْمَانِ شَيْءٌ»

---

[1] النسآء: 4/137۔ [2] النسآء: 4/145۔

ہمیں یارائے قلم نہیں ورنہ ہم اس عبارت کا ترجمہ کرتے۔ بہر حال ہم اصول کافی کی ''شرح الصافی'' سے اس کا مفہوم بتائے دیتے ہیں۔ کتاب مذکور جزء سوم، حصہ دوم، ص:98 میں ہے۔ امام گفت ایں آیت نازل شددر ابوبکر و عمر و عثمان. ''یعنی امام جعفر صادق علیہ السلام نے کہا: سورۂ نساء کی یہ آیت ابوبکر، عمر، عثمان کے بارے میں نازل ہوئی۔ جو پہلے ایمان لائے پھر کافر ہو گئے۔ (العیاذ منہ) ان کا تو یہ عقیدہ ہے صحابہ رضی اللہ عنہم کے سرخیل خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں۔ اب دیگر صحابہ وازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں شیعی عقیدہ ملاحظہ ہو، وہ بھی قریب قریب ایسا ہی ہے:

«قَالَ: كَانَ النَّاسُ أَهْلَ رَدَّةٍ بَعْدَ النَّبِيِّ ﷺ اِلَّا ثَلٰثَة......»

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مقداد بن اسود، ابو ذر غِفاری اور سلمان فارسی رضی اللہ عنہم کے علاوہ باقی سب صحابہ مرتد ہو گئے تھے۔''[1] (معاذ اللہ، استغفر اللہ)

شیعہ محدّث ملا باقر مجلسی حیات القلوب ج،2 ص: 745 طبع لکھنو میں حضرت ابوبکر، عمر، عائشہ، حفصہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں لکھتا ہے:

پس آں دومنافق و آں دو منافقه بایکدیگر اتفاق کردند که آنحضرت رابزهر کنند.

''وہ دو منافق تھے اور یہ دو منافقہ تھیں، انھوں نے باہمی ملی بھگت سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو زہر دینے پر اتفاق رائے کر لیا۔'' (استغفر اللہ)

یہ صحابہ وصحابیات رضی اللہ عنہم کے بارے میں شیعی روایات کی دیگ سے دو چار چاول پیش کیے ہیں ورنہ ان کے ہاں اصحابِ رسول کی بابت ایسا بہت سا مواد موجود ہے جسے وہ صحیح جان کر اپنی نجی مجلسوں اور محفلوں میں پیش کرتے ہیں۔

---

① فروع کافی، ج: 3، وکتاب الروضه، ص: 115.

چوتھا فرق

شیعہ کا عقیدہ ہے کہ ائمہ پر ایمان لانا فرض ہے۔ ائمہ اللہ کا نور ہیں اور معصوم ہیں۔ دنیا و آخرت ان کی مِلک ہے۔ یہ حرام/حلال پر پورا اختیار رکھتے ہیں۔ (اصول کافی ص: 109، 110، 111، 121، 122، 259، حق الیقین، ص: 126۔ طبع ایران)

علاوہ ازیں ان کے نزدیک امامت کا رتبہ درجہ نبوت سے بلند ہے۔ شیعی محقق و مجتہد و محدّث ملا باقر مجلسی متوفی 1110 ھ، حیات القلوب، ج: 3، ص: 3 میں لکھتے ہیں: ''مرتبہ امامت بالا از مرتبہ پیغمبری است'' کہ مرتبۂ امامت مرتبۂ رسالت سے بھی اونچا ہے۔''

پانچواں فرق

شیعہ کے ہاں ''عقیدہ بدء'' کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ''بدء'' کے معنی ظہور و انکشاف کے ہیں۔ یعنی پہلے ایک چیز معاذ اللہ رب تعالیٰ کو معلوم نہیں ہوتی، پھر وہ اس پر ظاہر ہوتی ہے اور اس کا عملاً ظہور ہو جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں رب تعالیٰ پہلے ایک چیز کو نہیں جانتا، پھر وہ چیز اس پر واضح ہو جاتی ہے۔ اور اسے اس کا علم ہو جاتا ہے۔

ہمارے نزدیک رب تعالیٰ ہر چیز کو ازل سے جانتا ہے۔ کوئی بات اس کے علم وادراک سے باہر نہیں ہے، نہ ہو سکتی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے بارے میں ایسا سوچنا اور عقیدہ رکھنا اس کی شان سے بعید، اس ذات والا صفات کی توہین اور سراسر کفر ہے۔ لیکن شیعہ کے ہاں عقیدہ بدء کو عبادت کا درجہ حاصل ہے۔ اور ہر مؤمن کے لیے اسے اختیار کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ اصول کافی کتاب التوحید باب البدء ص: 228 میں ہے، مَا عُبِدَاللّٰهُ بِشَيْءٍ مِثْلَ الْبَدْءِ ''اللہ تعالیٰ کی عبادت کسی اور چیز سے ایسی نہیں ہوتی جیسی کہ عقیدہ بدء سے ہوتی ہے۔'' گویا شیعہ کے ہاں اللہ تعالیٰ کی صریح توہین کا

نام عظیم عبادت ہے۔

چھٹا فرق

اسلام میں ہر حال میں جھوٹ بولنا (خصوصاً دینی اور اعتقادی امور میں) غایت درجہ قبیح اور کبیرہ جرم ہے۔ قرآن وحدیث میں جگہ جگہ اس کی مذمت وارد ہوئی ہے۔ مگر شیعہ اور امامیہ کے نزدیک، جھوٹ بولنا خالص دین ہے۔ اس کا نام ان کے ہاں تَقِیّہ مشہور ہے۔ ان کے نزدیک دین کے 9 حصے تقیّہ (جھوٹ) میں مضمر ہیں۔ چنانچہ اصول کافی میں تقیہ کا مستقل باب باندھ کر (شیعی) احادیث لائی گئی ہیں۔ نموتاً ایک حدیث ملاحظہ فرمالیں! امام ابوعبداللہ (جعفر صادق علیہ السلام) نے کہا:

«إِنَّ تِسْعَةَ أَعْشَارِ الدِّينِ فِي التَّقِيَّةِ وَلَا دِيْنَ لِمَنْ لَا تَقِيَّةَ لَهُ»

''بیشک دین کے نو حصے تقیہ میں ہیں اور جو شخص تقیہ نہیں کرتا وہ بے دین ہے۔''

یہی وجہ ہے جو یہ لوگ پبلک میں کھل کر اپنے عقائد ونظریات بیان نہیں کرتے۔ خصوصاً قرآن، حدیث اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی بابت۔ اور نموتاً جو ان کے عقائد ہم بیان کر رہے ہیں ان کے بارے میں گول مول کر جاتے ہیں۔ کیونکہ اگر وہ اپنا عقیدہ صاف اور شفاف بیان کریں تو ان کی تبلیغی تگ وتاز بالکل رک جائے، لوگ بدظن ہوکر پیچھے ہٹ جائیں۔ اور یہ مذہب بالکل محدود ہوکر رہ جائے۔ بلکہ ان کا جینا محال ہوجائے۔ مگر ''عقیدۂ تَقِیّہ'' کی بنا پر وہ ان نقصانات سے بچ جاتے ہیں۔ لیکن یہ سوائے ایک داؤ اور دھوکے کے کچھ بھی نہیں۔ اسلام میں نہ اس کی ضرورت ہے نہ گنجائش۔

اس کے برعکس اہل تشیع اسے مباح ومستحب بلکہ واجب کہتے ہیں۔ چنانچہ ان کے مشہور محقق صدوق بن بابویہ قمی لکھتے ہیں:

وَالتَّقِيَّةُ وَاجِبَةٌ لَا يَجُوزُ دَفْعُهَا إِلٰى أَنْ يَخْرُجَ الْقَائِمُ فَمَنْ تَرَكَهَا قَبْلَ خُرُوجِهٖ فَقَدْ خَرَجَ عَنْ دِينِ اللّٰهِ وَ عَنْ دِيْنِ الْإِ مَامِيَّةِ.

''تقیہ واجب ہے اس کا ترک کرنا اس وقت تک جائز نہیں جب تک کہ القائم امام مہدی کا ظہور نہ ہو۔ جس نے ان کی آمد سے قبل اسے چھوڑ دیا تو وہ اللہ کے دین اور امامیہ دین سے نکل گیا۔''[1]

ساتواں فرق

شیعہ متعہ کے قائل ہیں۔ بلکہ اسے بڑا کار خیر سمجھتے ہیں۔ متعہ کے لغوی معنی فائدہ حاصل کرنے کے ہیں۔ چنانچہ ''أحکام القرآن للجصاص'' میں ہے: أَلْاِسْتِمْتَاعُ هُوَ الْاِنْتِفَاعُ. متعہ کے اصطلاحی معنی یہ ہیں کچھ مدت کے لیے کسی قدر معاوضہ پر (بلا خطبہ اور بلا شرائط) نکاح کیا جائے۔ قدرے تفصیل یہ ہے کہ کوئی مرد بغیر عورت کے ولی، گواہوں اور نکاح وغیرہ کے بے خاوند غیر محرم عورت سے متعین وقت کے لیے مقررہ وقت اور مقررہ اجرت کے عوض مجامعت کی خاطر معاملہ طے کر لے۔ اس مقررہ اجرت کے علاوہ مرد پر کوئی نان ونفقہ ہے نہ رہائش۔..... مگر دین اسلام میں یہ حرام ہے۔ اس پر نصوص قرآن وسنت شاہد ہیں۔ (دیکھئے سورۃ المومنون، تفسیر کبیر: 214/6، وفتح البیان: 221/6، تفسیر قرطبی: 12/ 106، وصحیح بخاری: 1/ 255، صحیح مسلم: 451/1)

شیعہ کے مشہور مفسر ملّا فتح اللہ کاشانی تفسیر منہج الصادقین: 356/1 میں لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ تَمَتَّعَ مَرَّةً فَدَرَجَتُهٗ كَدَرَجَةِ الْحُسَيْنِ وَمَنْ تَمَتَّعَ مَرَّتَيْنِ

---

[1] رسالہ اعتقادیہ مع اردو شرح احسن الفوائد، ص: 472 طبع سرگودھا۔

فَدَرَجَتُهٗ كَدَرَجَةِ الْحَسَنِ وَمَنْ تَمَتَّعَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ فَدَرَجَتُهٗ كَدَرَجَةِ عَلِيٍّ وَمَنْ تَمَتَّعَ أَرْبَعَ مَرَّاتٍ فَدَرَجَتُهٗ كَدَرَجَتِيْ»

''جس نے ایک مرتبہ متعہ کیا وہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا درجہ پائے گا۔ جس نے دو مرتبہ متعہ کیا وہ حسن رضی اللہ عنہ کا۔ اور جو تین دفعہ متعہ کرے گا وہ سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا رتبہ پائے گا۔ اور چار مرتبہ متعہ کرے گا وہ میرا (یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا) رتبہ پائے گا۔'' (استغفر اللہ استغفر اللہ)

ہم علیٰ وجہ البصیرت اور برملا کہتے ہیں یہ حدیث بھی جھوٹی ہے اور بات بھی جھوٹی ہے......اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس پر کتنا بڑا اور صریح الزام ہے۔ اتنا بڑا الزام کہ جس سے بڑے الزام کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل بیت رضی اللہ عنہم کی اس سے بڑی توہین اور کون سی ہو سکتی ہے؟ یقیناً اس جھوٹی حدیث گھڑنے کی سزا جہنم ہے...... یہ ملّا کاشانی کی کس قدر جسارت ہے جو اس نے ان عظیم ہستیوں کی بارگاہ میں کی؟ اور کتنی جرأت ہے ان لوگوں کی جو ایسے عقائد رکھتے اور اپنی قوم میں ان کی تشہیر کرتے ہیں......(انا للہ وانا الیہ راجعون۔)

آٹھواں فرق

ہمارے نزدیک حضرت علی رضی اللہ عنہ چوتھے خلیفہ تھے۔ مگر شیعہ انہیں پہلا خلیفہ مانتے ہیں اور اس پر مصر اور بضد ہیں۔ وہ جو اذانوں میں ''أَشْهَدُ أَنَّ عَلِيًّا وَلِيُّ اللّٰهِ وَ وَصِيُّ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَخَلِيفَتُهٗ بِلَا فَصْلٍ'' کہتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی ہیں۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد آپ کو اپنا خلیفہ بنانے کی وصیت کی تھی۔ اور خلیفتہ بلافصل کا مطلب ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متصل بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ تھے۔ اور ان کے بقول حج سے واپسی پر غدیر خم کے

مقام پر اللہ تعالیٰ نے آیت قرآنی: ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلرَّسُولُ بَلِّغْ مَآ أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ ۖ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُۥ﴾...... [1] کے ذریعے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خلافت علی رضی اللہ عنہ کے اعلان کا حکم ارشاد فرمایا۔ اور بقول شیعہ آپ ﷺ نے نامساعد حالات دیکھ کر اس حکم کے اعلان میں پس و پیش کیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو «وَإِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ» کی ڈانٹ پلاتے ہوئے ولایت علی کا اعلان کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ آنحضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے «من كنت مولاه فعلي مولاه» کا حکم سنا کر خلافت علی بلا فصل کا برملا اعلان کر دیا۔ یہ تمام تفصیل امامیہ کے پیشوا ابن المعلم یعنی مفید محمد بن محمد کی کتاب ''روضۃ الواعظین'' میں مذکور ہے۔ اور شیعی معتبر کتاب فصل الخطاب، ص: 258 کے مطابق مذکورہ آیت خلافت میں ''فی علی'' کے الفاظ خارج کر دیے گئے ہیں۔ یہ بات تفسیر قمی، تفسیر فرات، تاویل الروایات، احتجاج طبرسی، کشف الغمۃ، الرسالۃ الموضحۃ، اور بحار الانوار وغیرہ میں بھی موجود ہے۔ ان کے بقول آیت ''مِنْ رَّبِّكَ فِي عَلِيٍّ'' تھی۔ جس سے یہ بھی پتہ چلا کہ اہل تشیع کے نزدیک یہ قرآن محرّف و مبدّل ہے، جیسا کہ پیچھے بتایا جا چکا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب آیۂ مذکورہ میں خلافت علی رضی اللہ عنہ کا حکم تھا تو آنحضرت ﷺ نے چھپایا کیوں؟ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ حکم دبایا کیوں؟ اور جب قرآن مجید محرّف ہے تو اس سے استدلال کیسا؟...... اس ناخوشگوار عقیدے نے حضور اکرم ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی لپیٹ میں لے لیا ؎

جنوں کا نام خرد رکھ دیا، خرد کا جنوں
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

---

[1] المآئدہ 5: 67.

نواں فرق

مسئلہ امامت ہے، شیعہ کا مسئلہ امامت ہماری امامت سے بالکل الگ ہے۔ ہم کسی بڑے رہنما، عظیم لیڈر، قرآن وسنت اور فقہ کے ماہر، علوم وفنون کے موجد یا اس کے ماہرو شناور کو امام کہتے ہیں اور لوگ اس کی عظمت ورفعت کو دیکھ کر یہ خطاب دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں کوئی امام منصوص ومشروع نہیں ہوتا۔ اس طرح کے امام، امت میں چار نہیں ہزار ہیں۔ ہر علم وفن کا الگ الگ امام ہے۔ واضح اور روشن خدمات سرانجام دینے والا شخص بھی امام کہلاتا ہے...... ایسے ائمہ کا تذکرۂ جمیل بیسیوں کتب میں بکھرا پڑا ہے...... لیکن شیعہ کے ہاں ''امام'' کی اصطلاح اہلسنت سے یکسر مختلف ہے، ان کے ہاں امام منصوص ومشروع ہونے کے علاوہ اور بہت سی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ شیعہ کے ہاں امام کو لوگ امام نہیں بناتے ہیں نہ وہ ان کے بنانے سے بنتا ہے۔ اللہ اسے خود بناتا ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے امام متعین کر دیتا ہے۔ یعنی امام منصوص ومتعیّن ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک ایسے امام کی امامت کو تسلیم کرنا اور اس پر ایمان لانا اسلام کا اہم ترین رکن ہے۔ ان کے نزدیک ایسے ائمہ کی تعداد بارہ ہے، جو شخص انھیں مانتا ہے وہ مؤمن ہے۔ اور جو شخص کسی امام کی بھی امامت کا منکر ہے وہ کافر ہے۔ اس کے کفر میں کوئی شک نہیں۔ دیکھیے کتاب الشافی: 34/2، علاوہ ازیں ان کے نزدیک امام کے لئے بہت سی شرائط ہیں۔ مثلاً وہ عالم الغیب، متصرف، مشکل کشا ہو اور اپنی موت و حیات پر قدرت رکھتا ہو۔ (حالانکہ) بمطابق قرآن وحدیث ایسے اوصاف اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کسی کو حاصل نہیں۔ جو کسی دوسرے میں مانے وہ مشرک ٹھہرتا ہے۔ ان کے بارھویں امام گیارھویں امام جناب حسن عسکری کے بیٹے ایک لونڈی ملیکہ (نرگس) کے بطن سے 256ھ میں والد کی وفات سے دس روز قبل پیدا ہوئے۔ اس

بارھویں امام کی بابت شیعی عقیدہ یہ ہے کہ آپ چار پانچ برس کی عمر میں بغداد سے 60 میل دور غار "سُرَّمَنْ رَاٰی" میں اپنا قرآن، امامت کے آلات، تابوت سکینہ اور عصائے موسیٰ علیہ السلام وغیرہ لے کر روپوش ہو گئے۔ اور قرب قیامت ان کا ظہور ہوگا۔ یہ لوگ اپنی اصطلاح میں انہیں الامام، الحجہ، القائم، المنتظر اور صاحب زمان کہتے ہیں۔ اور ان کے بقول جب 313 مخلص مسلمان اور ساتھی (یعنی شیعہ مومن) جمع ہو جائیں گے تو اس وقت اللہ تعالیٰ ان کا معاملہ ظاہر کرے گا۔[1] یہ امام تقریباً 260ھ میں روپوش ہوئے۔ اب 1431ھ ہے اس وقت تقریباً بارہ سو سال ہونے کو ہیں، مگر آج تک 313 مخلص اور ایماندار شیعہ پیدا نہیں ہوئے۔ اگر اتنے ہو جاتے تو وہ تشریف لے آتے۔ ملا باقر مجلسی لکھتے ہیں جب قائم آل محمد ظاہر ہوں گے:

واول کسیے کہ باو بیعت کند محمد ﷺ باشد وبعد از آں علی رضی اللہ عنہ

"سب سے پہلے حضرت محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام ان کی بیعت کریں گے، پھر ان کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ۔"[2]

(آگے لکھا ہے:) بعد ازاں ابوبکر وعمر (رضی اللہ عنہما) کو زندہ کر کے درختوں پر لٹکا کر سولی دیں گے۔ دونوں کو یوں ہزار مرتبہ کیا جائے گا۔ یعنی ہزار مرتبہ سولی پر لٹکایا جائے گا:

پس خدا بھر جا کہ خواھد ایشاں را ببرد و معذب گرداند.

"یعنی اس کے بعد اللہ جہاں چاہے گا انہیں لے جائے گا اور عذاب سے دوچار کرے گا۔"[3] (العیاذ، العیاذ) کس قدر جرأت وجسارت ہے ان لوگوں کی؟ انا للہ

اسی کتاب "حق الیقین" ص: 139 میں ہے:

عائشہ را زندہ کند تا بر اُو حد بزندو انتقام فاطمہ، ازو بکشد.

---

[1] خلاصہ از: احتجاج طبرسی، ص: 230 طبع ایران. [2] حق الیقین، ص: 139 طبع ایران.
[3] حق الیقین باب رجعت، ص: 145.

"عائشہ (رضی اللہ عنہا) کو زندہ کریں گے پھر ان پر حد لگائیں گے، اور ہماری فاطمہ رضی اللہ عنہا کا ان سے انتقام لیں گے۔"

(استغفر اللہ، استغفر اللہ۔ لیکن یہ دل کو خوش کرنے کے لیے سب بنائی ہوئی باتیں ہیں۔ جن کا حقیقت سے ادنیٰ سا بھی تعلق نہیں)

کتاب مذکور کے ص: 527 میں ہے: پیش از کفار ابتداء بہ سُنّیاں خواہد کرد...... وایشان راخواہد کُشت۔" کافروں سے پہلے وہ سنّیوں اور ان کے علماء سے کارروائی شروع کریں گے اور ان سب کو قتل کریں گے۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سب باتیں اپنے دل کا ابال نکالنے اور اپنے اندرونی کینے کو سکون بہم پہنچانے کے لئے تراشی گئی ہیں جن کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ لیکن ان لوگوں کی جسارت دیکھیے کہ توہین اور بے ادبی کے باب میں ہر قسم کی حدود و قیود کو پھلانگ گئے۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑا نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو معاف کیا، نہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کوئی رعایت نہ کی۔ نہ اہل سنت کا لحاظ کیا۔

دسواں فرق

عقیدہ رجعت ہے۔ اہل تشیع کا عقیدہ ہے کہ قیامت سے پہلے ایک قیامت آئے گی۔ تمام جن وانس کو زندہ کیا جائے گا اور سب کے بادشاہ امام مہدی ہوں گے اور لکھا ہے: دنیا کی عمر ایک لاکھ برس ہے 20 ہزار برس دوسروں کی حکومت ہوگی۔ اور 80 ہزار برس شیعہ کی حکومت ہوگی، کسی شیعہ پر بڑھاپا، کمزوری، مصیبت، بیماری کچھ نہیں آئے گی، شیعوں کے قویٰ تیز کر دیئے جائیں گے۔ یہ کسی دوسرے شہر کے مناظر بآسانی دیکھ اور سن سکیں گے۔ ہر شیعہ کی عمر ایک ہزار برس ہوگی اور ہر سال ان کے ہاں ایک

بیٹا پیدا ہو گا۔ (سبحان اللہ، کیسی گھڑی اور تراشی ہوئی باتیں ہیں) شیعوں کے لئے مسجد کوفہ سے پانی، دودھ اور شہد کی نہر جاری ہو گی۔ اور کھانے پینے کی چیزیں جنت سے آئیں گی۔ اللہ تعالیٰ ہر شیعہ کی خدمت کے لئے ایک فرشتہ مقرر کرے گا۔ جو اس کے چہرے سے غبار صاف کرے گا اور جنت میں اس کے ٹھکانے کی سیر کرائے گا (کیونکہ یہ رب کے بڑے محبوب اور لاڈلے ہوں گے نا۔) دوسری طرف امام مہدی عائشہ (رضی اللہ عنہا) کو زندہ کریں گے اور عذاب دیں گے۔ پھر تین دن کے بعد یہی سلوک ابوبکر و عمر سے ہو گا۔ آیت قرآنی ﴿سَنَسِمُهُ عَلَى الْخُرْطُومِ﴾ کی تفسیر یہ ہے کہ زمانہ رجعت میں امیر المومنین علی علیہ السلام اپنے دشمنوں یعنی سنیوں اور اصحاب رسول کے چہروں پر داغ دیں گے۔ اور آیت قرآنی ﴿فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنكًا﴾ کی تفسیر یہ ہے کہ سنیوں کی غذا گندگی اور شیعوں کا پیشاب و پاخانہ ہو گا۔ دیکھئے شیعی کتاب انوار نعمانیہ، ص: 152، 160، 161، 162، 165۔ بصائر الدرجات، ص: 18، 3، 2، حق الیقین، ص: 429۔

پھر امام مہدی سب سے پہلے کعبہ، پھر مسجد نبوی اس کے بعد دنیا بھر کی سنی مسجدوں کو گرا دیں گے۔

«وَيَخْرُجُ الْقُرْآنَ الَّذِي أَلَّفَهُ أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ وَلَمْ يَعْمَلْ بِهِ الْأَشْقِيَاءُ وَيُعْمَلُ بِذَالِكَ الْقُرْآنُ»

''پھر امام مہدی علیہ السلام وہ قرآن نکالیں گے جو علی علیہ السلام نے تالیف کیا تھا اور بدبختوں نے اس پر عمل نہیں کیا تھا۔ اور اس نئے قرآن پر عمل ہو گا۔''

دیکھئے: انوار نعمانیہ: 1/157، رجال کشی، ص: 93، بصائر الدرجات، ص: 123۔ ان کتب کے مطابق امام مہدی نیا اسلام، نیا قرآن، نئی سنت اور نئے احکام لائیں گے۔ الفاظ یہ ہیں:

«ثُمَّ يَقُوْمُ بِأَمْرٍ جَدِيْدٍ وَكِتَابٍ جَدِيْدٍ وَ سُنَّةٍ جَدِيْدٍ عَلَى الْعَرَبِ»

''پھر وہ نئی حکومت، نئی کتاب، نئی سنت اور نیا دین عرب میں نافذ کرے گا۔''

شیعی کتب میں اور بھی بہت کچھ لکھا ہوا ہے جس میں ان کے محققین خود الجھ کر رہ گئے ہیں۔ حق یہ ہے کہ یہ سب موہومہ اور گھڑی ہوئی باتیں ہیں جو سو فیصد بے اصل ہیں۔ جن کا حقیقت سے کوئی بھی تعلق نہیں۔ اہل سنت اور اہل تشیع کے درمیان اور بھی جگہ جگہ فرق ہے مگر فی الحال یہ دس موٹے موٹے فرق بتانے ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ فرق سمجھنے والوں کے لئے یہ بھی کافی ہیں۔

مبالغہ آمیز مناقب اہلِ بیت رضی اللہ عنہم

اہلِ بیت کرام رضی اللہ عنہم کی مدحت اور فضیلت بیان کرنا امرِ مستحسن اور خوش نصیبی ہے، لیکن وہ بیان کرنی چاہیے جو سنداً ثابت ہو۔ مگر دیکھا گیا ہے کہ مدحت وفضیلت بیان کرنے میں زمین وآسمان کے قُلابے ملا دیئے جاتے ہیں، جس سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ دنیا جہان کی انسانی اور رحمانی تمام تر تعریفیں اور فضیلتیں جمع ہو کر اہلِ بیت اطہار رضی اللہ عنہم میں سمو گئی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تو امت کو خود اپنی بے جا اور مبالغہ آمیز مدح سے منع فرمایا ہے، مگر لوگوں نے ہر بات پاس ہی سے گھڑنی ہے۔ اور اپنا الگ ہی جتّھہ اور عقیدہ بنانا ہے انھیں اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات وفرمودات سے کیا علاقہ؟ وہ تو وہی کریں گے جو اللہ تعالیٰ کو مرغوب نہ ہو، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو محبوب نہ ہو، خود پنجتن اور اہلِ بیت کرام رضی اللہ عنہم جس سے بیزار اور متنفر ہوں۔ اور جو علی مرتضی، حسن، حسین اور فاطمہ رضی اللہ عنہم کے اسوہ وطریقہ کے خلاف ہو۔ انسان کو رحمان بنا دینا مسلمان کا شیوہ نہیں۔ یہ یہود ونصاریٰ اور کفار ومشرکین کا دستور ہے۔ اور سچا مسلمان وہی ہے جو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام پر اہتمام اور شوق ومحبت سے چلتا اور پنجتن واہلِ بیت رضی اللہ عنہم کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ پنجتن واہلِ بیت رضی اللہ عنہم کا راستہ کوئی قرآن وسنت سے جُدا نہ تھا، یقیناً ان کا راستہ بھی وہی تھا جو قرآن میں ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ

''یہ میرا سیدھا راستہ ہے پس تم اسی کی پیروی کرو۔''[1]

وہ راستہ قرآن کا تھا، حدیث کا تھا، اسلام کا تھا، توحید و سنت کا تھا۔ جملہ صحابہ و اہل بیت رضی اللہ عنہم کا اور ائمہ کرام رحمہم اللہ کا تھا۔

صحابہ و اہلِ بیت رضی اللہ عنہم کے مناقب کا جابجا قرآن و حدیث میں ذکر ملتا ہے اور اس کثرت سے ملتا ہے کہ ان کی فضیلت میں کسی کو کوئی شبہ باقی نہیں رہتا، لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ اس مبالغہ آمیزی کی آخر ضرورت کیا تھی؟ جائے تعجب ہے کہ اہلِ بیت اطہار رضی اللہ عنہم کے فضائل گھڑ گھڑ کر بیان کیے گئے، اور اس سلسلے میں معمولی غلو نہیں انتہائی غلو سے کام لیا گیا۔ اور اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت کی ہولناکیوں سے بے نیاز ہو کر من مانی تفسیر کرنے اور احادیث وضع کرنے سے بھی دریغ نہ کیا گیا۔ مثلاً کہا گیا کہ ارشادِ قرآنی: ﴿ وَاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا ﴾[2] سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں، اور ﴿ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ﴾[3] میں ''ذِبحِ عظیم'' سے مراد حضرت حسین رضی اللہ عنہ ہیں۔ اور ﴿ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ ﴾[4] سے مراد خلافتِ علی رضی اللہ عنہ ہے۔

علاوہ ازیں یہ بھی کہا گیا کہ آیت: ﴿ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ ﴾[5] میں ''فِيْ وِلَايَةِ عَلِيٍّ'' کے الفاظ بھی تھے، اسی طرح آیت: ﴿ نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا ﴾[6] میں ''فِيْ عَلِيٍّ'' کے الفاظ بھی تھے، اور ﴿ نُوْرًا مُّبِيْنًا ﴾[7] سے پہلے بھی علی رضی اللہ عنہ کا نام تھا اور یہاں تک کہہ دیا کہ بہت سی آیات جن میں اہلِ بیت کے مناقب کا ذکر ہے، وہ قرآن سے نکال دی گئیں۔[8] غرض بڑی بڑی اور عجیب و غریب باتیں کی گئیں کہ جنھیں سن اور

---

[1] الانعام، 6: 153. [2] بنی اسرائیل، 17: 80. [3] الصافات، 37: 107. [4] الحشر، 59: 7.
[5] النساء، 4: 69,13 وغیرہ. [6] البقرة، 2: 23. [7] النساء، 4: 174 [8] دیکھیے الشیعه والسنه، ص: 109 وما بعدها.

پڑھ کر آدمی حیران رہ جاتا ہے۔

قرآن مجید میں تحریف کے علاوہ احادیث میں بھی وضع واختراع سے کام لیا گیا، مثلاً کہا گیا کہ: جو آدم علیہ السلام جیسا علم، نوح علیہ السلام جیسا تقویٰ، ابراہیم علیہ السلام جیسا حلم، موسیٰ علیہ السلام جیسا رعب، عیسیٰ علیہ السلام جیسی عبادت دیکھنا چاہے تو وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دیکھ لے۔"

حضرت علی کی محبت کا ذکر کرتے ہوئے یہ حدیث تراشی گئی:

"حبّ علی رضی اللہ عنہ ایک ایسی نیکی ہے جس کی موجودگی میں کوئی برائی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔" نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ اگر مدد نہ کرتے تو آدم علیہ السلام کی توبہ قبول نہ ہوتی، نوح علیہ السلام کا سفینہ کنارے نہ لگتا، ابراہیم علیہ السلام کی آگ ٹھنڈی نہ ہوتی، یوسف علیہ السلام چاہ کنعان سے باہر نہ آتے، یعقوب علیہ السلام کی بینائی نہ لوٹتی، وغیرہ۔"

یہ حدیث بھی تراشی گئی: "میں علم کا ترازو ہوں' علی رضی اللہ عنہ اس کے دونوں پلڑے، حسن حسین رضی اللہ عنہما اس کی رسیاں اور فاطمہ رضی اللہ عنہا اوپر کی پکڑنے والی رسی ہے۔"

اور یہ بھی: "میں اور علی اللہ کے نور سے پیدا ہوئے ہیں۔" اور یہ بھی کہ "جنت میں ہر درخت کے پتے پر پنجتن کے نام لکھے ہوئے ہیں۔" اور یہ بھی کہ "جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جنت کی خوشبو سونگھنا چاہتے تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو سونگھ لیتے۔ اور وہی (جنت کی خوشبو) آپ رضی اللہ عنہا سے آجاتی۔"

کہاں تک تحریر کریں، کیونکہ یہ سلسلہ ہزاروں کی تعداد تک پہنچتا ہے۔ اگر ان کا احاطہ کریں تو الگ ضخیم کتاب تیار ہو جائے گی۔

اس میں شبہ نہیں کہ قصّاص اور وُعّاظ وغیرہ نے بھی یہ مشغلہ اختیار کیا، مگر عقیدت کیشانِ اہلِ بیت رضی اللہ عنہم ان سب پر بازی لے گئے، کوئی ان کی ہوا کو بھی نہ پہنچ سکا۔

کسی بزرگ کی فضیلت ومنقبت بیان کرتے وقت ہر قسم کی رنگ آمیزی، حاشیہ آرائی اور مبالغہ وغلو سے پرہیز کرنا چاہیے۔ کسی کا مرتبہ حد سے گھٹانا چاہیے نہ حد سے بڑھانا

چاہیے، وہی بیان کرنا چاہیے جو حقیقت پر مبنی ہو، حضرات اہلِ بیت رضی اللہ عنہم کی وہی شان کافی اور بہت ہے، جو اللہ اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہے، وہی شان صحیح اور سچی ہے، اسی کو بیان کرنا چاہیے، مبالغہ آمیزی سے کلیتًا اجتناب کرنا چاہیے۔ لیکن اس کے لیے قرآن و حدیث کے مطالعہ کی خاصی ضرورت ہے، اس کے بغیر منزل ملنا ناممکن اور محال ہے۔

قرآن مجید کی صحیح تفسیر وہی ہے، جو خود قرآن نے بیان کی یا حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی۔ اور اس کا مفہوم خلفائے راشدین، صحابہ و اہلِ بیت رضی اللہ عنہم نے متعین فرمایا۔ ایسی تفسیر یکسر غیر معتبر ہوگی جو مذکورہ تفسیر سے متصادم ہو، کیونکہ جس رب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن دیا، اس رب نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا مفہوم بھی سمجھایا اور رب تعالیٰ نے حدیث کی حفاظت کا بھی اہتمام فرمایا، اور ائمہ محدّثین رحمہم اللہ کو پیدا فرمایا، جنھوں نے حدیث کے اصول اور اسماء الرجال و جرح وتعدیل کے قواعد مرتب کیے کہ جن کی بدولت سارا مسئلہ آسان ہوگیا، چنانچہ آج ہم حدیث کی باقاعدہ درجہ بندی کر سکتے ہیں اور صحیح و غلط کو چھانٹ سکتے ہیں۔ مگر چونکہ یہ فن محنت چاہتا ہے بہت محنت، اس لیے اور زیادہ لوگ محنت سے گھبراتے ہیں..... خوب یاد رکھیے! ہر بات کو پرکھنے کا اصل معیار محض قرآن و حدیث ہے، یہی اسلام ہے، اور اسی میں حق وصداقت مضمر ہے۔ جو اس سے دور رہا سمجھ لیجیے وہ اللہ سے دور، نبی سے دور، قرآن سے دور، حدیث سے دور، صحابہ و اہلبیت رضی اللہ عنہم سے غرض سب سے دور رہا۔ اللہ ہمیں ایسی دُوریوں سے دور رکھے۔ اپنا اور اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا صحیح قرب عطا فرمائے۔ آمین۔

باب : 11

اہلِ تشیُّع اور اُن کی اقسام

مذہب شیعہ بھی فرقہ بندی سے خالی نہیں اور اس کے فرقوں اور عقائد میں کہیں جزوی اور کہیں فروعی اور کہیں اصولی اختلاف پایا جاتا ہے۔ ذیل میں شیعوں کی چند اقسام اور ان کے مختصر عقائد درج کیے جاتے ہیں:

1 امامیہ

یہ ''اثنا عشری'' کہلاتے ہیں اور بارہ اماموں کو مانتے ہیں۔ ان کے نزدیک ان ائمہ میں سے ہر ایک معصوم اور قطعی بے گناہ ہے اور ہر ایک کی امامت برحق ہے۔ باقی تمام مدعیانِ امامت باطل ہیں۔ اور ان کے بقول یہ آیت: ﴿اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً﴾ [1] کے یہ معنی ہیں کہ علی رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد ہی مستحقِ خلافت ہے۔

2 زیدیہ

یہ فرقہ زید بن علی، زین العابدین بن حسین رضی اللہ عنہ اور زید کی اولاد کو امام مانتا ہے۔ مگر زین العابدین کو امام تسلیم نہیں کرتا، زیدیہ کی بھی چار قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو زید بن زین العابدین کے مطیع ہیں۔ دوسرے وہ جو زید بن زین العابدین کی اولاد کے یعنی ''زیوں'' کے پیرو ہیں۔ تیسرے وہ جو زید بن موسیٰ کاظم کی اولاد کے متبع ہیں۔ اور چوتھے وہ جو زید جوّاد بن حسن مثنیٰ کی اولاد کو حق مانتے ہیں۔

---

[1] البقرة 2:30

3 اسماعیلیہ

یہ لوگ اسماعیل بن جعفر صادق رحمہ اللہ کی امامت کے معتقد ہیں اور ان کے بعد کسی کو امام تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا ایک گروہ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ امام جعفر کے بعد ہر دور میں سات امام قیامت تک آتے رہیں گے۔ خواہ وہ ظاہر ہوں یا باطن، لیکن پاک و ہند میں جو شیعہ ''اسماعیلی'' کہلاتے ہیں، ان کو ''آغا خانی'' بھی کہتے ہیں، ایک آغا خان کے بعد دوسرا آغا خان ان کا پیشوا بن جاتا ہے، یہ لوگ جَدُّ اصحابِ قَلْعَة المَوْت حسن بن صبّاح کے معتقد ہیں۔ اس کے بارے میں لکھا ہے: كَانَ مِن كِبَارِ الزَنَادِقَةِ ''یہ بڑے زندیقوں میں سے تھا۔''[1] اور ان کا مذہبی مرکز ایران ہے۔

4 تفضیلی

یہ فرقہ باقی عقائد تو دوسرے شیعوں کے سے رکھتا ہے، مگر (اللہ کا شکر ہے) اصحابِ ثلاثہ یعنی ابوبکر، عمر، عثمان رضی اللہ عنہم کا شاتم نہیں یعنی انھیں برا بھلا نہیں کہتا۔

5 محوی

افغانستان اور صوبہ خیبر کے قبائلیوں میں شیعوں کی ایک جماعت ''محوی'' کہلاتی ہے، کیونکہ یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت حسن رضی اللہ عنہ، حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی قبریں بنا کر پھر یہ کہہ کر مٹا دیتے ہیں کہ ''تم سے یزید کا مقابلہ بھی نہیں ہو سکا۔'' یہ لوگ اس طرح کے کام ایامِ محرم میں کرتے ہیں، علاوہ بریں کچھ اور اقسام بھی ہیں جن کا تذکرہ باعثِ طوالت ہے جو ترک کیا جاتا ہے۔

---

[1] میزان الاعتدال: 500/1.

بارہ اِمام

اہل تشیُّع جن دوازدہ (12) ائمہ سادات کی ''برحق'' امامت کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کے سوا اور کوئی امام نہیں ہے۔ ان کے نام اور مختصر حالات ذیل میں ملاحظہ کیجیے:

1 سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ

بیت اللہ میں آپ کی ولادت ہوئی۔ 36 ہجری میں خلیفہ ہوئے۔ 19 رمضان 40 ھ کو زخمی ہو کر 21 رمضان 40 ھ کو رحلت فرمائی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچیرے بھائی اور داماد تھے، آپ رضی اللہ عنہ کا ہر عمل کتاب و سنت کے مطابق تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ بے حد متقی، عبادت گزار اور صابر و شاکر تھے۔ ''الکافی'' کے مطابق آپ نے بیس حج کیے۔ اسی لیے امام المتقین مشہور تھے۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مناقب احادیث میں بکثرت وارد ہیں جن سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک آپ رضی اللہ عنہ کی قدر و منزلت کس قدر تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کا جھنڈا ان کے ہاتھ میں دیا اور ساتھ ہی فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کے ہاتھ پر خیبر فتح فرمائیں گے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ جو شخص اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول اس سے محبت کرتے ہیں، حدیث کے مطابق وہ علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ تھے۔ ان کے مفصل حالات اور کارنامے آپ

[1] طبقات ابن سعد: 3/19-40

ہماری الگ زیر ترتیب کتاب ''خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم'' میں پڑھیں گے۔ان شاءاللہ۔

2 سیدنا حسن رضی اللہ عنہ

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے بڑے صاحبزادے ہیں۔ 3 ہجری میں آپ کی ولادت اور 48 ہجری میں زہر سے وفات ہوئی۔ بہت عبادت گذار، شب زندہ دار، صاحب دانش اور عامل قرآن وسنت تھے۔کئی حدیثوں کے راوی ہیں۔شکل وصورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ تھے۔ بڑے متحمل مزاج اور صابر وشاکر تھے۔

آپ رضی اللہ عنہ نیکی میں بہت مشہور تھے۔ بڑے سخی اور نرم دل تھے۔آپ نے کئی حج کیے۔ایک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے خصوصی دعا بھی فرمائی تھی:

«اَللّٰھُمَّ إِنِّی أُحِبُّهُ فَأَحِبَّهُ»

''اے اللہ! میں اس سے محبت کرتا ہوں، لہٰذا تو بھی اس سے محبت فرما۔''[1]

اور ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف لائے تو فرمایا:

«إِنَّ ابْنِی ھٰذَا سَیِّدٌ، وَلَعَلَّ اللّٰهَ أَنْ یُّصْلِحَ بِهِ بَیْنَ فِئَتَیْنِ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ»

''یہ میرا فرزند سردار ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے سے مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں کے درمیان صلح کرائے گا۔''[2]

آپ رضی اللہ عنہ کچھ احادیث کے بھی راوی ہیں۔ جو متفرق کتب میں آئی ہیں۔آپ کی اولاد میں بارہ بیٹے اور پانچ بیٹیاں تھیں۔

بیٹوں میں سے میدان کربلا میں عمر، قاسم اور عبداللہ رحمہم اللہ شہید کر دیے گئے تھے۔اور آپ کی نسل چار بیٹوں سے جاری ہوئی تھی، یعنی زید، حسن مثنیٰ، حسین الاثرم اور

[1] صحیح البخاری، فضائل أصحاب النبی ﷺ، حدیث:3849. [2] صحیح البخاری، حدیث: 3846.

عمر رحمہ اللہ۔ مگر حسین اور عمر رحمہ اللہ کا سلسلہ ختم ہو گیا اور اب دنیا میں زید اور حسن مثنیٰ رحمہ اللہ کی اولاد باقی ہے۔

3 سیدنا حسین رضی اللہ عنہ

زیرِ نظر کتاب میں آپ رضی اللہ عنہ کی مکمل سیرت مرقوم ہے۔ آپ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ سے بہت مشابہ تھے۔ ممتاز خصوصیات رکھتے تھے۔ عامل قرآن و سنت تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ کی شرافت ونجابت اور کیفیات عبادت کون نہیں جانتا؟ ''الاستیعاب'' میں ہے۔ مصعب الزبیری سے روایت ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے پچیس حج پا پیادہ کیے۔

صحیح بخاری (حدیث: 3747) میں ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «اَللّٰهُمَّ إِنِّي أُحِبُّهُمَا فَأَحِبَّهُمَا» (اے اللہ! میں ان سے محبت کرتا ہوں تو بھی ان سے محبت فرما۔'' اسی طرح سنن ترمذی کی مشہور روایت ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:'' مجھے خوشخبری دی گئی ہے:

«بِأَنَّ فَاطِمَةَ سَيِّدَةُ نِسَاءِ أَهْلِ الْجَنَّةِ وَ أَنَّ الْحَسَنَ وَ الْحُسَيْنَ سَيِّدَا شَبَابِ أَهْلِ الْجَنَّةِ»

''حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا خواتینِ جنت کی سردار ہیں۔ اور حسن و حسین رضی اللہ عنہما نوجوانانِ جنت کے سردار ہیں۔''[2]

4 سیدنا زین العابدین رحمہ اللہ

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے لختِ جگر ہیں۔ 38ھ میں تولد ہوئے۔ 95ھ میں بعمر 57 سال انتقال فرمایا۔ اصلی نام علی ہے، بکثرت عبادت کرنے کی وجہ سے لقب

[1] تھذیب التھذیب: 2/295-301. [2] جامع ترمذی، المناقب، حدیث:3781.

"زین العابدین" سے مشہور ہوئے۔ ان کو علی عابد بھی کہا جاتا ہے۔[1]

انھیں بھی بہت فضیلت حاصل ہے، ان کے بارے میں ائمہ اسلام کی آراء ملاحظہ ہوں:

* امام یحییٰ بن سعید علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:

«هو أفضل هاشمي رأيته في المدينة يقول ياهل العراق أحبونا حب الإسلام ولا تحبونا حب الأصنام فما برح بنا حبكم حتى صار عارا علينا»

"آپ ہاشمی خاندان کے ممتاز چشم و چراغ ہیں۔ میں نے انھیں مدینہ منورہ میں دیکھا، آپ فرمارہے تھے:" اے اہل عراق تم ہمارے ساتھ اسلامی تعلیمات کے تحت محبت رکھو۔ اور اصنام کی طرح ہماری محبت (پرستش) سے باز رہو۔ تمھاری محبت ہم پر بدنما داغ بن جائے گی۔"[2]

* امام محمد بن شہاب زُہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«لم أر هاشميا أفضل من علي ابن حسين»

"میں نے علی بن حسین (یعنی سیدنا زین العابدین) سے افضل کسی ہاشمی کو نہ پایا۔"[3]

* امام محمد بن عثمان ذھبی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:

«وكان له جلالة عجيبة وحق له والله فقد كان أهلا للإمامة العظمٰى لشرفه و سئودده و علمه......»

"آپ کو عجیب عزو شرف حاصل تھا۔ اور آپ اس کے حق دار تھے۔ اور آپ

---

① طبقات ابن سعد: 5/211-222. ② طبقات ابن سعد: 5/214. ③ صفوة الصفوة: 2/99، ابو الفرج عبد الرحمن بن علی دارالمعرفة بیروت 1079.

اپنے شرف، سیادت، علم، ملیّ درد اور کمال ذہانت و ذکاوت کی وجہ سے امامتِ عظمٰی کے حق دار تھے۔''

امام ابو حازم مدنی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''آپ ثقہ، قابل اعتماد اور کثیر الحدیث تھے بڑے نفیس، متقی اور عالی مرتبہ انسان تھے۔''

سیدنا زین العابدین کی نسل دنیا میں چھ فرزندوں کے ساتھ جاری و باقی ہے یعنی محمد باقر، عبد اللہ الباہر، زید الشہید، عمر اور شرف، حسین الاصغر، علی الاصغر رحمہم اللہ، اور دو بیٹیاں خدیجہ اور ام کلثوم رحمہما اللہ تھیں۔

بقول امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ آپ تابعین میں بہت زیادہ علم و تدیّن رکھتے اور علوم دینیہ قرآن، حدیث اور فقہ وغیرہ میں ماہر کامل تھے۔

5 سیدنا باقر رحمہ اللہ

آپ علی زین العابدین رحمہ اللہ کے فرزند ہیں۔ 57 ھ میں ولادت اور 114 ھ میں وفات ہوئی۔ نہایت عالم و عامل، زاہد و عابد، عاشقِ کلام اللہ اور شیدائے کلام الرسول تھے۔ ابو جعفر کنیت اور محمد باقر نام ہے۔[1]

ان کے متعلق ائمہ دین کے ارشادات ملاحظہ ہوں:

❁ امام محمد سعد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«كان كثير العلم و الحديث»

''آپ بڑے عالم اور حدیث کے شناور تھے۔''

❁ ایک اور امام فرماتے ہیں:

---

① طبقات ابن سعد: 5/320-324

«هو أحد من جمع العلم و الفقه والديانة»

''آپ ان عظیم لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے علم، فقہ اور دین کو جمع کیا ہے۔''

❀ امام ذھبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«و لقد كان أبو جعفر إمامًا مجتهداً، تاليا لكتاب اللّٰه كبيرَ الشان ...... لما تجمَّع فيه من صفات الكمال»

''آپ امام، مجتہد، قرآن مجید کی تلاوت کرنے والے بڑی شان کے حامل تھے۔ آپ میں صفات کمال جمع تھیں۔''[1]

6 سیدنا جعفر رحمہ اللہ

حضرت امام محمد باقر رحمہ اللہ کے نور نظر ہیں۔ 83ھ میں پیدائش اور 148ھ میں رحلت ہوئی۔ پابندیٔ عبادات میں مشہور زمانہ تھے۔ حیات عزیز کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و اشاعت کے لیے وقف تھی۔ بڑے عالم، عابد اور متقی بزرگ تھے، کنیت ابوعبداللہ اور پورا نام جعفر صادق ہے۔ نامی گرامی علماء و مشائخ فقہاء و ائمہ آپ کے تلامذہ ہیں۔[2]

آپ کے بارے میں حضرت امام ابو حنیفہ علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: «ما رأيت افقه من جعفر بن محمد» ''میں نے جعفر بن محمد الصادق سے بڑھ کر کسی کو فقیہ نہیں پایا۔''

❀ امام ابو حاتم رحمہ اللہ کہتے ہیں:

«ثقة لا يسئل عن مثله»

---

[1] سير أعلام النبلاء: 402/4. [2] تهذيب التهذيب: 2/103-105.

”آپ ثقہ ہیں، آپ جیسے آدمی کے بارے میں پوچھنا درست نہیں۔“

❁ امام ذھبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«الامام الصادق شیخ بنی ھاشم أبو عبد اللّٰہ القرشی الھاشمی»

”امام صادق، بنی ہاشم کے اہم بزرگ ہیں۔ کنیت ابوعبداللہ قریشی ہاشمی ہے۔“[1]

❁ عبدالجبار بن عباس ہمدانی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ ہم مدینہ منورہ آئے ہوئے تھے اور واپس جانے کا ارادہ کررہے تھے کہ سیدنا جعفر صادق ہمارے پاس تشریف لائے۔ اور فرمایا:

”تم اپنے شہر کے اچھے لوگ ہو۔ تم وہاں کے لوگوں کو ہماری طرف سے یہ بات پہنچا دو کہ جس شخص نے یہ کہا کہ میں (جعفر صادق) مفترض الطاعت (واجب اطاعۃ) امام ہوں، میں اس سے لاتعلق ہوں اور جس شخص نے میرے متعلق یہ بات اڑائی کہ میں ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما سے لاتعلق ہوں میرا اس سے بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔“

معلوم ہوا یہ امام بزرگ سب لوگوں کے مشترک امام و بزرگ اور محض قرآن وسنت کے عامل و حامل تھے۔ اللہ ہمیں سب ائمہ دین کی محبت عطا کرے۔ آمین۔ ان کی نسل پانچ فرزندوں سے جاری ہے، موسیٰ کاظم، اسماعیل، علی المرتضی، محمد المامون، اسحاق رحمہم اللہ۔

7 سیدنا موسیٰ کاظم رحمہ اللہ

امام جعفر صادق رحمہ اللہ کے دلبند ہیں۔ 129 ھ میں پیدا اور 183 ھ میں بعہد ہارون، زندانِ بغداد میں فوت ہوئے۔ موسیٰ نام، ابوالحسین کنیت اور کاظم لقب تھا۔ بڑے

① سیر أعلام النبلاء: 404/1.

زاہد، سخی، فقیہ و متقی تھے۔ برائی کا بدلہ نہ لیتے اور سب سے نیکی کرتے تھے۔ بے حد صابر و شاکر، قانع و حلیم تھے۔ قرآن کریم اور حدیث شریف کا پابندی سے درس دیتے تھے۔ بازاروں میں کھڑے ہوکر وعظ فرماتے اور تلقین کرتے کہ کتاب اللہ اور سنت نبوی کی اطاعت کے بغیر کسی کی نجات نہ ہوگی۔[1]

8 سیدنا رضا رحمہ اللہ

سیدنا موسیٰ کاظم رحمہ اللہ کے نورِ چشم تھے۔ ولادت 148ھ اور رحلت 203 ہجری میں ہوئی۔ نام علی رضا اور کنیت آپ کی بھی ابوالحسن ہے۔ اپنے عہد میں سب سے زیادہ عالم اور سب سے زیادہ سخی سمجھے جاتے تھے۔ آپ کو خلافت پر بٹھایا گیا اور آپ کا سکہ جاری کیا گیا۔[2]

9 سیدنا تقی رحمہ اللہ

سیدنا علی رضا کے نورِ دیدہ ہیں۔ 195ھ میں پیدا ہوئے 220ھ میں انتقال فرمایا، نام محمد جواد، کنیت ابوجعفر ہے۔ خلیفہ مامون الرشید کی صاحبزادی اُم فضل ان کے نکاح میں تھیں۔ آپ نے صرف 25 سال عمر پائی، مگر تھوڑی عمر میں بہت کچھ حاصل کر لیا۔ اور صِغرِ سنی ہی میں ان کے علم و فضل کا چرچا ہوگیا۔ بہت پرہیز گار تھے۔ پورا قرآن مجید اور چار ہزار حدیثیں ازبر تھیں جس سے ان کے شغف بالقرآن والحدیث کا خوب اندازہ ہوتا ہے۔[3]

10 سیدنا نقی رحمہ اللہ

سیدنا تقی کے نورِ عین ہیں۔ نام علی ہادی، کنیت ابوالحسن، لقب نقی، زکی، عسکری

---

[1] تہذیب التہذیب: 10/339-340. [2] تہذیب التہذیب: 7/387-389. [3] أعلام الوری بأعلام الهدیٰ، ص: 355,344۔ رحمة للعالمين: 2/122

ہے۔ بہت خوبصورت، واعظِ خوش بیان، خطیبِ شیریں مقال تھے۔ 214 ہجری میں ولادت اور 254ھ میں رحلت ہوئی۔ [1]

11 سیدنا حسن عسکری رحمہ اللہ

سیدنا نقی رحمہ اللہ کے جگر گوشہ ہیں۔ 232ھ میں پیدا ہوئے اور 260ھ میں وفات پائی۔ نام حسن زکی، کنیت ابو محمد، لقب عسکری ہے۔ 28 سال عمر پائی۔ آٹھ سال کی عمر میں قرآن حفظ کر لیا۔ اور دس سال کی عمر میں درس حدیث میں بیٹھے اور ہزار ہا حدیثیں یاد کر لیں۔ نیک سیرت، نیک خو، خوشرو، عالم و فاضل، عفیف و خلیق، حلیم و کریم متواضع اور سخی تھے۔ [2]

12 سیدنا مہدی

255ھ میں تولد ہوئے۔ سیدنا حسن عسکری کے فرزند ہیں۔ محمد مہدی نام ہے۔ شیعہ کے اعتقاد میں آپ فوت نہیں ہوئے بلکہ پوشیدہ ہو گئے ہیں۔ اور قرب قیامت ظاہر ہوں گے۔ شیعہ حضرات ان کے منتظر بیٹھے ہیں۔ اور اسی لیے ان کو قائم، حجت، غائب، خاتم وغیرہ کہتے ہیں..... لیکن مستند تاریخوں سے ثابت ہے کہ آپ کی کنیت ابو القاسم تھی۔ شادی شدہ تھے۔ اولاد ہوئی۔ علم و فضل زہد و تقویٰ میں مشہور تھے۔ بادشاہ کے خوف سے کہیں رُوپوش ہو گئے اور اسی حالت میں انتقال کر گئے۔ اسی لیے کسی کو ان کی تاریخ وفات پتہ نہیں۔ آپ کی بابت طرح طرح کے جھوٹے افسانے گھڑ لیے گئے۔ [3]

---

[1] البداية والنهاية: 15/11۔ رحمة للعالمين: 122/2. [2] أعلام الورىٰ بأعلام الهدىٰ: 367-380، ورحمة للعالمين: 123/2.

[3] بارھویں امام کے متعلق علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''ان کا پیدا ہونا ہی ثابت نہیں۔'' الشيعة والسنة، ص: 69.

یہ سب امام بڑے اُونچے مرتبہ پر فائز تھے۔ زندگی بھر قرآن وسنت کے عامل و حامل رہے اور لوگوں کو بھی قرآن وسنت ہی کی دعوت دیتے رہے۔ رحمهم الله تعالٰی علیهم اجمعین. لیکن یاد رکھئے! یہ شیعہ تھے نہ انھوں نے شیعہ مذہب کی بنیاد رکھی، نہ شیعہ مذہب کا پرچار کیا۔ نہ اس مذہب کی فقہ مرتب کی۔ یہ سب کے سب داعی، رسول اکرم ﷺ کے مطیع و متبع، محبّ و جاں نثار، نرم دل، قرآن وسنت کے حامل و عامل اور بڑے متقی تھے۔ اہلسنت کے تمام طبقات شیعہ مذہب سے اختلاف رکھتے ہیں جیسا کہ آپ پیچھے پڑھ چکے ہیں۔ لیکن یہ ان ائمہ سے اختلاف نہیں رکھتے۔ البتہ ان کی بابت وضع کردہ جھوٹے افسانوں کو نہیں مانتے۔ اور ان کے نام پر قرآن وسنت سے متصادم احکام، خود ساختہ فقہ اور گھڑے ہوئے مسائل کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان ائمہ رحمهم الله نے اپنی الگ فقہ بنائی، نہ اس کی بنا رکھی، نہ لوگوں کو ادھر بلایا، ان کا الگ کوئی مذہب یا فرقہ یا گروہ نہ تھا۔ یہ صرف قرآن وسنت پیش کرتے اور انھی دونوروں کا پرچار کرتے تھے۔ وہ شیعہ مذہب نہیں رکھتے تھے، نہ وہ شیعیت کے داعی و مبلغ تھے، ہمارے سب کے بزرگ اور امام تھے۔ انھوں نے اپنی تبلیغی و دینی مساعی سے قرآن وحدیث کا راستہ واضح فرمایا۔ ہمیں صرف اللہ اور اس کے رسول برحق ﷺ کی طرف بلایا۔

دعوتِ فکر

ان دوازدہ یعنی 12 ائمہ کرام رحمہم اللہ کے پاکیزہ حالات پڑھیے۔ اور غور سے پڑھیے، آپ کو یہی نظر آئے گا کہ ان بزرگوں کی مقدس زندگیاں قرآنِ کریم اور سنت رسول اللہ ﷺ کے احیاء و بقاء، تبلیغ و اشاعت، اتباع قرآن و سنت، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کے لئے وقف تھیں۔ ان کا ایک ایک لمحۂ حیات، اللہ تعالیٰ اور اس کے نبی محترم ﷺ کے احکام کی تعمیل میں صرف ہوتا تھا۔ ان کا ہر ایک عمل اور ہر ایک کام قرآن و حدیث کے تابع تھا۔ اور خداوندِ قدوس نے انہیں بدعات و محدثات اور شرک و ضلالت کی تردید و تکذیب کے لیے مامور فرمایا تھا۔ ان کا عقیدہ اور مسلک بالکل وہی تھا جو رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے اہل بیت اور اصحاب رضی اللہ عنہم کا تھا۔ جیسا کہ آپ مطالعہ کر چکے ہیں۔ لیکن ان کے نام نہاد معتقدین ان اکابرین کا نام تو بہت لیتے ہیں مگر ان کے عمل و طریق کے خلاف چل کر پنجتن پاک، اہلِ بیت اطہار اور بارہ اماموں کی فرمانبرداری اور پیروی جو کہ حقیقی محبت کی علامت ہے، سے گریز کرتے ہیں۔ یہ ائمہ رحمہم اللہ صرف شیعہ کے ائمہ نہیں اہلسنت کے بھی ائمہ ہیں۔ انھیں شیعہ مذہب کے بانی یا حامی یا مبلغ کہنا صحیح نہیں۔ جو لوگ ایسا سمجھتے ہوئے ان ائمہ کرام رحمہم اللہ کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں وہ جہالت میں گرفتار ہیں۔ ان ائمہ کو نہایت عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھنا چاہیے...... جن لوگوں نے ان ائمہ کے بارے میں غلط قصے

کہانیاں منسوب کیے اور قرآن وسنت کے مخالف مسائل گھڑ کر ان کے ذمے لگا دیے اور انھیں خدائی صفات تفویض کی ہوئی ہیں وہ مجرم ہیں۔ ائمہ کرام رحمہم اللہ بے قصور اور بے گناہ ہیں۔ ان کی تعلیمات شریعت کے خلاف نہیں تھیں بلکہ مطابق تھیں۔ وہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کو برحق خلفاء جانتے تھے۔ صحیح سند کے ساتھ اہل تشیع کا کوئی ایک بنیادی مسئلہ بھی ان سے ثابت نہیں۔ ان کی اذان، نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج غرض جملہ مسائل وہی تھے جو قرآن و حدیث میں مذکور ہوئے، وہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا احترام بجالاتے اور انھی کے طریق و تعامل کو اُجاگر کرتے تھے۔ قرآن کریم کو اللہ کی سچی کتاب جانتے تھے۔ انہیں خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی عظمت اور قرآن مجید کی صداقت کا پورا یقین تھا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ کو دل و جان سے عزیز رکھتے تھے۔ ان کی اذان، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ اہلسنت کے مطابق تھا۔ وہ اصلی اہلسنت تھے۔ یہ ہمیں پختہ یقین رکھنا چاہیے کہ انھوں نے ہرگز کسی الگ شریعت اور فرقے کی بنیاد نہیں رکھی۔

کاش! ان سے نام کی محبت رکھنے والے دوست ان کے درست حالات پڑھیں اور ان کی اطاعت کر کے اپنی زندگی کو جنت کا نمونہ بنائیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں سب ائمہ دین اور اولیائے کاملین رحمہم اللہ کی سچی محبت، صحیح عزت و تکریم اور سچی عقیدت رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اور شیعہ سنی سب کو قرآن وسنت کے ایک پلیٹ فارم پر جمع فرمائے۔ (آمین ثم آمین)

حضرت امام الشہداء رضی اللہ عنہ کی یہ سیرت نامکمل رہے گی اگر اس میں آپ رضی اللہ عنہ کی ازواج واولاد کا ذکر نہ کیا جائے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے کئی نکاح کیے۔ جن کا ثبوت مل سکا ہے وہ یہ ہیں:

1 رباب کلبیہ بنت امرأ القیس

ان کے والد عیسائی تھے۔ جو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے عہد میں مسلمان ہوئے، رباب کے بطن سے حضرت عبداللہ اور حضرت سکینہ پیدا ہوئیں۔

2 لیلیٰ بنت ابی مرہ

یہ علی اصغر کی والدہ تھیں۔ وہ علی اصغر جنھوں نے چھ ماہ کی عمر میں کربلا میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں میں شہادت پائی۔

3 ام اسحاق بنت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ

یہ امام حسن رضی اللہ عنہ کی بیوہ تھیں۔ ان سے فاطمہ صغریٰ پیدا ہوئیں۔

4 شہر بانو یا شاہِ زنان

فارسی الاصل تھیں۔ امام علی زین العابدین کی والدہ یہی تھیں اور علی اکبر بھی انھی

سے پیدا ہوئے۔

5 عائشہ بنت خلیفہ

ان کی اولاد ثابت نہیں۔

6 حفصہ بنت عبدالرحمٰن

یہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی پوتی تھیں۔ بیوہ ہو کر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے نکاح میں آئیں۔ اولاد کا ثبوت نہیں۔

7 عاتکہ بنت زید بن عمرو

یہ کئی بار بیوہ ہو ہو کر آپ رضی اللہ عنہ کے عقد میں آئیں، ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

8 قصاعیہ

ان سے جعفر پیدا ہوئے اور شیر خوارگی ہی میں فوت ہو گئے۔

9 غزالہ

یہ بھی بے اولاد رہیں۔[1]

اسی طرح اور بھی چند نکاح ثابت ہیں مگر ان کی تفصیل اور ازواج کے نام معلوم نہیں ہو سکے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

---

① سیر الصحابۃ: 4/232-233

باب: 13

حضرت حسین رضی اللہ عنہ غیروں کی نظر میں

1 پنڈت گوبند بلبھ پنتھ (سابقہ وزیر داخلہ) ہندوستان

حضرت حسین (رضی اللہ عنہ) کی ذات اس ظلمت اور تاریکی میں ایک منارۂ نور کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کی شہادت انسانیت کو درسِ بصیرت دیتی رہے گی اور اس کو وحشیانہ قوت اور بہیمیت کے مقابلہ میں ثباتِ قدم عطا فرمائے گی۔

جب بھی انسان کے لیے ان لافانی خوبیوں کے تحفظ کا موقع آئے گا جو انسانی تمدن کا جزو لاینفک ہیں اس وقت یہی شہادت اِسے ٹڈی دل دشواریوں کا مقابلہ کرنے کی تاب و طاقت دے گی۔

2 دستوء کیخسرو ومہار کنور (پیشوائے اعظم پارسی)

اگر شہید اعظم حسین (رضی اللہ عنہ) کی قربانیاں نہ ہوتیں تو دنیا اخلاق، مذہب اور صداقت سے ناآشنا رہتی۔ دنیا شہداء کی ممنون ہے، جنھوں نے موت کو ذلت پر ترجیح دی۔ حضرت حسین (رضی اللہ عنہ) ان شہداء کے سردار ہیں، جنھوں نے انسانیت کی خدمت کے لیے جان دی، ہم کو ان کی یاد اپنے عمل سے منانا چاہیے اور اُن کی قربانیوں سے سبق لینا چاہیے۔

3 سوامی کل جکانند مسافر

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی طرف دنیا کے اس جذب وکشش کا سبب کیا ہے؟ بات یہ

ہے کہ کشش دو چیزوں سے پیدا ہوتی ہے۔ ایک حسن، دوسرا احسان، حضرت حسین رضی اللہ عنہ میں یہ دونوں باتیں پائی جاتی ہیں۔ حسن سے مراد یہاں اخلاق ہے جو حسن صورت سے زیادہ جاذب ہے، آپ کے اخلاق کا یہ عالم تھا کہ دشمنوں کو بھی آپ میں کوئی برائی دکھائی نہیں دیتی۔ (لیکن آپ رضی اللہ عنہ میں دونوں حسن اپنے کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ حسین ترین بھی تھے اور بلند ترین اخلاق کے مالک بھی تھے۔ فاروقی)

آپ کا احسان! اس کا کیا پوچھنا، حضرت حسین غریب نہ تھے، مگر ان کا پیسہ غریبوں پر صرف ہوتا تھا، وہ خود فاقہ کرتے تھے رانیاں گھر میں چکی پیستی تھیں، اور بچے بھوکے سوتے تھے، مگر پبلک کے مفاد کا پیسہ وہ اپنے ذاتی مصرف میں نہیں لاتے تھے، انھوں نے میدانِ کربلا میں چار سبق دیے:

① اے لوگو! تم سب بھائی بھائی ہو۔

② اونچ نیچ کی کوئی تفریق نہیں، ان تفریقوں کو مٹا دو۔

③ سچائی کے راستہ پر مرتے وقت تک قائم رہو۔

③ ظالم کے ظلم کا مقابلہ کرو، یہاں تک کہ اس کے تختے کو الٹ دو، دنیا اگر ہماری اس تعلیم پر عمل کرے، تو کوئی وجہ نہیں کہ تمام جھگڑے بکھیڑے ختم نہ ہو جائیں۔

تمام مصیبتیں اس لیے ہیں کہ ایک دوسرے کو پست اور حقیر سمجھا جاتا ہے، چھوت چھات کا خیال چھایا ہوا ہے۔

4 ڈاکٹر جواہر لال روہتکی، ایم ایل اے

حضرت حسین رضی اللہ عنہ جیسے بہادر کسی ایک مذہب اور کسی ایک ملک کے ہیرو نہیں سمجھے جاسکتے۔ میدانِ کربلا میں حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء کی قربانیاں اور وہ بلند مقاصد جن کے لیے انھوں نے اپنی جانیں دیں، موجودہ زمانے کی مبارزان سے سبق حاصل کر

سکتے ہیں۔

مجھے امید ہے کہ ہمارے ملک کا ہر آدمی کربلا کی تاریخ کے ایک ایک ورق کا مطالعہ کرے گا۔ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی قربانیوں کی تقلید اپنے ملک کے مفاد کے لیے کرے گا۔

5 پروفیسر آتمارام ایم اے (ہوشیار پوری)

حضرت حسین رضی اللہ عنہ جسے میں خراج عقیدت پیش کر رہا ہوں، اپنی منفرد شخصیت، اپنی اولوالعزمی، اپنے بلند اور پاکیزہ مقاصد، اپنے کردار اور اپنی ہمت و حوصلہ کی وجہ سے تاریخ اسلام ہی نہیں تاریخ عالم میں بے نظیر حیثیت کا مالک ہے۔

6 مسٹر جیمس کارکرن مصنف ''تاریخ چین''

دنیا میں رستم کا نام بہادری میں مشہور ہے۔ لیکن کئی شخص ایسے گزرے ہیں جن کے سامنے رستم کا نام لینے کے قابل نہیں۔

بہادری میں اول درجہ کا مرتبہ حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما کا ہے۔ کیونکہ میدان کربلا میں ریت پر تشنگی اور گرسنگی کی حالت میں جس شخص نے ایسا کام کیا ہو، اس کے سامنے رستم کا نام وہی شخص لے گا جو تاریخ سے واقف نہیں۔

7 مسٹر آرتھر، این وسٹن، سی آئی اے

حضرت حسین رضی اللہ عنہ میں صبر و استقلال، زورِ اخلاق کے وہ اعلیٰ جواہر اور کمالات موجود تھے جو عام انسانوں میں نہیں پائے جاتے، اس لیے حسین رضی اللہ عنہ کی ذات خود ایک معجزہ ہے۔ حسین کی بہادری اور شجاعت کی مثال شاید ہی دنیا کبھی پیش کر سکے۔ اقوامِ عالم کی تاریخ کبھی کوئی ایسا سورما پیش نہ کر سکی جو ہزاروں سے یکہ وتنہا لڑا، اور

بہ رضا و رغبت مرنے (شہادت پیش کرنے) پر تیار ہو گیا ہو۔

8 سردار کرتار سنگھ، ایم اے، ایل ایل، بی (ایڈووکیٹ ہائی کورٹ) پٹیالہ

بظاہر ہر مسلمان غریب ہے لیکن (حقیقت یہ ہے کہ) مسلمان سب سے زیادہ امیر ہے، کیونکہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ جیسی شخصیت اسے ورثے میں ملی ہے، اگر آپ حسین رضی اللہ عنہ کو بھول جائیں تو اس کا نتیجہ نقصان ہی نقصان ہو گا۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے دنیا اس نکتہ سے ناآشنا اور بیگانہ محض تھی، جذبہ شہادت مسلمانوں نے دنیا کے سامنے پیش ہی نہیں کیا بلکہ اسے عملی جامہ پہنایا اور اس سلسلے میں بہترین نمونہ شہادت کربلا ہے۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اپنی قربانی اور شہادت سے انھیں زندہ کر دیا اور ان پر ہدایت کی مہر لگا دی، حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے جو قلعہ تیار کیا ہے، اسے کوئی گرا نہیں سکتا، کیونکہ یہ قلعہ پتھر چونے سے نہیں بلکہ انسانی زندگی اور خون سے تیار کیا گیا، حضرت حسین رضی اللہ عنہ زمانہ کی سیاسی باتوں کے نبض شناس تھے، کربلا کے میدان میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے جو حربے استعمال کیے وہ انصاف، پریم (پیار و محبت) اور قربانی ہیں، حسین کا کیریکٹر برتر و بالا ہے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ انصاف، پریم اور قربانی کا دیوتا ہیں۔

9 مہاراجہ جگجیت سنگھ بہادر والیٔ کپورتھلہ

انسانی تاریخ میں شہیدوں کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اور شہداء چاہے وہ کسی ملک و قوم کے ہوں ہر مذہب و قوم کے لیے قابل عزت ہیں، کوئی پابند اصول ہرگز یہ نہیں کہہ سکتا کہ شہید کسی خاص قوم یا کسی خاص زمانے کے لیے رہنما ہیں۔ بلکہ شہیدوں کی روشن مثالیں ہر فرد و بشر کے لیے سبق آموز ہیں، اور اسی نقطۂ نظر سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے واقعات ساری دُنیا کے لئے قابل مطالعہ ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شجاعت کی یاد تازہ رکھنے کے لیے سکھ، ہندو، عیسائی دل سے شامل ہوں گے۔ میرا یہ پیغام معمولی یا رسمی نہیں بلکہ میرے خیالات کا صحیح عکس ہے۔

10 سردار خزاں ایم اے (پروفیسر لدھیانہ کالج)

سکھ قوم کی روایات ہمیشہ سے بہادری اور شجاعت سے وابستہ رہی ہیں اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ وہ دوسرے مذاہب کے بہادروں کی عزت نہ کریں۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی عزت کرنا تو سکھوں کے قریب لازمی امر ہے۔ انھوں نے کربلا کے میدان میں اپنے مٹھی بھر ساتھیوں کی ہمراہی میں ٹڈی دل لشکر کا جس پامردی سے مقابلہ کیا، اور بڑی سے بڑی مشکل کو جس طرح ہنس کھیل کر برداشت کیا اس نے اُن کا مرتبہ اس قدر بلند کر دیا ہے کہ وہ بہادرانِ عالم میں ممتاز جگہ پر فائز ہیں۔

11 سی ایس رنگا ئر (سابق ایم ایل اے)

اگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی زندگی اور قربانی کا مقصد اعلیٰ کو سمجھ لیا جائے تو ہر ہندو، شیعہ، سنّی اور ہر انگریز بالکل اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ پست سیاست حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی نظر میں بے کار تھی، اپنے دشمن کی فوج میں تفرقہ اندازی یا پھوٹ ڈالنے کی کوشش کا خیال ہی ان کے دماغ میں نہ تھا۔ وہ تو اپنے ہی ساتھیوں سے فرماتے تھے کہ ''تم متفرق ہو جاؤ اور میرے ساتھ اپنی جان نہ دو۔'' مگر ان کے مٹھی بھر اصحابِ باوفا کے قدموں کو جنبش نہ ہوئی اور انھوں نے اپنی زندگی کے آخری سانسوں تک ان کا ساتھ دیا، موت کی تلخی اور حیات کی شیرینی بھی ان کو اپنے آقا سے جدا نہ کرسکی۔

12 پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری

سیدنا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی بلند اور پاکیزہ سیرت محسوس کیے جانے کی چیز ہے۔ ایسے الفاظ کا استعمال آسان نہیں جو ان کے کردار کی عظمت کے مکمل مظہر ہوں۔

یوں تو ان کی سیرت، روحانیت اور آنسوؤں کی سب سے زیادہ تابناک روشنی کربلا (کرب و بلا) کے اندر چمکتی دکھائی دیتی ہے، لیکن جو لوگ حسین کے واقعہ کربلا سے پہلے کی زندگی سے واقف ہیں، ان کے لیے اس زندگی کی بے داغ اور استوار پاکیزگی، اس کی بشریت، اس کا خلوص اور وقار، صداقت کی چٹان اور سخت امتحان کے مقابلے کی طاقت، یہ باتیں اتنی نمایاں ہیں کہ بلا لحاظ مذہب وملت ہر فرد خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے۔ ؎

کیا صرف مسلماں کے پیارے ہیں حسینؓ
چرخِ نوعِ بشر کے تارے ہیں حسینؓ
انسان کو بیدار تو ہونے دو
ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؓ

مجھ جیسے گنہگار انسان کے لیے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے اخلاقی کمالات کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ لگانا غالباً اپنی قابلیت سے بڑھ کر جرأت آزمائی کے مترادف ہوگا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ دنیا کے بڑے سے بڑے خدارسیدہ رشیوں اور شہیدوں کے ہم پلہ ہیں۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا نام اور ان کا کام، ان کی زندگی، موت اور شہادت کے واقعات ان نسلوں کی روحوں کو بیدار کریں گے جو ابھی پیدا نہیں ہوئیں۔

13 کنور مہندر سنگھ بیدی سحر دہلوی

گلشنِ صدق وصفا کا لالۂ رنگیں حسین رضی اللہ عنہ

تشنہ کامی بے کسی غربت فریب دشمناں
نوک خنجر بارش پیکاں بلائے خونچکاں
ہے دم شمشیر سے بھی تیز تر راہ جہاں
ہر قدم اب مرحلہ ہے ہر نفس اک امتحان
زندگی پھر اہل دل کی اور آسانی طلب
یہ وہ مے ہے جس کا ہر قطرہ ہے قربانی طلب

فطرتِ آدم کو کر دیتی ہے قربانی بلند
دل پر کھل جاتی ہے اس کے نور سے ہر راہ بند
مہر و ماہ سے ہوتے ہیں اس کی خاکِ پا سے ارجمند
ہے فرشتوں کے گلوئے پاک میں اس کی کمند
سرو وہ جس میں ذوق قربانی ہو جھک سکتا نہیں
تنکوں سے بڑھتا ہوا سیلاب رُک سکتا نہیں

گلشن صدق و صفا کا لالۂ رنگیں حسینؓ
شمع عالم، مشعلِ دنیا، چراغ دیں، حسینؓ
سر سے پاتک سُرخی افسانۂ خونیں حسینؓ
جس پہ شاہوں کی خوشی قرباں، وہ غمگیں حسینؓ
مطلع نور مہ پروین ہے پیشانی تری
باج لیتی ہے ہر اک مذہب سے قربانی تری

جادۂ عالم میں ہے رہبر ترا نقشِ قدم
سایہ دامن ہے تیرا پرورش گاہ ارم
بادۂ ہستی سے تیری ہے کیف و کم
اُٹھ نہیں سکتا تیرے آگے سرِ لوح و قلم
تو نے بخشی ہے وہ رفعت ایک مشتِ خاک کو
جو بایں سرکردگی حاصل نہیں افلاک کو

ساقیِ بزمِ حقیقت نغمہ سازِ مجاز
ناز کے آئینہ روشن میں تصویرِ نیاز
دیدۂ حق بیں، دل آگہ، نگاہِ پاکباز
رونقِ شاہ عجم زینت صبحِ حجاز
تو نے بخشی ہر دلِ مُردہ کو وہ شمعِ حیات
جس کے پرتو سے چمک اُٹھی جبینِ کائنات

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِی بِنِعْمَتِهٖ تَتِمُّ الصّٰلِحَاتُ.

مصادر ومراجع

1- ابن خلکان

2- أعلام الوریٰ بأعلام الهدیٰ

3- انساب الاشراف بلاذری

4- اتمام الوفاء

5- احکام شریعت

6- اصول کافی

7- الاستیعاب

8- الإمامة والسیاسة

9- البدایة والنهایة

10- الخلافة فی الاسلام

11- الذیل علیٰ طبقات الحنابله

12- السنن الکبریٰ للبیهقی

13- الشیعة والسنة

14- الإصابة

15- تاریخ الاسلام للذهبی

16- تاریخ الخلفاء

17- تاریخ بغداد

18- تاریخ الخلفاء

19- تاریخ الشهداء

20- تاریخ طبری

21- تاریخ کبیر

22- تعزیہ داری

23- تهذیب التهذیب

24- تهذیب تاریخ دمشق

25- جامع الترمذی

26- جلاء العیون

27- حسین رضی اللہ عنہ سب کا

28- خلاصة المصائب

29- دلائل النبوة للبیهقی

30- رحمة للعالمین

31- رسالہ اعتقادیہ مع اردو شرح احسن الفوائد
32- سنن ابن ماجه
33- سنن أبی داود
34- سنن نسائی
35- سوانح عمری، حضرت حسین
36- سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ
37- سیر اعلام النبلاء
38- سیر الصحابة
39- سیرت شہید کربلا
40- سيرة الخلفاء
41- شعب الایمان بیهقی
42- شہادتِ حسین ابوالکلام آزاد
43- صحیح ابن حبان
44- صحيح البخاری
45- صحيح مسلم
46- طبرانی فی الکبیر
47- طبقات ابن سعد
48- طبقات ابن سعد
49- طبقات الحنابله
50- طراز مذهب مظفری
51- عرفان شریعت
52- فتح الباری
53- فروع کافی
54- كنز العمال
55- الكامل لا بن اثير
56- المنتظم لابن الجوزي
57- مآثر الآثار
58- مستدرك حاكم
59- مجمع الزوائد
60- مشكوٰة المصابيح
61- منهاج السنة
62- منهاج السنة
63- موطأ امام مالك
64- ميزان الاعتدال
65- ناسخ التواريخ
66- نهج الاحزان
67- وفيات الأعيان
68- ہسٹری آف اسلام

سیرتِ حُسین ؓ
سیدنا حسین ؓ نے حضرت محمد ﷺ سے دینی زندگی کے آداب سیکھے۔ سیدہ عائشہ ؓا سے قرآن کریم پڑھا، سیدنا علی ؓ سے شجاعت اور اپنی عظیم ماں سیدہ فاطمہ ؓا سے حمیت کا سبق حاصل کیا۔ ان کی سیرت وشخصیت پر ہمارے علمائے کرام نے بڑی اچھی کتابیں لکھی ہیں۔ شیعہ مکتبِ فکر کے سکالرز نے بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ یہ سارا لٹریچر پڑھ جائیے۔ اس کے پڑھنے سے بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ حسین ؓ صرف کربلا کے حسین تھے۔ ...... زیرِ نظر کتاب کے مولف مولانا محمد ادریس فاروقی ؒ اپنے اسلوب کے وہ پہلے سکالر ہیں جنہوں نے اصل حقائق کا کھوج لگایا۔ شہادتِ حسین ؓ کو دشتِ کربلا سے نکالا اور ایک عالمی حقیقت بنا دیا۔ انھوں نے اس کتاب میں قاتلانِ حسین ؓ کے چہرے بے نقاب کیے ہیں اور کربلا کا منظر کھینچا ہے کہ حسین ؓ کربلا کے ریگزار میں اکیلے کھڑے تھے۔ ان کے سامنے ظالموں کی ہزاروں تلواریں چمک رہی تھیں مگر وہ ان تلواروں کو پرچھائیوں سے بھی زیادہ حقیر اور ناقابل توجہ سمجھتے تھے۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے قائم کردہ سیاسی نظام کے محافظ تھے۔ وہ سیدنا ابوبکر صدیق، سیدنا عمر، سیدنا عثمان اور سیدنا علی ؓم کے خون پسینے سے سینچے ہوئے باغِ خلافت وشورائیت کی جگہ بادشاہت کی کاشت برداشت نہ کر سکے۔ انھوں نے بحالیٔ خلافت کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دی ...... یہ کتاب تمام فرزندانِ اسلام کو دعوت دیتی ہے کہ قرآن وسنت کے سایۂ رحمت میں اکٹھے ہو جاؤ۔ اہلِ بیت ؓم کی طرح تمام صحابہ کرام ؓم کا احترام کرو۔ ایمان اور اعمالِ صالحہ کا مجسمہ بن جاؤ۔ اور اپنی تیغ کردار سے شرک، بدعت اور مغربی تہذیب کو ملیامیٹ کر دو۔
جو مسلمان یہ کام کرے گا وہی آج کے دور کا حسین کہلائے گا۔